

مسیحا کون ؟

مصنف: ڈاکٹر عارف الاسلام

سرسید یا آزاد !

مسیحا کون؟

سرسید یا آزاد

عارف الاسلام
ایم ایس سی، پی ایچ ڈی (علیگ)
شعبۂ شماریات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ کتاب جناب محمد بشارت حسین (علیگ) مونگیر، بہار کے
تعاون سے شایع ہوئی

سنہ اشاعت :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

تعداد :۔ ــــــــــ ایک ہزار

قیمت

طالب علم ایڈیشن :۔ ــــــــــ ۵۰ روپیہ

لائبریری ایڈیشن :۔ ــــــــــ ۱۰۰ روپیہ

کتابت :۔ ــــــــــ محمد کلیم اللہ دربھنگوی

پرنٹر پبلشر :۔ ــــــــــ دی علی گڑھ پبلشنگ ہاوس

مطبوعہ :۔ ــــــــــ کریمی پرنٹرس انوپ شہر روڈ علی گڑھ

ملنے کا پتہ

۱ دی علی گڑھ پبلشنگ ہاوس بذریعہ کریمی پرنٹرس انوپ شہر روڈ علی گڑھ

۲ ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳ نیو کتاب گھر نزد سلیمان ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انتساب

ہندوستانی مسلمانوں کی اس نوجوان نسل کے

نام

جس نے آزاد ہندوستان میں

آنکھ کھولی۔

فہرست

حرفِ آغاز

زیرِ نظر تصنیف ایک لمبے عرصے کی ذہنی کاوشوں پیچ در پیچ سوالات اور علی گڑھ کے ذہین و پرجوش نوجوانوں کی محفلوں میں ہونے والی طویل بحثوں کا نتیجہ ہے جسے میرٹھ کے ناقابلِ یقین واقعات نے کتاب کی شکل عطا کر دی۔ میرٹھ میں ماہِ رمضان ۱۹۸۷ء میں رونما ہونے والے واقعات دنیاء جمہوریت کی تاریخ کا تاریک ترین باب ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ساری جمہوریت اکثریت کی آمریت کی بدترین شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ نکھل چکرورتی نے اعتراف کیا کہ ان واقعات سے نازیوں کی داستانیں پھیکی پڑ گئیں۔ انگریز حاکموں کے دور میں جلیان والا باغ کا واقعہ پیش آیا لیکن وہ حکومت کی پلاننگ نہ تھی بلکہ ایک سر پھرے آفیسر جنرل ڈائر کا ذاتی فیصلہ تھا اس کے برخلاف میرٹھ میں جمہوری حکومت کے وزرا، پولس اور پی اے سی کے اعلیٰ افسران نے باقاعدہ ایک لمبی میٹنگ کے بعد مسلم اقلیت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور نہتے معصوم انسانوں کو گھروں سے کھینچ کھینچ کر سرِعام گولیوں سے بھون دیا گیا۔ آزاد ہندوستان کی چالیس سالہ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں کسی نہ کسی بہانے کسی آفیسر یا وزیر کی زیرِ سرپرستی اقلیت کو ناقابلِ بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ظلم و ستم ان زیادتیوں کے علاوہ ہیں جو اقتصادی میدان میں مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر کی گئیں۔ ان کو ملازمتوں میں نہ لیے جانے کی پالیسی اپنائی گئی جس کا ثبوت اعلیٰ اور درمیانی درجے کی ملازمتوں

کے علاوہ تیسرے اور چوتھے درجہ کے ملازمین میں بھی مسلمانوں کا تناسب ناقابلِ یقین حد تک کم ہوتا ہے۔ لہٰذا تعلیم یافتہ نہ ہونے کا بہانہ بھی نہیں چل سکتا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی زبان اور کلچر کو سرکاری سرپرستی سے محروم کر دیا گیا۔ بس قدیم زبانیں اور قدیم بھارتیہ سبھیتا ہی واحد سرمایہ قرار دی گئیں۔ تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ تمام طبقات کے لیے قانون میں تحفظات رکھے گئے۔ ملازمتوں اور داخلوں میں رزرویشن کی پالیسی اپنائی گئی لیکن ان مراعات اور تحفظات کا حقدار صرف ہندوؤں کی نیچی ذاتوں کو قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب مسلمان صرف ان پوزیشنوں کے لیے کوشش کر سکتے تھے جن کے امیدوار ترقی یافتہ اعلیٰ ذاتیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اس طرح نچلی ذاتوں کو تحفظ دینے کی پالیسی کی قیمت بھی مسلم اقلیت کو چکانی پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان حکمرانی سے بیدخل ہونے کے علاوہ سفید پوشی بھی قائم رکھنے سے معذور ہو گئے۔ اس کے علاوہ لون، لائسنس اور پرمٹ وغیرہ بھی خال خال ہی کسی مسلمان کو دیئے گئے۔ ان تمام پالیسیوں نے مسلمانوں کی اقتصادیات کی کمر توڑ کر رکھ دی اور وہ ذلت و خواری کے عمیق اندھیرے گڑھے میں گر گئے۔

ان تمام مسائل کا حل کیا ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ کسی بھی قوم کی تنزلی کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ محکومی کے ایک یا دو اسباب نہیں ہوتے دس بیس یا چالیس سالوں میں نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ ایک لمبے عرصے کے اعمال و افکار کا اجتماعی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۸۵۷ اور ۱۹۴۷ بہت ...ت کے حامل ہیں۔ ۱۷۵۷ میں جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کی ہار دراصل ...ا میں مسلمانوں کی حاکم سے محکوم میں تبدیل ہونے کی شروعات ہے سو سال میں مکمل ہو گیا جب ۱۸۵۷ میں انگریزوں نے دہلی ...مانے سے چلی آ رہی مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۴۷ء میں ایک اور اہم تاریخی موڑ آیا اور ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے سو سالوں پر ان تین شخصیتوں نے بہت گہرا اثر ڈالا سرسید، مولانا آزاد اور محمد علی جناح۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعمال و افکار پر ان تینوں حضرات کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یوں تو علی برادرس ایک زمانہ میں اہم ترین قائدین بن گئے تھے لیکن یہ عرصہ دس سال سے زیادہ کا نہیں ہے اور ان کے خیالات و افکار نے ہندوستانی سیاست پر دوررس اثرات مرتب نہیں کیے۔ خلافت تحریک کا طوفان جس تیزی سے اٹھا اسی تیزی سے دب گیا کہ خود ترکوں نے اس خلافت کو ختم کر دیا تھا جس کی حمایت میں ہندوستان میں تحریک چلائی جا رہی تھی۔ محمد علی جناح کا شمار جدید ہندوستان کی اہم ترین شخصیتوں میں کیا جانا چاہیے کہ سیاسی عمل کے ذریعہ اور بغیر جنگ و جدل انہوں نے دنیا کے نقشہ پر ایک ملک کا اضافہ کیا لیکن جناح صاحب کا شمار ہم فکری انقلابیوں میں نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کسی نئی فکر اور فلسفہ کو جنم نہیں دیا بلکہ پہلے سے موجود جانشینِ سرسید محسن الملک وقار الملک کی قائم کردہ جماعت کو بااثر و زوردار قیادت بخشی اور اس تحریک کا رخ ایک خاص سمت میں موڑ دیا۔

سرسید ایک ایسے قائد ہیں جن کی مثال ہندوستانی مسلمانوں کی پوری ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلاشبہ شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشینوں کی خدمات شہرۂ آفاق ہیں۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے اسلام کو دوبارہ قائم کیا اور مجدد الف ثانیؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ لیکن اس وقت تک مسلمان ہی حکمراں تھے انگریزوں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور برادرانِ وطن کسی طرح بھی مسلمانوں سے مقابلہ آرائی کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اس کے برخلاف سرسید نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو مسلمان حاکم سے محکوم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے ان کو اقتدار سے محروم

کر کے ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

سرسید کو چار محاذوں پر جنگ کرنی پڑی۔ پہلا انگریزوں کو مسلمانوں پر ظلم وستم جاری رکھنے سے روکنا دوسرا مسلمانوں کو نئے علوم وفنون کی طرف راغب کرنا تیسرا مذہب میں عقلیت کو رواج دینا۔ چہارم آخری زمانے میں کانگریس کے نیشنلزم کے خلاف محاذ کھولنا۔ یہ تمام کام انتہائی مشکل اور سنگین تھے۔

مسلمانوں کو ادبار سے نکال کر ان کی شانِ رفتہ واپس لانے کے لیے بہت سے مصلحین نے کوششیں کیں۔ مثلاً سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا نے تلوار اور مذہبی روایات کے سہارے مجاہدانہ کوشش کی لیکن دنیا بدل چکی تھی جنگی اصول اور ہتھیاروں میں زبردست تغیر آچکا تھا رسل ورسائل کے بے پناہ تیز وسائل ایجاد ہو چکے تھے لہٰذا پرانے ہتھیار اور پرانے علوم مسلمانوں کو تنزلی کے گڑھے سے نکالنے میں ناکام رہے بلکہ پہلے سے زیادہ مشکلات ان کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کا غدر مسلمانوں کے لیے پیامِ اجل بن کر آیا۔ اس غدر نے ان کی رہی سہی حکمرانی ومعیشت وتہذیب اور دوسری قوموں پر برتری کو بالکل ختم کر دیا۔ اس وقت کوئی آفت آسمان سے ایسی نہ چلی جس نے مسلمان کا گھر نہ دیکھا ہو کوئی پریشانی ایسی نہیں جو تصور میں آسکتی ہو اور مسلمانوں پر نہ پڑی ہو۔ ایسے وقت میں جب قوم کی کشتی ڈوبنے کے قریب تھی اور قریب تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کا اسپین بن جاتا سرسید اٹھے اور تن تنہا اپنی بے مثال ذہانت اور بے پناہ محنت سے قوم کی کشتی کو طوفان سے صحیح سالم نکال لائے۔ یہ ایسا پیغمبرانہ کام تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ سرسید نادان مجاہد کی طرح تلوار لے کر میدان میں نہیں کودے اس لیے کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ہماری تنزلی اور بربادی کی بہت سی وجوہات ہیں کوئی ایک وجہ نہیں ہم خود ذمہ دار ہیں کوئی دوسری قوم نہیں جس سے تلوار کے ذریعہ لڑا جاسکے۔

بہت سے عوامل کا مجموعی نتیجہ سامنے آیا ہے جن کو فرداً فرداً درست کرنا ہوگا۔
انہوں نے سب سے پہلے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی تنزلی جہالت کے سبب ہے۔
وہ قوم جس کی شروعات اقراء سے ہوئی تھی اب پڑھنے لکھنے کا سبق بھول چکی
تھی۔ جس کے پیغمبر نے علم حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کا حکم دیا تھا اب
وہ علم سے محض بے بہرہ تھی۔ وہ قوم جس کی کتاب میں سیکڑوں جگہ غور و فکر اور
تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان الفاظ تک سے ناآشنا تھی۔ علم کے معنی محدود
کر دیئے گئے تھے۔ صدیوں سے علماء کے نزدیک صرف وہی علوم علوم تھے جو سیکڑوں
سال پہلے مسلم علماء نے تدوین کر دیئے تھے۔ وہی احادیث اور قرآن کی وہی
آیتیں قابلِ عمل تھیں جن میں جنت دوزخ اور عبادات کا ذکر تھا۔ کسی نئی فکر
اور نئے فلسفہ و سائنس کی ایجاد ان کے نزدیک بے معنی اور بعض اوقات غیر
اسلامی تھی۔ مذہب میں بھی غلط روایات کے جاری ہونے سے بہت سی خرابیاں
در آئی تھیں۔ اب مذہب ہر ترقی کے خلاف ایک روک بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ علماء
کے نزدیک آگے بڑھنے کا نہیں پیچھے ہٹنے کا نام اسلام تھا۔ رفاہِ عام کا نہیں
اپنے لیے جنت کمانے کا نام اسلام تھا۔ یورپین زبانیں اور ان کے جدید علوم
کو سیکھنا محض کافرانہ کام تھا۔ دوسری قوموں سے میل جول بڑھانے اور ان
کے ساتھ بیٹھ کر کھانے تک سے مسلمان کافر ہو جاتا تھا۔ سر سید نے اجتہاد کیا کہ
ساری خرابیوں کی جڑ مسلمانوں کی جدید علوم سے نفرت ہے۔ لہٰذا اگر انہیں
دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنا ہے اور اسلام کی دنیا میں کچھ عزت ہونی ہے
تو بحیثیت قوم نئے علوم اور تعلیم و سائنس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا پڑیگا
یہ کام انتہائی سنگین اور مشکل تھا۔ دینی علماء ۱۸۲۵ء میں ہی انگریزی پڑھنے
کو ناجائز و حرام قرار دے چکے تھے۔ دینی علماء کی اسلام پر اجارہ داری ہندوؤں
میں برہمنوں سے بھی زیادہ تھی۔ ان کو خدشہ تھا کہ مسلمان انگریزی پڑھ
کر عیسائی بن جائیں گے۔ ایک طرف قوم کو نئی علوم کی طرف راغب کرنا

جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا دوسری طرف غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انگریز ان کو ہر طرح برباد اور ذلیل و خوار کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ ملک نیا نیا غلام ہوا تھا مسلمانوں کی حمایت میں سرسید نے آواز اٹھائی اور غدر کی ساری ذمہ خود انگریز افسروں کی نااہلی پر ڈال دی۔ "اسبابِ بغاوتِ ہند" نے انگریزوں کے رویہ پر بہت گہرا اثر ڈالا اور اس طرح سرسید مسلمانوں کو ان کے ظلم وستم سے آزاد کرانے میں کامیاب رہے۔ جدید تعلیم شروع کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود انگلینڈ جاکر وہاں کے تعلیمی نظام کا مشاہدہ کریں لہٰذا گھر بار رہن رکھ کر انگلینڈ کا سفر کیا اور کئی مہینے تک وہاں کی درسگاہوں، لائبریریوں وغیرہ کی ایک ایک تفصیل جمع کرتے رہے۔ اسی دوران اسلام کی ایک عظیم خدمت بھی انجام دی یعنی ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جواب "خطبات احمدیہ" شایع کرایا۔ انگلینڈ جانے سے پہلے ہی انگریز دوستوں کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی وجہ سے کافر تو پہلے ہی ہو چکے تھے اب "ٹکسالی کرسٹان" کے لقب سے نوازا گیا۔ ایسے میں کون سنتا؟ جن کے لیے اتنی دور کا سفر کیا تھا انہیں کو اپنا سب سے بڑا دشمن پایا۔ چاروں طرف سے فتوے آنے لگے ہندوستان کا کوئی اخبار کوئی دینی عالم ایسا نہ تھا جس کو سرسید کے کفر پر ذرا بھی شک ہو۔ لیکن وہ قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنا پیغام لے کر در در بھٹکتا پھرا، ہر ہر دروازے پر دستِ غرض دراز کیا کہیں ہاتھ جھٹکا گیا کہیں دتکارا گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری آخر کار کچھ نیک بندوں نے اس کے پیغام کو سمجھا اور رشتۂ وفاداری بغرضِ ترقئ قوم استوار کیا۔ اب کچھ مخلص اور جاں نثار ساتھی ان کو میسر آچکے تھے۔ انہیں کے سہارے یہ بے سروسامان، خستہ و خستہ حال، مسلمانوں کی نظر میں مطعون، علماء کے فتوؤں سے مزین، قافلہ جانب منزل چلنا شروع ہوا۔ ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے ساتھ ساتھ ایک طوفان بلاخیز اٹھا جس نے علی گڑھ تحریک کو جنم لینے

اسے پہلے ہی ختم کر دینا چاہا۔ کفر کے فتوؤں پر مدینہ و مکہ کے علماء تک کی مہرِ تصدیق لگوائی گئی اب تو کافر ہونے میں کوئی شک ہی نہ رہ گیا۔ لیکن اب قوم بھی جاگ رہی تھی کفر کے فتوے اب بے اثر ہوتے جا رہے تھے بالآخر ۱۸۷۵ء میں "مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند" کی بنیاد ڈالی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ چھوٹی سی کرن مسلمانوں کی دنیا کے تمام اندھیروں پر چھا گئی۔ علم کا زور پھیلنا شروع ہوا۔ سرسید نے کامیابی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور خدا کا شکر بجا لائے۔

ابھی سرسید کے کالج کو قایم ہوئے دس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۸۵ء میں نئے انقلاب کی بنیاد ڈالی گئی۔ قیامِ کانگریس کے دوررس اثرات سرسید کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ سر ہیوم نے اس تنظیم کے سلسلہ میں سرسید سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے واضح الفاظ میں کسی بھی نیشنل تنظیم کے بنائے جانے کی مخالفت کی۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوستان نئے دور میں داخل ہو رہا تھا جس طرح ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست نئے دور کا آغاز تھی ۱۸۸۵ء میں پارلیمنٹری طرزِ انقلاب کا بیج بویا گیا جس میں ہندو اور انگریز اشتراک کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کا عظیم کام بھی خدا نے سرسید کے سپرد کیا تھا لہٰذا دو سال تک خاموش رہنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں سرسید سیاسی مدبر کی حیثیت سے سامنے آئے اور لکھنؤ میں پہلی بار جلسۂ عام میں کانگریس کے مقاصد کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ مسلمانوں کو من حیث الجماعت کانگریس سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور ایک جماعت انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قایم کی۔ اس کی ناکامی کے بعد ۱۸۹۳ء میں خالص مسلمانوں کی جماعت محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قائم کرنا جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا آغاز بن گیا۔ اب مسلمان تعلیم اور سیاست دونوں اہم شعبوں میں نئے دور میں داخل ہو گیا تھا اور جدید دور کی زندگی میں اپنا کردار بخیر و خوبی ادا کرنے کے قابل بن چکا تھا۔ کانگریس اس کے باوجود بھی تمام ہندوستانیوں

کی نمائندگی کی دعویدار تھی لیکن ایک بار بھی سرسید سے مفاہمت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے بر خلاف ان کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ ایک بنگالی اخبار نے لکھا کہ "ان کا نام تمام ہندوستانیوں کے لیے نشانِ ملامت بن گیا ہے" سرسید کو صرف یہ شکایت تھی کہ کانگریس کے مطالبات مسلمانوں کے لیے نقصاندہ ہیں اگر ان کو تسلیم کر لیا گیا تو مسلمان محکوم ہو جائیں گے ان کو بالخصوص سادے نیابتی طریقہ پر اعتراض تھا کہ مسلمان ایک ہے تو ہندو چار ہیں لہٰذا مسلمانوں کے انتخاب میں کامیاب ہونے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض اس مطالبہ پر تھا کہ سرِوِسز کے لیے مقابلہ کے امتحان کا طریقہ رائج ہو۔ ظاہر ہے کہ مسلمان تعلیم میں کم تھے لہٰذا یہاں بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے سرسید کے ان اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے تھی اور ان سے مشورہ کرکے کانگریس کے مطالبات میں مسلم نقطۂ نظر کو بھی شامل کیا جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ سرسید کی قیادت میں تمام مسلمان متحد ہو چکے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ صرف سرسید کو انگریز پرست کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ مسلم مسئلہ کی موجودگی ہی سے انکار کیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ کا حل اسی وقت نکال لیا جاتا تو یہ دونوں ہی قومیں بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتی تھیں اور ہندو مسلم مثل بھائیوں کے امن و آشتی سے اس ملک میں رہتے جیسے کہ رہتے چلے آئے تھے۔ یہ روز روز کے فسادات اور خون خرابہ سے ہندو مسلمان سب بچ جاتے اور ملک جلد آزاد ہو کر آج ترقی کی راہ پر بہت آگے بڑھ گیا ہوتا۔ لیکن مسلم مسئلہ کی موجودگی سے انکار کیا گیا۔ نتیجتاً ناقابلِ بیان پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تین تین جنگیں ہوئیں ہزاروں انسان مارے گئے۔ کروڑوں، عربوں روپیہ کا نقصان ہوا۔ ملک کی ترقی امن و خوشحالی اور آپسی بھائی چارے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے اور کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔ اسی میں ہندوؤں اور

مسلمانوں کا بھلا ہے۔

سرسید کے انتقال کے بعد محسن الملک، وقار الملک علی گڑھ کی عالیشان روایات کے امین بنے۔ ۱۹۰۱ء میں پھر اردو کو ہٹانے کی تحریک چلی محسن الملک اپنے پیش رو کی تقلید کرتے ہوئے انگریز حاکموں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے حکم ہوا کہ کالج کی سکریٹری شپ سے استعفا دیدیں ورنہ کالج کی ایڈ بند کر دی جائیگی۔ تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کے لیے تحریک چلی تو مسلمانوں کو پھر احساس ہوا کہ کانگریس مسلم مفاد کے خلاف ہے لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ پھر سے کوئی سیاسی انجمن مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے قائم کی جائے علی گڑھ گزٹ میں محسن الملک نے اس بحث کا آغاز کیا جو اس کے ایڈیٹر بن چکے تھے بہت سے مدبرین کا خیال تھا کہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا پھر سے احیاء کیا جائے۔ آخر کار وقار الملک نے شملہ ڈیپوٹیشن ترتیب دیا۔ سر آغا خاں کی قیادت میں وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے گئے اور اس طرح ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ علی گڑھ کالج کو قائم ہوئے پچیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے اور کئی نسلیں تعلیم یافتہ ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم لیگ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قانونی تحفظات چاہتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے کانگریس ایسے کسی بھی مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ قیام کانگریس کے بعد سے ہی ملک کے عوام انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ آپس میں ہی لڑتے رہے۔ آج آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے سب کو متحد ہو کر غریبی اور افلاس سے جنگ کرنی چاہیئے تھی لیکن ہوا اس کا الٹا رہا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مسلمان متحد تھے اور تعلیمی ترقی کے راستے پر

رواں دواں تھے کہ ۱۹۱۲ء سے مسلمانوں میں تفریق کا دور شروع ہوا۔ قوم پرستوں کی ایک نئی نسل مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اور علی گڑھ تحریک کے تمام پہلوؤں پر حملے کیے گیے۔ مولانا آزاد اس تحریک کے مؤجد اور روح رواں تھے جنہوں نے دینی علماء کے ایک طبقہ کو علی گڑھ تحریک کے خلاف اکسا کر کانگریس کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ ان حضرات کے ذہن کے کسی گوشہ میں دینی علماء کی اس شکست کا بدلہ بھی لینا تھا جو سرسید کے ہاتھوں نئی تعلیم کا اجراء ہونے سے ہوئی تھی۔ مولانا آزاد انتہائی تیز طرار انسان تھے انہوں نے دیکھا کہ مسلمان متحد ہیں اور علی گڑھ تحریک میں ان کا کوئی مقام نہیں بن سکتا کہ وہ خود جدید تعلیم یافتہ نہ تھے تو انہوں نے کانگریس کی مدد حاصل کی اور نیشنل ازم کے علمبردار بن کر ابھرے یہ کامیابی کا سب سے آسان اور سیدھا راستہ تھا۔ اسّی فیصد آبادی ان کے ساتھ تھی باقی رہے مسلمان جتنے بھی ان کے ساتھ آجاتے زیادہ ہی زیادہ تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی بلکہ مسلمانوں کے اتحاد اور ایک جماعت کے اصول پر بھی زبردست حملہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو زبان کی افادیت کو بھی شدید دھکا پہنچایا۔ علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر اور سرسید کی ذاتی کاوشوں کے نتیجہ میں آسان، سلیس اور دلنشیں زوردار اسلوب ایجاد ہو چکا تھا اس سے پیشتر استعمال ہونے والے اسلوب میں تصنع بناوٹ اور رنگینیٔ عبارت پر زور دیا گیا تھا۔ ہم قافیہ اور ہم وزن جملوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ فارسی و عربی کے بھاری بھرکم اور مشکل الفاظ کا استعمال عام تھا۔ سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے اردو سے ان تمام خرابیوں کو دور کر کے اس میں سائنسی مزاج پیدا کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے پھر سے اس پرانے اسلوب کو اختیار کیا اور قرآنی آیات و احادیث کا بے جا استعمال اپنی تحریروں و تقریروں میں شروع کیا۔ مولانا کا الہلال قرآنی آیات سے

بھرا رہتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ذہن سے خطاب نہیں کیا بلکہ مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے تمام حربے استعمال کیے۔ مولانا کی تحریروں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں معنی تلاش کرنا مشکل پڑ جاتا ہے بس محض خوبصورت الفاظ فارسی و عربی تراکیب کا ایک شاندار مجموعہ نظر آتا ہے جس کے سحر میں قاری اس کے معنی تلاش نہیں کر پاتا۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات اور اسوۂ حسنہ و سیرت رسولؐ سے اتنی مثالیں مولانا جمع کر دیتے ہیں کہ عقیدت کے مارے مسلمانوں کا ذہن کام کرنا بند کر دیتا ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آیا جن مطالب و مقاصد کے لیے مولانا نے ان کو استعمال کیا ہے وہ وہاں قابلِ استعمال ہیں کہ نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ آیت نازل ہوئی ابوجہل اور ابولہب کے لیے اور استعمال کر دی مسلم یونیورسٹی تحریک کے قائدین کے لیے۔ آیت نازل ہوئی اسلام کی فتح اور جہاد کے لیے استعمال کر دی ملک کی آزادی اور انگریزوں سے لڑائی کرنے کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بہت دلچسپ موضوع تحقیق کا ہو سکتا ہے کہ آیا جن مطالب و مقاصد کے لیے مولانا نے قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں وہ وہاں قابلِ استعمال ہیں کہ نہیں۔ کوئی دینی ادارہ اس تحقیق کا بیڑا اٹھائے تو یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ مولانا کے اسلوب پر اور اردو کی افادیت کو نقصان پہنچانے پر ایک الگ سے تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ ہم نے اس کتاب میں علی گڑھ کی تعلیمی اور سیاسی تحریکوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ خلافت تحریک میں بھی مولانا ایک خاص مقصد سے شریک ہوئے تھے۔ ان کا مقصد خلافت کا تحفظ ہرگز نہ تھا بلکہ وہ خلافت کے پلیٹ فارم کو بھی کانگریسی نیشنل ازم کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ان کی جتنی بھی تقریریں خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہیں ان سب میں وہ یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں "آپ کی تحریکِ خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے

یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے عمل چاہتا ہے" لہٰذا جب کمال اتاترک نے خلافت ختم کردی تو مولانا نے اس کو مبارکباد دی اور آخری خلیفہ کو غاصب کے نام سے یاد کیا۔ خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے وہ پان اسلام ازم کے نظریہ کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم بتلاتے تھے لیکن اسی مسلم قومیت کو کانگریس کے پلیٹ فارم سے غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور اس سے زیادہ قابلِ نفرین کوئی چیز نہ تھی۔ مولانا کی قوم پرستی کو تو سبھی جانتے ہیں ان کا مسلم قومیت ایک قائد ایک جماعت کا تصور بھی ملاحظے کی چیز ہے۔" ملتِ اسلامیہ ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتۂ انسلاک ہے نہ وحدتِ ملت کا کوئی رابطہ نہ کوئی قائد و امیر ہے محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیاتِ غیر شرعی و جاہلی ہے۔" اتنا واضح تضاد شاید ہی کسی دوسرے لیڈر کے خیالات میں پایا جاتا ہو۔ مگر یہ تضاد نہ تھا بلکہ یہ مولانا کی ضرورت تھی کانگریسی نیشنل ازم کو مضبوط کرنے کے لیے وہ ہر طرح کا حربہ استعمال کر سکتے تھے اور جہاں جس بات سے فائدہ ہوتا وہی بات کہتے تھے۔

ہندوستان آزاد ہوا اور ساتھ ہی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا کانگریس کی تمام زیادتیوں کے عینی گواہ ہونے کے باوجود (جس کا اقرار انہوں نے انڈیا ونز فریڈم میں کیا ہے) انہوں نے مسلمانوں کو ہی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں میں احساسِ جرم پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے اندر مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا ہوئی کہ یہ اپنا حصہ لے کر بھی یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان تمام مسلمانوں کے لیے نہیں مانگا گیا تھا بلکہ صرف یہ مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو خود مختار آزاد ریاستوں میں تبدیل کر دیا جائے لہٰذا آزاد بھارت میں مسلمان بھی اتنے ہی حقدار ہیں جتنے کہ

ہندو لیکن آزادی کے بعد پہلی تقریر میں ہی انہوں نے یہ تسلیم کر لیا اور مسلمانوں کو یہ باور کرا یا کہ اب یہ ملک ہندوؤں کا ہے۔ جامع مسجد کی تقریر میں کہا کہ "وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے" مولانا اگر جناح صاحب کی قیادت کو باطل ثابت کرنا چاہتے تھے اور اگر مسلمانوں کے ہمدرد تھے تو انہیں یہ کہنا تھا کہ اب میں مسلمانوں کے مفاد کا نگہبان ہوں اور مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف تقسیم ملک کا الزام کانگریس پر سے ہٹا کر مسلمانوں پر عائد کر دیا اور اپنی وزارت کے عیش و آرام میں کھو گئے۔ حیدرآباد پولیس ایکشن میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، اردو ختم کی گئی، انگنت فسادات ہوئے، مسلمانوں پر زندگی کے تمام راستے تنگ کر دیئے گئے لیکن مولانا خاموش تماشائی بنے رہے بلکہ ان کے کسی جذبہ کو شاید تسکین بھی ملی ہو کہ تم نے مجھے لیڈر مانا ہی کب تھا لہٰذا اب بھگتو۔ لکھنؤ مسلم کنونشن میں مسلم قائدین کو خوفزدہ کیا اور یہ وعدہ لیا کہ اب مسلم اتحاد کے نام پر کوئی جماعت نہ ہوگی اور مسلمان متحد نہ ہوں گے محض کانگریس میں شریک ہوں گے اپنا کوئی سیاسی تشخص باقی نہ چھوڑیں گے۔ حالانکہ خلافت کانفرنس میں یہ فرما چکے تھے "اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمالِ حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع متحد اور نفس واحد ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جا بجا اجتماع وحدت پر زور دیا گیا۔" لکھنؤ کنونشن میں مولانا پر وحی نازل ہوئی اور قرآن و سنت کے احکامات تبدیل ہو گئے۔ انسانیت کی تاریخ میں ایسے کسی دوہرے معیار کے لیڈر کی مثال ملنی مشکل ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں مولانا نے مسلم طلباء کے لیے دینی تعلیم کو لازمی مضمون کے درجہ سے ہٹا کر اختیاری بنا دیا۔ اور یہ کہا کہ ایک سیکولر ملک میں ایسی کوئی مراعات حکومت نہیں دے سکتی۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کورٹ

کے اندر غیر مسلموں کی شرکت کا دروازہ کھول دیا۔ ۱۹۲۰ کے ایکٹ میں واضح طور سے لکھا ہوا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے اپنی ضرورت کے لیے قائم کی ہے لیکن مولانا کے ایکٹ سے یہ ضروری تعریف نکال دی گئی اور مسلم تشخص ختم کر کے سیکولر بنا دیا گیا۔ اس طرح مولانا آزاد نے علی گڑھ تحریک پر ایک کاری ضرب لگائی جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مولانا کے اس رویہ کی تشریح کیا ہو سکتی ہے؟ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے چار عوامل پر نظر جاتی ہے۔ پہلی یہ کہ مولانا نے جس وقت شعور کی آنکھ کھولی تو بڑے بڑے مسلم قائد موجود تھے اور مسلمانوں کی قیادت علی گڑھ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تمام قائدین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مسلمانوں میں مقبول تھے لہٰذا مولانا نے قوم پرستی کا راستہ چنا اور اپنے علمِ قرآن و حدیث کو نیشنلزم کے درست ثابت کرنے میں استعمال کرنے لگے۔ کانگریس کے لیے ایسے کسی شخص کا ساتھ دینا بہت بڑی فتح تھی۔ مولانا پہلے آدمی ہیں جنہوں نے سیاست میں مذہب کو استعمال کیا اور سیکولر سیاست کو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا کانگریس نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مولانا کی پوزیشن ہمیشہ کے لیے مستحکم ہو گئی۔ دوسری وجہ اس رویہ کی یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی علمائے کرام علی گڑھ سے اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے جو دینی علماء کو سرسید کے ہاتھوں نئی تعلیم شروع کرنے کی صورت میں اٹھانی پڑی تھی اور اس وجہ سے ان کا اثر مسلم سماج پر سے ختم ہو گیا تھا۔ تیسری وجہ مولانا کا خاندانی پس منظر ہو سکتا ہے کہ ان کا خاندان ہمیشہ سے ہی ہر طرح کی بدعات و رسومات کا عادی تھا اور سرسید اپنے آپ کو وہابی کہتے تھے اور وہابیت مولانا کے نزدیک کفر کے مترادف تھی۔ چوتھی وجہ جو ہمارے نزدیک زیادہ وزن رکھتی ہے وہ ہے ان کا وحدتِ ادیان کا نظریہ۔ اس نظریہ کے سبب ان کی مسلم قومیت سے دلچسپی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کا یہ عقیدہ گیتا کے

عقیدے سے میل کھاتا ہے کہ راستے جدا جدا ہیں منزل ایک ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب میں اختلافی مسائل مثلاً رسالتؐ اور پرانی شریعتوں کی منسوخی کو وہ اتحاد کی خاطر زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لہٰذا تفسیر قرآن میں جگہ جگہ نظریۂ وحدتِ ادیان کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی نظریہ کی تشریح و تبلیغ کا کام بھی تفسیر سے لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کا استعمال اور بے دریغ لفاظی کے نمونے بھی ان کی تفسیر میں ملتے ہیں۔

یہ کتاب مسلمانوں کے لیے راہِ فلاح کی تلاش کے جذبہ سے لکھی گئی ہمیں امید ہے کہ یہ تصنیف آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے راہِ عمل متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ میں اس کام کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اگر مخلص دوستوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا جنہوں نے قدم قدم پر مفید مشوروں سے نوازا اور میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ میں خاص طور سے ڈاکٹر محمد شاہد قاضی ضیاء الاسلام، احمد سلیم خاں پیرزادہ، ڈاکٹر بصیر احمد خاں، ڈاکٹر علی امیر مسٹر عباس ضمیر، ڈاکٹر محمد خورشید، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر حافظ محمد الیاس اور مسٹر یوسف جمال صاحبان کا ممنون ہوں جنھوں نے ہر طرح میری مدد کی اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اس تصنیف کے دوران بہت سے ایسے دن تنہائی میں بھی گذرے جب کہ مجھے اپنے معصوم بچوں احمد شہاب اور صبوحی یاسمین کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن کئی مرتبہ اس کام کی تکمیل کی خواہش نے مجھے ان سے دور رکھا۔

عارف الاسلام

علم طاقت ہے اور دولت بھی

انسانوں اور قوموں کو زندگی دینے والی سب سے اہم چیز علم ہے۔ اور جو قومیں حصول علم میں پسماندہ رہ جاتی ہیں غلامی اور بے عزتی کی زندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ سچے قائدین اور ہمدردان قوم جن کو ہمیشہ زمانے یاد رکھا ہے ان کی خدمات تعلیم کے میدان میں چاہے بہت زیادہ نہ ہوں لیکن دنیا میں ایک بھی مثال ایسے رہنما کی نہیں مل سکتی کہ جس نے خود اپنی قوم کو جن کی کہ وہ رہنمائی کا دعویدار تھا تعلیم اور علم حاصل کرنے سے روکا ہو یا ایسی کوششوں کی مخالفت کی ہو جو کہ قوم کو تعلیم اور علم کی طرف راغب کرنے کے لیے جاری ہوں۔ ہاں ایک ایسی مثال ضرور ہماری رہنمائی کا دعویٰ کرنے والوں میں سے ملتی ہے۔ جس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم اور قومی ہمدردی کے میدان سے گھسیٹ کر لاعلمی اور مضرت رساں سیاست کے اندھیروں میں ڈبونا چاہا۔ کبھی جنگ آزادی کے نام پر کبھی خلافت تحریک کے نام پر اور کبھی صحابہ کرام کے اسوۂ حسنہ کے نام پر اور کبھی کبھی خاص قرآنی آیات کا حکم بیان کر کے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی نسبت یہ دعویٰ بہت سے لوگوں کو شاید حیران کر دے لیکن آزادی کے بعد مولانا کی شخصیت پر بہت سے پردے ڈالے گئے ان کے گمراہ عزائم کو مسلمانوں کے لیے مرہم بتایا گیا۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، کتابیں، اخبارات غرض یہ کہ تمام ذرائع نشر و اشاعت اس کام کے لیے وقف کر دیئے گیے کہ پچھلے دو سو سالوں میں اگر ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی سچا رہنما اور ہمدرد پیدا ہوا تو وہ مولانا آزاد صاحب تھے۔ اس لیے کہ آزاد ہندوستان میں یہ کام ایک قوم کی سب سے بڑی سیاسی ضرورت بن گیا ہے۔

آزاد ہند کے اکثر مسلم دانشوروں نے ذاتی مصلحتوں اور بدلے ہوئے ماحول کے سیاسی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہی کیا جو کہ ان کے لیے اور ایوانِ حکمرانی میں مسند نشیں شاہان وقت کے لیے مفید تھا۔ حالانکہ تقریباً تمام ہی مصنفین اس بات کے قائل ہیں کہ مولانا آزاد ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم الشان تعلیمی (مسلم یونیورسٹی کی) تحریک جس کے بانی سرسید اور اس تحریک کے علمبردار محسن الملک، وقار الملک اور سر آغا خاں وغیرہ کے شدید مخالف تھے اور الہلال والبلاغ کی اشاعت کا مقصد علی گڑھ تحریک یا مسلمانوں کو باعزت بنانے کی تحریک کی مخالفت کرنا تھا۔ لیکن ان الفاظ کو بہت چھپا کر اور مضامین کے ایسے تناظر میں لکھا گیا کہ قاری اس ایک جملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا اور اس کو صرف ایک سیاسی اختلاف سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور تصنیف ڈسکوری آف انڈیا میں اعتراف کیا ہے کہ مولانا آزاد نے علی گڑھ تحریک پر سخت حملے کئے جو قدامت پرستی اور اینٹی نیشنل نظریہ کی حامل تھی۔ مولانا نے ایسے خیالات اور نظریات کو مشتہر کیا جس نے علی گڑھ تحریک کی بیخ کنی کر دی۔

ABUL KALAM AZAD ATTACKED THIS STRONG-HOLD OF CONSERVATISM AND ANTI-NATIONALISM NOT DIRECTLY BUT BY SPREADING IDEAS WHICH UNDERMINED THE ALIGARH MOVEMENT.

ان نظریات اور خیالات کو مشتہر کرنے کا خاص ذریعہ پہلے الہلال تھا اور بعد میں اس کے بند ہونے پر البلاغ تھا۔ ان رسائل کے صفحات سرسید، مسلم یونیورسٹی کی تحریک، محسن الملک وقار الملک، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کی نسبت مخالفانہ مضامین سے بھرے پڑے ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی مولانا کے بہت بڑے مداح تھے یہاں ہم ان کے ایک مضمون سے اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے مولانا کا علی گڑھ تحریک کا مخالف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

"اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ پروگرام کی

۱۔ جواہر لال نہرو، ڈسکوری آف انڈیا .... صفحہ نمبر ۳۵۱

تائید میں نہ تھے"

بعد غورِ کامل بھی وہ اصول سمجھ میں نہیں آسکتے کہ جن کی بنا پر مولانا آزاد مسلم یونیورسٹی تحریک کی حمایت میں نہ تھے۔ ان اصولوں کو واضح کرنے کے لیے ہی ہم نے تحقیق کرنے کا تہیہ کیا ہے کہ جن کی بنا پر مولانا آزاد مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم الشان تحریک کے مخالف تھے۔

اسی طرح وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کی طرف سے "جدید ہندوستان کے معمار" سیریز کے تحت شایع ہونیوالی کتاب "ابوالکلام آزاد" میں "البلاغ" کی ایک عبارت کو نقل کرتے ہوئے عرش ملسیانی نے اعتراف کیا کہ "انہوں نے ۱۹۱۵ میں البلاغ نکالا۔ اس کی بھی وہی شان تھی وہی گھن گرج مسلمانوں کو سرسیّد کی انگریز پرستی سے متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بُت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر لطافت کے لیے ایک مخصوص بت ہوتا تھا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں"۔ مولانا کی یہ ضرب کلیمی علی گڑھ تحریک کے لیے مہلک ثابت ہوئی[۲]"

اس کتاب میں مولانا کی یہ خدمت بتائی گئی ہے کہ انہوں نے علی گڑھ کی روایات کی بیخ کنی اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے ذریعہ کی کہ یہ تحریک قدامت پرستی کی علمبردار تھی۔

"آزاد نے قدامت پرستی کے قلعہ پر حملہ کیا۔ یہ حملہ براہ راست نہیں بلکہ اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ کیا گیا۔ اس نے علی گڑھ کی روایات کی بیخ کنی کردی"۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے خیالات کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ ان کے مشہور رسائل الہلال و البلاغ ہی تھے۔ یہ چند مثالیں ہم نے حامیانِ آزاد کی صرف اس لیے پیش کیں تاکہ ہمارے اوپر مولانا کے

---

[۱] علی گڑھ میگزین انتخاب نمبر ۷-۱۹۷۵ء صفحہ ۳۳۱

[۲] عرش ملسیانی : ابوالکلام آزاد ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۱۔

مخالف ہونے کا الزام نہ لگ جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ مولانا علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے ہمارا کوئی نیا خیال ہے بلکہ یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ رائے ان لوگوں کی بھی ہے جو مولانا آزاد کی تعریفوں میں اپنا تمام زور قلم صرف کر دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں مولانا کا مقصدِ حیات ہی یہ تھا کہ نہ صرف مسلم یونیورسٹی کی تحریک بلکہ علی گڑھ تحریک یا بالفاظ دیگر مسلمانوں کو باوقار و باعزت بنانے کی تمام تحریکوں کی مخالفت کی جائے اور انہوں نے تمام زندگی اس فرض کو نبھایا نہ صرف اپنے دعووں اور دلیلوں سے بلکہ قرآنی آیات کو بھی اپنے دلائل کی صداقت ثابت کرنے کے لیے بے موقع و بے محل استعمال کیا۔ جس شخص کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا ہے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قرآن شریف کو اس بے دردی اور غلط طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔

مولانا آزاد کے سیاسی پلیٹ فارم پر آنے کا یہی زمانہ ہے جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی غیر منقسم ہندوستان کا کوئی مسلمان اس تحریک سے الگ نہ تھا گاؤں کے دہقانوں کسانوں غریب مزدوروں سے لے کر تعلیم یافتہ نوکر پیشہ افسران اور بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں تک تمام کی تمام ملت یونیورسٹی حاصل کرنے کے لیے اپنے تن من اور دھن کی بازی لگائے ہوئے تھی آخر اس زمانے میں یعنی ۱۹۱۰ء کے آس پاس ۳۰ لاکھ روپیہ جمع کرنے کی شرط جو حکومت نے لگائی تھی وہ ملتِ مسلمہ کے عام چندہ کے بغیر کیسے پوری ہو سکتی تھی۔ اس زمانے کے ۳۰ لاکھ روپیہ آج کے ۲۰ کروڑ روپیے سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ آج اگر ہم سے کہا جائے کہ یونیورسٹی بنانے کے لیے ۲۰ کروڑ روپیہ مسلمان جمع کر دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ۳۰ لاکھ روپیہ بھی ہم تمام مل کر جمع نہیں کر سکتے۔ یہ تھا فیضانِ سرسید کہ تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ قوم نے ۳۰ لاکھ روپیہ یونیورسٹی کے نام پر اپنا پیٹ کاٹ کر، طلباء نے اپنا جیب خرچ کم کر کے، عورتوں نے اپنے زیورات قربان کر کے، غرض بے شمار قربانیاں دیکر جمع کیا۔ اس زبردست جذبۂ ایثار کو مولانا مسلمانوں کے جوش کو ضایع کرنے سے تعبیر کرتے ہیں اور رہنمایانِ ملت کی اس "غلط روی" کے متعلق اپنے افسوس کا اظہار الہلال میں شایع اپنے ایک مضمون میں کرتے ہیں جس کا عنوان تھا "نشۂ شام کی نصف شب یا مسلم یونیورسٹی"۔ عنوان پر غور کریں اور دیکھیں کہ "آج تک مسلمانوں میں کوئی بھی تحریک

ایسی پیدا ہوئی ہے جو شہروں قصبوں سے لے کر دیہاتوں تک پہنچ جائے؟ ہر گھر میں اس کا چرچا ہو ہر جگہ اس کا جوش و خروش۔ کوئی طبقہ اور فرقہ اس سے خالی نہ ہو۔ ممبروں پر سے اس کے لیے واعظ کہا جائے اور خانقاہوں میں اس کے ذکر پر حال و قال ہو..... یونیورسٹی کا قافلہ جدھر سے گذر جائے لوگ جوش و نشاط سے بے خود ہو کر اس طرح قدم لینے کو دوڑیں گویا ملائے اعلیٰ اور قدسیان عالم بالا عرش الٰہی کو چھوڑ کر دنیا میں اتر آئے ہیں...... ہم رو سکتے ہیں مگر اپنے آنسو ہر شخص کو نہیں دکھا سکتے ہیں کہ بدبخت ملت کا اس قدر قیمتی جوش کس بے دردی سے ضایع کر دیا گیا تو ہمارے دل کے ٹکرے ٹکرے ہو جاتے ہیں اور حیران رہ جاتے ہیں کہ رہنمایانِ ملت کی اس غلط روی کی نسبت کیا کہیں....." [1]

جوش تو ضرور ضایع ہوا لیکن مولانا آزاد کا۔ رہنمایانِ ملت صحیح راستے پر تھے اور ان کے دلوں میں خلوص تھا اور تعمیر کی لگن۔ لہٰذا یونیورسٹی بنی اور خدا کے فضل و کرم سے آج تک قائم و دائم ہے۔ اور انشاءاللہ رہتی دنیا تک رہے گی۔

گذشتہ تمہید سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ مولانا کے مدح نگاروں کی رائے میں بھی مولانا مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں کے مخالف تھے اس غرض میں اور ثبوت فراہم کرنے سے پہلے ہم ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری قوموں کی تعلیمی حیثیت کا تقابل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

---

[1] الہلال ۱۰ ستمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۵۔

ہندوستانیوں کی نئی تعلیم کا آغاز

راجہ رام موہن رائے

راجہ رام موہن رائے کی شخصیت نئے ہندوستان کی اساس ہے۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے اہلِ ہند کی غلامی کی وجوہات پر گہرائی سے غور کیا اور بجائے انگریزوں کو غاصب اور ظالم بتانے کے اپنی قوم کو نئی تعلیم اور سائنس کی طرف متوجہ کیا۔

۲۲ مئی ۱۷۷۲ء کو راجہ رام موہن رائے بنگال کے رادھانگر گاؤں میں پیدا ہوئے یہ گاؤں اس وقت ضلع بردوان میں تھا۔ راجہ رام موہن رائے ایک کٹر برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے افراد عرصۂ دراز سے مرشد آباد کے مسلم گھرانوں کی ملازمت میں تھے۔ ان کے والد رام کانت رائے ایک کٹر ہندو تھے اور سختی کے ساتھ شاستروں کی تعلیمات پر عمل کرتے تھے۔

جب راجہ رام موہن رائے اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں تاریخ ہند کے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو مسلم حکومت منہدم ہو رہی تھی۔ انگریز جو ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے خود کو رفتہ رفتہ حکمرانوں میں تبدیل کرتے جا رہے تھے۔ جنگ پلاسی نے بنگال کی قسمت پر پندرہ سال پہلے ہی یعنی غدر سے پورے سو سال پہلے ۱۷۵۷ء میں مہر لگا دی تھی۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں یہ حقیقتاً تاریک ترین دور تھا۔ پرانا مسلم معاشرہ اور تمدن پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ قدیم معاشرتی نظام کے کھنڈرات ہر طرف بکھرے نظر آتے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی طاقت وجود میں نہیں آئی تھی جو اس ملبے کو صاف کرے۔

پرانی بنیادوں پر نئی تعمیر کی کوشش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مردہ رسموں، منجمد دستوروں اور نامعقول تعصبات نے ہندوستانیوں کے سرچشمۂ حیات کو مسدود کر دیا تھا۔ علم کی دولت ہاتھ سے جاتی رہی تھی غرض یہ کہ سخت تاریکی کا دور تھا۔ مغرب انگریزوں کی معیت میں صرف تجارتی نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ تاریخ کے آلۂ کار کی حیثیت سے داخل ہوا تھا جس کے نصیب میں ہندوستان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے نئے علوم اور سائنس کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

قدیم تعلیم بے فائدہ ہے:

راجہ رام موہن رائے کو احساس تھا کہ اس وقت ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج ہے اس میں زبردست اصلاح کی ضرورت ہے۔ سائنسی طریقۂ استدلال کو رواج دینے کی ضرورت تھی۔ ضرورت تھی کہ سنسکرت کی جگہ علوم طبیعی، فزکس، کیمسٹری، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے ۱۸۲۳ء میں جب کمپنی کی حکومت نے ہندو پنڈتوں کے تحت ایک سنسکرت اسکول قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ اس تعلیم کا بندوبست کیا جا سکے جو ہندوستان میں پہلے سے رائج تھی تو رام موہن نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت ہندوؤں کو نئی تعلیم اور اصل علم سے بے خبر رکھنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن اسکو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے۔ یہ خط در اصل آنے والے ہندوستانی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرنا تھا۔ اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس کی ہوا بھی نہ لگی تھی کہ ملک کس راہ پر جا رہا ہے۔ رام موہن رائے نے لکھا:

> "ہندو پنڈتوں کے تحت حکومت ایک سنسکرت کالج قایم کر رہی ہے تاکہ وہ تعلیم دی جا سکے جو پہلے سے ہندوستان میں رائج ہے...... ان درسگاہوں میں طالب علم وہ چیزیں سیکھینگے جو دو ہزار برس پہلے سے معلوم ہیں البتہ صرف بے معرف اور کھوکھلی دقیقہ سنجیوں کا اضافہ ہو جائیگا جن کا اس عرصہ میں مفکروں نے اضافہ کر دیا ہے۔ اگر برطانوی قوم کو اصل علم سے بے خبر رکھنا

مقصود ہوتا تو بیکن کے فلسفے نے متکلمین کی تعلیمات کی جگہ اسکولوں میں لے لی ہوتی وہ تعلیم جہل و لاعلمی کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے بشرطیکہ برطانوی مجلسِ قانون ساز کی یہی حکمت عملی ہو لیکن چونکہ حکومت کا مدعا برطانوی رعایا کی ترقی ہے اس لیے ضروری ہے کہ زیادہ معقول اور روشن خیال نظام تعلیم کو رواج دیا جائے جس میں ریاضی طبعی فلسفہ، کیمسٹری اناٹومی دیگر علوم مفیدہ کے ساتھ پڑھائے جائیں۔[۱]"

رام موہن رائے پر وہی الزامات ہندو پنڈتوں نے لگائے جو پچاس سال بعد سرسید پر دینی علما نے لگائے۔ کہا کہ یہ شخص سنسکرت ختم کرانا چاہتا ہے اور ہندوؤں کے دھرم کو نشٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے ہر طرف یہ بات پھیل گئی کہ رام موہن رائے سے ہندو دھرم کو سنکٹ ہے۔ جس طرح سے پنڈتوں کے دلائل میں کوئی دم نہیں تھا اسی طرح سرسید کے خلاف لگائے الزامات عقل و مذہب کی کسوٹی پر پورے نہیں اترے لہٰذا دونوں، مقامات پر پنڈتوں اور دینی علمار کے طبقے کو آخر کار اسی راہ پر آنا پڑا جس پہ کہ رام موہن اور سرسید لانا چاہتے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے ہندو سماج میں پھیلے ہوئے توہمات اور بت پرستی پر کتاب لکھی ان کے باپ عقائد میں بہت کٹر تھے۔ انہوں نے رام موہن کو گھر چھوڑنے کا حکم دیا۔ رام موہن نے ہندو دھرم کی بالکل نئی تفسیر کی جس کے بغیر ہندو سماج کو ترقی یافتہ بنانے کی بات سوچنا ہی فضول تھا۔ ان کے مذہبی رجحانات اور خیالات کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس، سے ہوتا ہے جو ان کی مشہور کتاب "تحفۃ الموحدین" سے لیا گیا ہے:

"عادت یا کسی چیز سے مسلسل ربط کے سبب جو کچھ وجود میں آتا ہے اور ان داخلی صفات میں جو اقوام یا افراد کی فطری خواہش کا نتیجہ ہوتی ہیں فرق کر لینے والے لوگ خوش نصیب ہیں یہ لوگ اپنی حتی المقدور کوشش سے یہ تحقیق کرتے

---

[۱] رابندر ناتھ ٹیگور: ہندوستانی ادب کے معمار راجہ رام موہن رائے۔ ساہتیہ اکادمی ترجمہ نور الحسن نقوی صفحہ ۴۳، ۴۴، سنہ ۱۹۷۶ء

ہیں کہ مختلف قوموں کے مذہبی عقائد میں کون سے عقائد و اصول سچے ہیں اور کون سے جھوٹے۔ ایسا کرنے میں یہ لوگ تعصب و جانبداری سے بری ہوتے ہیں، یہ لوگ ان مسائل کی بھی تفتیش کرتے ہیں جنہیں سب لوگوں نے یہ تحقیق کیے بغیر تسلیم کر لیا ہے کہ ان کی وکالت کرنیوالوں کی کیا حیثیت ہے[1]"

رام موہن رائے کے مذہبی خیالات یقینی طور سے اس زمانے کے مروجہ ہندو دھرم سے بہت مختلف تھے اسی لیے ان کو شروع ہی پنڈتوں اور عام ہندوؤں کی زبردست مخالفت سہنی پڑی۔ لیکن رام موہن رائے کی اسی خصوصیت اور انداز فکر نے ان کے ذہن کو ہندوؤں کے لیے نئے علوم کی تعلیم جاری کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے اپنے کیریر کا آغاز سرسید کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کیا اور کمپنی کے ریونیو ڈپارٹمنٹ میں نوکری کر لی۔ ملازمت کے دوران انہیں یورپ اور انگلستان کے سیاسی تغیرات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کے انگریز افسروں کے پاس جو اخبارات و رسائل انگلستان سے آیا کرتے تھے وہ ان کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے تھے اپنی اسی ملازمت کے دوران میں انہوں نے انگریزی سیکھنی شروع کی۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی تحریک خاص ہندوؤں کے لیے تھی، انہوں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے تعلیم کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے برخلاف سرسید نے ہمیشہ ہی یہ کہا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کا بھلا چاہتے ہیں اور کالج کے دروازے ہندوؤں کے لیے بند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی کوششوں سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ شمالی ہند کے ہندوؤں میں بھی تعلیم کا ذوق شوق پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا اور انہوں نے اپنی تعلیمی کوششیں تیز کر دیں اور ولایت میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن بنگال میں جس وقت موہن رائے کی تحریک پر ہندوؤں نے نئے علوم حاصل کرنا شروع کیے تو مسلمانوں کو ہوا تک نہ لگنے دی اور خاموشی

---

[1] ایضاً۔

یہ راستہ طے کرتے رہے کہ بقول حالی:

"باوجودیکہ ہندو ۱۸۲۴ء سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے کہ جیسے تنہا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا، یہاں تک کہ پچاس برس گذر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ مگر سرسید کی چیخ و پکار صرف مسلمانوں کو ہی جگانے والی نہ تھی بلکہ اس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اُس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ انگلستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ ان کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اس پر نہیں کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال ان میں صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسید کے شور و غل سے پیدا ہوا تھا"[۲]

نئے علوم اور سائنس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کامیاب ہوئیں اور رام موہن رائے ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیرے (ایک انگریز آفیسر) کے تعاون سے کلکتہ میں ہندو کالج قیام کرنے میں کامیاب ہوئے۔

"ہندو کالج کے قیام کی پہلی میٹنگ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سر ہائیڈ ایسٹ کے مکان پر ۱۴ مئی ۱۸۱۶ء کو ہوئی۔ انگریز چیف جسٹس سے رام موہن رائے نے درخواست کی کہ ممتاز ہندو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک تعلیمی ادارے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں جس میں ایسے آزادانہ طریقے سے تعلیم دی جائے جیسے یورپ میں دی جاتی ہے[۱]" اس میٹنگ میں شہر کے ممتاز ہندوؤں نے شرکت کی اور اسی وقت پچاس ہزار روپیہ اکٹھا ہو گیا۔ ۱۸۱۶ء میں پچاس ہزار روپیہ کی قیمت کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں ہے۔

اس کالج نے بہت ترقی کی اور اس کے طالب علموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا چلا

۲:۔ حالی، حیات جاوید ص ۲۶۳، ۱۹۸۲ء، ترقی اردو بورڈ۔ ۱:۔ ایضاً

گیا۔ ۱۸۲۵ء میں ۲۳۴ طالب علم اس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ دسمبر ۱۸۲۱ء میں رام موہن رائے نے ایک بنگالی ہفتہ روزہ سمبد کمودی شایع کرنا شروع کیا انہوں نے اس ہفتہ روزہ کے ایک شمارے میں ایک مضمون لکھا جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ غریب ہندو بچوں کو مفت تعلیم دینے کے لیے ایک اسکول قائم کرے۔

مسلمانوں کا انکار: جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ہندوؤں میں تعلیم کا اتنا شوق اور ولولہ پیدا ہو چلا تھا مسلمانوں کو اپنی نسلوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ ایسی تمام کوششوں کو خلافِ مذہب خیال کرتے تھے۔ بعض اوقات کسی خاص لمحہ پر کیے گئے فیصلے صدیوں پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں اسی طرح کا ایک فیصلہ مسلم دینی علما اور رئیسوں نے کیا۔ جب لارڈ میکالے کی اسکیم کے تحت یہ قرار پایا کہ ہندوستانیوں کو بھی یورپین سائنس اور دیگر علوم پڑھائے جانے کا انتظام کیا جائے تو دینی علما نے آٹھ ہزار عالموں اور رئیسوں کے دستخطوں سے یہ درخواست گورنمنٹ میں گذاری کہ ایسا کرنا خلافِ مذہب ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ اس واقعہ سے گیارہ سال پہلے کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے اور معزز ہندوؤں و پنڈتوں نے سنسکرت کالج کے قیام کی مخالفت کی تھی۔ اور کہا تھا کہ ہمیں سائنس پڑھانے کی ضرورت ہے نہ کہ سنسکرت۔ دراصل دو تہذیبوں اور اس کے عالموں کے متضاد ردعمل نے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کی ترقی میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ اگر اسی وقت مسلمان شاہ عبد العزیز کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے نئی تعلیم کو قبول کر لیتے تو شاید صورتحال آج بالکل دوسری ہوتی۔ سید محمود نے اس واقعہ کو اپنی ایک تقریر میں یوں بیان کیا ہے:

"نہایت ہی قابلِ غور یہ امر ہے کہ جب کلکتہ میں ایسا ہی ایک سنسکرت کالج کھولنا چاہا جیسا کہ مسلمانوں کے لیے مدرسہ تھا تو تمام راجوں اور رئیسوں کی طرف سے ایک عرضداشت بہ سربراہی راجہ رام موہن رائے ۱۸۲۴ء کو بخدمت گورنر جنرل ہند بھیجی گئی کہ ہم کو سنسکرت دانی کی ضرورت نہیں ہے ہمیں

ہا اپنے علوم سکھاؤ اور اپنی تدابیرِ ملک بتاؤ۔ ادھر ایک ہم بدنصیب مسلمانوں کی قوم تھی کہ جب ۱۸۳۵ء میں انصاف پسند لارڈ میکالے کے زور سے یہ فیصلہ ہوگیا کہ یورپین سائنس اور انگلش لٹریچر کی ہندوستانیوں کو تعلیم دی جائے اور گورنمنٹ نے اسکولوں اور کالجوں کے کھولنے اور ان کی تعلیم کے لیے وظائف دینے پر توجہ کی تو مسلمانوں نے ایک عرضداشت تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں، علماء اور مشائخ کے دستخط تھے کہ ہم انگریزی نہیں پڑھتے ہماری زبان عربی فارسی ہے وہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہندوستانیوں کو کرسچان بنانے کا ہے۔ علومِ انگریزی پر توجہ کرنا دینِ عیسوی کی اشاعت کی تدبیر ہے[۱]"

اس واقعہ کو حالی نے یوں بیان کیا ہے:

"کلکتہ کے مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار عالموں اور رئیسوں کے دستخط تھے اور جس کا حاصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے"[۲]

علماء اور رؤسا کی روش انتہائی غیر دانشمندانہ تھی اور کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو کہ عقلی علوم کی حمایت میں آواز اٹھا سکے اور آنے والے زمانہ کے بارے میں اندازہ لگا سکے کہ ملک کس روش پر جا رہا ہے۔ تمام لوگ عوام کیا خواص کیا ایک بدتر قسم کے تعصب میں پڑے ہوئے تھے۔ تقلید نے ان کے ذہنوں کو بند کر رکھا تھا اور قدم صحیح راستے پر اٹھنے کے بجائے معذور تھے۔ یہ حالات ۱۸۷۵ء تک رہے۔ یہاں تک کہ سرسید نے ایک مدرسہ علی گڑھ میں کھولا پورے پندرہ سال کی انتھک کوششوں اور جان لیوا جد وجہد کے بعد کسی نہ کسی طرح مسلمانوں

---

[۱] گزٹ جنوری ۱۸۹۶ء صفحہ ۳۴۔ [۲] حیات جاوید صفحہ ۲۵۸۔

کے ایک محدود طبقہ کو عقلی علوم حاصل کرنے پر رضامند کر لیا۔ اس مدرسہ کی شروعات بہت محدود پیمانے پر چند طلبا سے ہوئی۔ اس زمانہ تک کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں پوری الحاقی یونیورسٹیاں بن چکی تھیں۔ اور ہندوؤں نے تعلیم کے میدان میں عظیم الشان سبقت حاصل کرلی تھی۔ اس وقت کے مسلم علماء اور رئیسوں کی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے بادشاہِ وقت کے خیالات کے بارے میں سر سید کی رائے کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ "دلّی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا طابع دار ہے تو وہ اس کو صحیح سمجھتا۔۔۔۔۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے اس کی تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔" لہ

انیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ جس میں راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالی اور ان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ایک طاقت ور اور ترقی پسند قوم بنا دیا مسلمانوں کے لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا انتہائی تاریک ترین دور تھا۔ اسی زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا زوال اپنے عروج کو پہنچا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مضبوط ہوئے۔ مسلمان جاہ و منصب سے محروم ہوئے اور انگریز حکمرانوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ بادشاہِ وقت کا یہ عالم کہ ہندو مہاجنوں سے قرض نہ ملے تو صرف قلعہ کے ہی ملازمین کی تنخواہیں دینا مشکل پڑ جاتا تھا۔ اکبر شانی نے اقتصادی پریشانیوں سے مجبور ہو کر رام موہن رائے کو انگلستان بھیجا تاکہ وہ نام و نہاد بادشاہ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو پنشن بڑھانے کی درخواست گذاریں۔ پرستانوں کے جنوں کے بادشاہ کو اپنا طابع دار سمجھنے والا شاہِ دہلی ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا۔ لہٰذا رام موہن رائے کی کوششوں سے کمپنی نے ان کے وظیفے میں تین لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ منظور کیا۔

"انگلستان پہنچتے ہی رام موہن رائے نے شہنشاہ دہلی کے مطالبات کے سلسلے میں ایک عرضداشت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز اور لندن کے بہت سے باأثر اشخاص کو پیش کر دی تھی۔ حالانکہ شہنشاہ دہلی کے کل مطالبات تسلیم نہیں کیئے گئے۔ لیکن ۱۳ فروری ۱۸۳۳ء کو

لہ اسباب بغاوت ہند ص ۲-۸، ضمیمہ حیات جاوید۔

اس کا کچھ حصہ منظور کر لیا گیا. کورٹ آف ڈائرکٹرز نے شہنشاہ دہلی کے وظیفے میں تین لاکھ روپیے سالانہ کا اضافہ منظور کر لیا لے۔"

بادشاہِ وقت کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا لیکن وہ بہرحال بادشاہ تھا حکم چاہے کمپنی بہادر کا ہو لیکن ملک بہرحال ابھی بادشاہ کا تھا اور سیکڑوں سال کی حکمرانی کا نشہ مسلمانوں کے ذہنوں سے آسانی سے اترنے والا نہ تھا. حتیٰ کہ آج تک مسلمان یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ حکمرانی کرنا یہ ہندو کیا جانیں جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور وقت کے تقاضوں کے متعلق اپنے اندر صلاحیتیں پیدا کرنے کا کوئی جذبہ مسلمانوں میں پیدا نہ ہوا تھا اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مسلمان جہاں بھی گئے فاتح کی حیثیت سے گئے اور ہر جگہ اپنے علوم و فنون کو رواج دیا. انہیں پہلی بار ایک فاتح قوم سے واسطہ پڑا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اپنی زبان اور اپنے علوم ترک کر کے دوسرے علوم اور کوئی دوسری زبان سیکھنی پڑ رہی تھی. صدیوں حکومت کرنے کے بعد اب مسلمانوں میں یہ صلاحیت باقی نہ رہی تھی کہ وہ خود کو حالات کے مطابق تبدیل کر سکیں. ہندوؤں اور مسلمانوں کے رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے مسلمانوں کی غیر دانشمندی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "ہندوؤں کے سامنے اس طرح کے فخر و امتیاز کے مٹنے اور ایسے حالات سے نپٹنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا. اس لیے انہوں نے آسانی سے سرِ تسلیم خم کر دیا اور جس صورتحال کا ان کو سابقہ تھا اس سے اپنے آپ کو ساز کر لیا. جہاں وہ حکومت نہیں کر سکتے تھے وہاں انہوں نے حکم برداری قبول کر لی. اس طرح بیشتر حالات میں انہوں نے جہاں کہیں جیسا موقع دیکھا اس میں اپنے آپ کو ڈھال لیا...... مسلمانوں کا طرزِ عمل دانشمندانہ نہ تھا. انہوں نے اپنے آپ کو تمام ملازمتوں سے علیحدہ رکھ کر اس تعلیم سے خود کو محروم کر لیا جسے انگریزی حکومت یا دوسری ایجنسیاں ان کے لیے فراہم کرتی تھیں اور جو ان کو سرکاری نوکری کے لیے سزاوار بنا سکتی تھی. اس دوران ہندو بالخصوص بنگالی

لے: سمیندر ناتھ ٹیگور. ہندوستانی ادب کے معمار راجہ موہن رائے. ساہتیہ اکاڈمی، ترجمہ نور الحسن نقوی ص ۲۱ ۱۹۸۴ء

بنگالی نے اس حقیقت کو پالیا کہ علم زور بھی ہے اور زر بھی لہ"

علوم میں زور بھی تھا اور زر بھی اور آج بھی ہے۔ نئی تعلیم اور ترقی سے مسلمانوں میں ہمیشہ ہی سے بیزاری رہی ہے اس زمانہ سے آج تک۔ اور یہ بات خاص طور سے قابلِ توجہ ہے کہ وہ لوگ جو کہ دینی قیادت کی کرسیٔ جلیلہ پر رونق افروز رہے ہیں انہوں نے ہی اکثر نئے علوم اور سائنس کو مذہب کے مد مقابل کھڑا کر کے مسلمانوں کو نئی تعلیم سے روکا چنانچہ سب سے پہلے حکومت کی تعلیمی کوششوں کی شروعات پر یہ الزام لگایا گیا کہ حکومت مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ہندو پنڈتوں نے بھی شروع میں بہت شور و شرابہ برپا کیا کہ راجہ رام موہن رائے ہندو دھرم نشٹ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ شر چند سال سے زیادہ برقرار نہ رہ سکا اور ہندوؤں کا روشن خیال حقیقت پسند اور دور اندیش طبقہ بہت جلد ان پر حاوی ہو گیا اور پنڈتوں کی ایک نہ چلی۔ اس کے برخلاف اگر یہ کہا جائے کہ دینی علماء کا طبقہ آج تک سائنس کی تعلیم کا مخالف ہے چاہے اب زبان سے نہ کہے لیکن عملی طور سے وہ اس کی شدید مخالفت کرتا ہے تو یہ حقیقت سے شاید زیادہ دور نہ ہو اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ دینی اور سائنسی تعلیم کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا اور ان کے لیے جدا جدا مدرسے قایم کرنا اس طرح مسلم سوسائٹی میں دو اجنبی طبقے پیدا ہو رہے ہیں جو کہ ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔ علامہ شبلی کے ندوۃ العلوم (لکھنؤ) کی حالت کیا ہوئی کہ انھوں نے صرف انگلش زبان کو داخلِ نصاب کرنا چاہا اور نتیجہ یہ کہ دینی علماء نے ان کو نکال باہر کیا ورنہ آج لکھنؤ میں بھی مسلمانوں کی ایک یونیورسٹی ہوتی۔ سائنسی ترقیات سے فائدہ اٹھانے میں سب لوگ یکساں شامل ہیں۔ مثلاً یہ کہ بلب کی روشنی سے گھر روشن کریں گے، پنسلین سے ٹی بی کا علاج کریں گے، اینٹی بائوٹکس سے انفکشن کو روکینگے، کاروں ریلوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کریں گے، بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں الگ الگ ٹیلیفون لگائیں گے، چھاپہ خانوں میں کتابیں چھپوائیں گے اور لاؤڈ اسپیکر کو اذان کے لیے استعمال کرنے کے علاوہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر زور دار اور گرجدار تقریریں کریں گے یہ تمام فوائد تو الحمد اللہ ہم ضرور حاصل کریں گے لیکن سائنس کے کافر ہونے میں شک نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالسلام نے تہذیب الاخلاق میں ایک

لہ۔ انڈین نیوز، ۱۳ر جنوری ۱۸۷۵ء بحوالہ نورالحسن نقوی سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۲۔

واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کچھ یوربین حضرات کے ساتھ بیٹھے تھے تذکرہ نکل آیا پسماندہ ممالک میں غریبی اور جہالت کا اور اُن کو درپیش پریشانیوں کا تو کسی ایک صاحب نے عبدالسلام صاحب کو مخاطب ہو کر کہا کہ "سلام کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں نے دنیا کے علوم میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کیا ہے ان کو ترقی یافتہ یا خوشحال بنانے کی ذمہ داری ہماری ہے" کسی بھی غیور قوم کے لیے یہ واقعہ تازیانۂ عبرت ہے یہ تو سائنس کی بدقسمتی ہے کہ اب تک مسلمان نہ ... ئی۔ لیکن جو چیز کہ خاص اللہ نے اتاری اور رسولؐ اللہ نے پیش کی یعنی "اسلام" اس کا ہم نے کیا حال کیا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ ۷۲ فرقوں کی پیشن گوئی ہے بھی تو حضرت آپ کو اس قدر جلدی کیوں ہے کہ اس کو آپ کے سامنے ہی پورا ہونا چاہیئے۔ شاید یہ خوف ہے کہ آنے والے نہ جانے کس طرح تفریق کریں غلط یا صحیح۔ ایک قرآن، ایک رسولؐ اور اسلام ہزار طرح کا۔ مسجدیں الگ الگ نماز کے طریقے جدا جدا۔ اور سب ایک دوسرے کی نظر میں گمراہ۔

سرسیّد احمد

وہ ناصح او رہو نگے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے۔

اس تنزلی کے عالم میں جبکہ چاروں طرف جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا راہِ عمل اور صراطِ مستقیم کہیں کھو گئی تھی مسلمانانِ ہند کی سب سے عظیم الشان اور ہمہ گیر شخصیت کی، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدائش ہوئی۔

سرسید احمد خاں باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں ان کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلعم تک پہونچتا ہے۔ ان کے والد میر متقی کا لال قلعہ میں بہت زیادہ رسوخ تھا اور بادشاہ کی خواب گاہ تک ان کی باریابی تھی۔ سرسید بچپن میں اپنے والد کے ساتھ اکثر لال قلعہ میں جاتے تھے سرسید کے حقیقی نانا وبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد دوبار اکبر بادشاہِ ثانی کے وزیر اعظم رہے۔ وہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بااقبال لایق دانشمند صاحب علم وفضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں اولاد کی تربیت کا خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کی زندگی اور شخصیت پر سب سے زیادہ ان کی والدہ کا اثر رہا ہے۔ ان کی والدہ کی شخصیت کے بارے میں چند واقعات کا نقل کرنا بہت نصیحت آموز ہے جس زمانہ میں کہ سرسید کی عمر گیارہ سال تھی انہوں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور ضعیف تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ اس واقعہ کی جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے سرسید کو گھر سے نکال دیا اور نوکروں کے ذریعہ باہر سڑک پر کھڑا کرا دیا۔ اور یہ تین دن تک اپنی ایک خالہ کے یہاں رہے۔ آخر کار جب سرسید نے نوکر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تب کہیں جاکر ان کا قصور معاف ہوا اور گھر میں رہنے کی اجازت ملی۔ سرسید کی والدہ جیسی سمجھدار اور دانشمند تھیں

اس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ ایک بار سرسید کی والدہ اور ایک لاوارث بوڑھی عورت جس کی خبر گیری وہ کیا کرتی تھیں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کو حکیم نے ایک ہی معجون تجویز کی۔ یہ سوچ کر کہ قیمتی معجون اس بوڑھیا کو کون بنوا کر دیگا سرسید کی والدہ نے اپنی ساری معجون بوڑھیا کو کھلا دی۔ جس زمانہ میں سرسید دہلی میں منصف تھے تو ان کی والدہ نے نصیحت کی کہ جہاں تمہیں ہمیشہ جانا ضروری ہو وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو کہ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ اسی طرح سرسید ایک شخص سے انتقام لینا چاہتے تھے جب ان کی والدہ کو یہ ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگذر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو۔ جو ہر بدی کو پوری سزا دینے والا ہے اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے"۔[1] ان واقعات سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ انصاف پسندی جیسا کہ پہلے واقعہ سے ظاہر ہوئی خدمت خلق جیسی کہ دوسرے واقعہ سے پتہ چلی اور وسیع النظری اور حقیقی شان اسلامی یہ فضیلتیں سرسید کے اندر اپنے خاندان سے ورثتاً ملیں۔

سرسید نے رسم بسم اللہ کی تقریب کے بعد قرآن مجید پڑھنا شروع کیا ان کے گھر میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے سارا قرآن ناظرہ پڑھا اس کے بعد ان کو پڑھانے کے لیے مختلف ذی علم اور بزرگ حضرات معمور ہوتے رہے۔ فارسی اور عربی کی بہت سی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کے ننہال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ماموں سے ریاضی کی تعلیم کی شروعات کی۔ اس کے بعد آلات رسد کو جاننے کا شوق ہو گیا اور بہت سے رسائل ان موضوعات پر اپنے ماموں سے پڑھے۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کا علم حاصل کیا اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ اور پھر پڑھنا چھوڑ دیا جب انہوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دہلی میں جو حضرات اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں شامل ہونے کا اکثر موقع ملتا رہا۔

---

[1] حیات جاوید۔ ص ۴۴

اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے اپنی غفلت و بدمستی کے متعلق لکھا ہے:

"ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھارہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔ جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو ولی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار"[1]

آغازِ شباب میں رنگین محفلوں کا بھی شوق رہا۔ دہلی کے عام رئیس زادوں کی طرح رقص کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ لیکن سرسید ابھی ۲۱ سال ہی کے تھے کہ ۱۸۳۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس سے پہلے ان کے بھائی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان دونوں واقعات نے سرسید کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اور وہ دوبارہ سے اکتساب علم کی طرف مائل ہوگئے۔ مالی مشکلات سے بچنے کے لیے انہوں نے عزیز و اقارب کے مشوروں کے باوجود بجائے قلعہ کی نوکری کرنے کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔

نوکری کا آغاز: اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے لہٰذا سب سے پہلے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں (جو کہ اس وقت دہلی میں صدر امین تھے) کے ساتھ کچہری میں کام سیکھنا شروع کیا۔ کام سیکھنے کے بعد وہیں ملازم ہوگئے۔ اس کے بعد فروری ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی ہوکر منتقل ہوگئے۔ آگرہ میں انہوں نے منصفی کے متعلق قوانینِ دیوانی کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ اسی کتاب کی بدولت کمشنر آگرہ نے ان کیلئے عہدۂ منصفی کی سفارش کی لیکن ابھی یہ تقرر ہو بھی نہ پایا تھا کہ اس عہدہ کے لیے مقابلہ کا امتحان جاری ہوگیا۔ سرسید بھی امتحان میں شریک ہوئے۔ اور پہلے سال ہی میں یہ امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کرلیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوگئے۔ منصف ہونے کے بعد مقابلے کے امتحان کا خلاصہ کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور بہت سے لوگ اس کی بدولت منصف

---

[1] ایضاً ص ۵۷

ہو گئے۔ ۱۸۴۶ء میں سر سید مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور آ گئے۔ اسی زمانہ میں امرائے دہلی کی سفارش پر سر سید کو ان کے دادا کا خطاب بادشاہ نے عنایت فرمایا۔ بلکہ جواد الدولہ میں عارفِ جنگ کا اضافہ کر کے جواد الدولہ عارف جنگ سر سید احمد خاں کا خطاب عطا کیا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے سبب ۱۸۵۴ء تک دہلی میں ہی قیام رہا۔ دہلی آکر دوبارہ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اور اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے فقہ، حدیث اور قرآن کا درس لے کر سند حاصل کی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی اہم تصنیف آثار الصنادید مکمل کی جس میں دہلی کی تقریباً تمام مشہور قدیم عمارتوں کی تاریخ چھاپی۔ اس کتاب میں کل ملا کر ۲۳۲ عمارتوں کی تاریخ، کتبہ اور نقشہ جات کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی یونیورسٹی اتنے کام پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دینا فخر سمجھے گی۔ لہٰذا اس زمانہ میں بھی اس کتاب کی بہت تعریف ہوئی اور سر سید کی شہرت یورپ تک پہنچ گئی۔ فرانسیسی زبان کے علاوہ بھی اس کے تراجم ہو کر مقبولِ عام ہوئے۔ اس کتاب کی بدولت سر سید کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا جو کہ علمی خدمت کا عالمی اعتراف سمجھا جاتا ہے۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں سر سید کا تبادلہ بجنور ہو گیا۔ بجنور میں دو سال کا جو عرصہ غدر سے پہلے گذرا اس میں انہوں نے دو بہت اہم علمی کارنامے انجام دیئے۔ پہلا آئینِ اکبری کی تصحیح اور دوسرا تاریخ بجنور مرتب کرنا۔

مسلمانوں کی حکمرانی سے بیدخلی

یوں تو ہندوستان کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے ہی نکلا جا رہا تھا لیکن جس واقعہ نے دراصل مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور انہیں اپنی غلامی کا صحیح احساس دلایا وہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہے۔ اس وقت سر سید بجنور میں صدر امین تھے۔ غدر سے پہلے کی تمام زندگی سر سید نے تحقیق و تصنیف میں صرف کی اور سیاست سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن غدر میں جو کچھ ہوا جس طرح مسلمانوں کی رہی سہی حکومت بھی جاتی رہی اور انگریز حکمرانوں نے صرف مسلمانوں کو ہدفِ ملامت بنایا اس نے سر سید کے دل میں کچھ کر گزرنے کا خیال پیدا کیا۔ اور ان کی زندگی کا رخ مسلمانوں کی اصلاح کے کاموں کی طرف موڑ دیا جس راستے پر وہ زندگی کی آخری سانس تک چلتے رہے۔ اور اپنے بعد سیکڑوں افراد کا قافلہ چھوڑا جس نے کہ ان کی بتائی

ہوئی راہ پر استقامت سے سفر کیا جس کے نتیجے میں مشہور و معروف علی گڑھ تحریک وجود میں آئی۔

غدر کی شروعات میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے لیکن چونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ ہندوؤں کو اپنا ہمنوا بنا کر مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا جائے تاکہ وہ آئندہ حکمرانی کا خواب تک نہ دیکھ سکیں۔ اس وقت تک مسلمان ہی حکمراں تھے ان ہی کو دبانا بھی غاصبوں نے ضروری خیال کیا لہٰذا ساری بربادی مسلمانوں کی ہوئی کوئی شریف باعزت مسلمان پورے ملک میں نہ بچا انگریزوں کی تیغ ستم مسلمانوں کے لیے بے نیام ہوئی اور ہندو اس سے محفوظ رہے۔ ہنٹر لکھتا ہے۔ "غدر کے بعد انگریز مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور صرف ان ہی کو اپنا دشمن سمجھنے لگے"۔ [۱] اس دشمنی کے نتیجے میں کوئی ذی اثر اور دولت مند مسلم خاندان ہندوستان میں نہ بچا۔ جواہر لال نہرو اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غدر کے بعد انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ دبایا۔

AFTER THE MUTINY THE BRITISH GOVERNMENT HAD DELIBERATELY REPRESSED THEM TO AN EVEN GREATER DEGREE THAN IT HAD REPRESSED HINDUS. (DISCOVERY OF INDIA, P.347)

اسی واقعہ کے متعلق جواہر لال نہرو آگے رقمطراز ہیں کہ غدر حالانکہ ہندو اور مسلمانوں کا متحدہ اقدام تھا لیکن مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ ان پر زیادہ پریشانیاں پڑیں بالکل صحیح ہے اور اسی کے ساتھ دہلی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

THE REVOLT OF 1857 WAS JOINT AFFAIR BUT IN IT'S SUPRESSION MUSLIMS FELT STRONGLY AND TO SOME EXTENT RIGHTLY THAT THEY WERE THE GREATER SUFFERERS. THIS REVOLT ALSO PUT AN END TO ANY DREAMS OR FANTASIES OF THE REVIVAL OF DELHI EMPIRE. (IBID)

لہ :۔ بحوالہ راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل۔ ص ۱۸۹

ٹہ :۔ ڈسکوری آف انڈیا، جواہر لال نہرو۔ ص ۳۴۷

۳ :۔ " " ص ۳۵۰

اس غدر نے ایک طرف مسلمانوں کی حکومت کے درخشاں دور کو ختم کر دیا دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں کے بیچ سیاسی اور سماجی اختلافات کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا کہ انگریزوں نے سیاسی حکمت عملی کے طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف گواہیوں میں استعمال کر کے ان کو پھانسیاں دیں ہندوؤں نے بھی انگریزوں سے مفاہمت میں ہی عافیت سمجھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اعتراف ہے کہ باوجود یہ کہ غدر ہندو اور مسلمانوں نے مل کر کیا تھا لیکن انگریز خصوصیت سے مسلمانوں کو ہی اپنا دشمن سمجھنے لگے اور زیادہ مصیبتیں ان پر نازل ہوئیں۔

"ایک بات بالکل یقینی ہے وہ یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں شریک ہوئے اور دونوں دہلی کے بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ساتھ زیادہ خصومت آمیز تھا کہ جن کے ہاتھوں سے انہوں نے ملک فتح کر کے چھینا تھا۔"[۱]

مسلمانوں کے ہاتھوں سے دولت اور حکومت چھن گئی۔ خود مغل خاندان کلیۃً تباہ و برباد ہو گیا انگریزوں نے غدر کے بعد خاص طور سے سرکاری نوکریوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے۔ عام طور سے مسلمان نوکریوں اور جاگیروں پر ہی گذارا کرتا تھا تجارت پیشہ اور کاریگر طبقہ ان میں کم تھا لہٰذا جاگیروں کی ضبطی اور نوکریوں سے نکالے جانے کے سبب ایک باعزت قوم بے وقار اور بے عزت ہو کر رہ گئی۔ "انتقام کے زبردست ہاتھ نے بہت سے ایسے خاندان تباہ و برباد کر دیئے کہ جو اس سے پہلے دولت اور حکومت میں کھیل رہے تھے۔ انہیں دبانے کی بالقصد ایک پالیسی حکومت کے تمام محکموں میں اختیار کر لی گئی۔ مسلمان نہ صرف ملک کے انتظام کے اعلیٰ ترین شہری عہدوں پر ممتاز تھے بلکہ فوج میں ان کا تعلق اور بھی زیادہ نمایاں تھا۔ اول الذکر اعزاز سے انہیں محروم کرنے کے لیے دو سبب جمع ہو گئے۔ ایک تو برطانوی حکومت کی پالیسی ان کے خلاف کام کر رہی تھی دوسرے اس پالیسی کو مدد ان مسلمانوں کے طرزِ عمل سے مل گئی۔ جو اپنے اس غم انگیز تجربے کے بعد اپنے گھروں کے اندر روٹھ کر بیٹھ رہے اور ایک عرصہ تک انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا کہ جو رائج کر دی گئی تھی اور جس کے بغیر حکومت کی ملازمتیں ملنا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا تھا۔"[۲]

---

[۱] راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل ص ۱۸۸۔ [۲] ایضاً صفحہ ۱۸۹۔

سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیئے گئے

۱۹۴۷ء کی تقسیم وطن کے بعد اس بات کا اغلب گمان پایا جاتا ہے کہ جمہوری ہندوستان میں خاص محکموں مثلاً فوج، پولیس اور ایڈمنسٹریٹیو پوسٹوں پر مسلمانوں کے نہ لیے جانے کی پالیسی اختیار کر لی گئی۔ لہٰذا سرکاری نوکریوں میں مسلمان بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال کا دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ مسلمان انگریزی تعلیم اور سائنس کی طرف سے اتنا ہی بے بہرہ اور بے نیاز ہے جتنا کہ اس زمانہ میں تھا۔ اگر تقابلی تجزیہ کیا جائے تو وہی نسبت آج بھی موجود ہے جو کہ غدر کے بعد کی تھی۔ اتر پردیش پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلے میں اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق انسپکٹر کی رینک سے نیچے مسلمان صرف ۷۴ء ۱۴٪ (۷.۱۴٪) تھے یہ رپورٹ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کے ڈیٹا پر منحصر ہے۔ ؎۲

	RANK & CADRE	NO. OF MUSLIMS	PERCENTAGE
1-	INSPECTOR C.P.	9	1.36
2-	INSPECTOR A.P.	5	3.81
3-	SUB-INSPECTOR C.P.	307	4.03
4-	" " A.P.	41	8.28
5-	ASSTT. SUB-INSPECTOR C.P.	22	7.58
6-	HEAD CONSTABLES C.P.	431	6.15
7-	"" "" A.P.	482	9.09
8-	CONSTABLE C.P.	4418	7.47
9-	" " A.P.	1235	7.40
	TOTAL	6947	7.14

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی محکموں میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں بھی مسلمان ان کی آبادی کے لحاظ سے موجود نہیں ہیں۔ جمہوری اداروں کا کم از کم فرض یہ ہوتا ہے کہ آبادی کے تناسب سے ان میں ہر فرقہ کی نمائندگی ہو۔

انگریز ہندوؤں پر شروع سے ہی اعتبار کرتے چلے آئے تھے اور مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے ۱۸۴۴ء کی لارڈ ایلن برو کی تحریر سے مندرجہ ذیل اقتباس ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب میں

؎۲۔ بحوالہ مسلم انڈیا ستمبر ۱۹۸۴ء صفحہ ۴۰۲

نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کی یہ حکمت عملی تھی کہ ہندوؤں سے مصالحت کریں۔

"مجھے یہ حد درجہ کی بے وقوفی معلوم ہوتی ہے کہ جبکہ ہمیں آبادی کے دسویں حصہ کی دشمنی کا یقین ہے تو پھر بھی ہم دس میں سے باقی نو حصوں کی پرجوش مدد حاصل نہ کریں جو کہ وفادار ہیں میں اس اعتقاد کی طرف سے اپنی آنکھیں نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے اور اس لیے ہماری صحیح حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ ہندوؤں سے مصالحت کریں"[1]۔

انگریزوں کی یہ پالیسی غدر میں ہندوؤں کے حصہ لینے کے باوجود بھی ختم نہیں ہوئی اور اسی طرح مسلمانوں کو دشمن اور ہندوؤں کو وفادار سمجھا جاتا رہا اور وفاداری کے صلے میں نوکریوں اور حکمران طبقہ میں شمولیت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

"۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اس میں حصہ لینے میں پیچھے نہ رہے لیکن انگریزوں کا اعتبار ہندوؤں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تلخ تجربے کے بعد بھی نہ ہٹا تھا"[2] یوں تو مسلمانوں کی حکومت سے بے دخل کرنے کی پالیسی شروع سے ہی انگریزوں نے اختیار کر رکھی تھی لیکن غدر کے بعد اس میں اور شدت آگئی۔ ہنٹر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ انگریزوں کے آنے کے وقت مسلمان ہی سب سے زیادہ باعزت اور افضل قوم تھے لیکن اب سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کو نہیں دی جاتیں اسی طرح غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی ان کا دخل بالکل بند ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھے وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں ہی برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں ہے"[3]

مسلمانوں کو انگریزی تسلط میں بالکل تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ سراسر ہندوستان کی ہندو آبادی کو ہوا جو کہ انگریزوں کے شانہ بشانہ نئی تعلیم حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی اور انگریزوں

---

[1] راجندر پرشاد ص ۱۰۸ ہندوستان کا مستقبل [2] ایضاً ،،

[3] ہمارے ہندوستانی مسلمان

کی ہندوؤں سے مصالحت کی پالیسی سے زبردست فائدہ اٹھارہی تھی۔ انگریزوں کے مقاصد کے لیے یہ بہت مناسب پالیسی تھی کہ ملک کی اکثریت کو ہمنوا بنالیں اور مسلم اقلیت کو جن سے انہوں نے اقتدار چھینا تھا انہیں عزت اور دولت سے محروم کرکے اصلی غلام بنائیں کیونکہ مسلمان ہی ان سے حقیقتاً اپنی تاریخی روایتوں کے سبب لڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہنٹر رقمطراز ہے کہ:

"مسلمانان ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصّہ لے رہا ہے اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔"[۵]

اسی سبب سے مسلمان، جو کہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں سرکاری محکموں پر جیسے کہ دیوانی پولیس وغیرہ میں چھائے ہوئے تھے ان کو نکال کر ہندوؤں کو لینا شروع کردیا اور اس طرح تمام سرکاری ملازمتیں صرف ہندوؤں کے حصہ میں آئیں۔ ہنٹر مسلمانوں کے جذبات جو انگریزوں کی پالیسیوں کی وجہ سے مجروح ہوئے تھے ان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم جذبات و شجاعت سے معرا...... اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے، مرتکب ٹھہراتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا...... یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے تحت برباد کردیا گیا"

برطانوی حکمرانوں کے مسلم مخالف رویہ کے سبب مسلمان ہر طرح کی نوکریوں سے محروم ہوگئے۔

۵:۔ حالی کا سیاسی شعور صفحہ ۲۹۔ ہنٹر ہمارے ہندوستانی مسلمان۔

"انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمان دیوانی، پولیس، عدالت اور فوج میں چھائے ہوئے تھے اور یہ محکمے ان کی دولت اور آمدنی کے سب سے بڑے ذرائع تھے لیکن انگریزوں نے ان کے نظام کو ختم کر کے ان پر سرکاری ملازمتوں کے تمام دروازے بند کر دیئے"۔ ؎۱

بغاوت کچلنے کے بعد انگریز مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے پر تل گئے۔ اور ان کی برتری جو ہندوستان کی دوسری قوموں پر تھی ختم کر دی جو کہ ان کے حکمراں ہونے کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ سویلین اور ملٹری عہدوں میں اکثریت کی وجہ سے حاصل تھی

THE BRITISH TURNED ON MUSLIMS AS THEIR REAL ENEMIES THAT THE FAILURE OF THE REVOLT WAS MORE DISASTROUS TO THEM THAN TO THE HINDUS. THEY LOST ALMOST ALL THEIR REMAINING TRADITIONAL PRESTIGE OVER THE HINDUS. THEY FORFEITED THE CONFIDENCE OF THEIR FOREIGN RULERS AND IT IS FROM THIS PERIOD THAT ONE MUST DATE THE LOSS OF THEIR NUMERICAL MAJORITY IN THE HIGHER SUBORDINATE RANKS OF SERVICES ؎۲

ایک اور ثبوت ہنٹر نے اس بات کا صاف اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں سے چھوٹی بڑی ہر طرح کی نوکریاں چھین کر ہندوؤں کو دی جانے لگیں۔ حالانکہ حکومت اپنی رعایا کے تمام فرقوں کی فلاح و بہبود کی پابند ہوتی ہے مگر انگریز حکومت نوکریوں کے واسطے گزٹ کرتے وقت مسلمانوں کو اس میں درخواستیں گذارنے تک کی اجازت نہیں دیتی تھی اور اس وقت مشکل سے ہی حکومت کا کوئی آفس ہو گا جس میں مسلمان چپراسی، خدمت گار، مزدور سے بڑے کسی عہدے پر ہو۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ایک بنگالی مسلمان کے غریب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ کوئی صاحبِ ثروت مسلمان نہ بچا۔

؎۱ (جذبی): حالی کا سیاسی شعور ص۱۳

؎۲ GARRET & THOMPSON : THE RISE & FULFILMENT OF BRITISH RULE IN INDIA (P.439)

ALL SORT OF EMPLOYMENT GREAT AND SMALL ARE BEING GRADUALLY SNATCHED AWAY FROM MOHAMMADENS AND BESTOWED ON MEN OF OTHER RACES, PARTICULARLY HINDUS. THE GOVERNMENT IS BOUND TO LOOK UPON ALL CLASSES OF ITS SUBJECTS WITH AN EQUAL EYE, YET THE TIME HAS NOW COME WHEN IT PUBLICLY SINGLES OUT THE MOHAMMADENS IN IT'S GAZATTES FOR EXCLUSION FROM OFFICIAL POSTS ... THERE IS SCARSELY A GOVERNMENT OFFICE IN WHICH A NOHAMMADEN CAN HOPE FOR ANY POST ABOVE THE RANK OF PORTER, MESSANGER, FILLER OF INKPOTS AND MENDOR OF PENS ...

(HUNTER, W.W.: THE INDIAN MUSLAMANS, P.132)

سر ہنٹر ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کے صدر رہتے اور ایک آئی سی ایس آفیسر تھے ہمیں آج کسی ایسے آئی اے ایس آفیسر کی تلاش ہے جو کہ ایسی حقیقت پسندی سے اتنے واضح انداز میں خود اپنی حکومت کو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرنے کا ذمہ دار قرار دے سکے، ہر طرح کی سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کے لیے حاصل کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اس وجہ سے بھی مسلمان تعلیمی اور اقتصادی میدان میں دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ حکومت کو ملک کی بھلائی اور اس میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اس طرح کی ناانصافیوں سے اجتناب کرنا چاہیئے ورنہ ایک ہی شہر میں ایک طرف امیر خوش حال طبقہ اور دوسری طرف غریب اور بدحال طبقہ کب تک صلح و آشتی سے رہ سکتا ہے؟ اس وقت تک جب تک کہ عوام میں یہ احساس بیدار نہیں ہو جاتا کہ ہمارے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہے اور یہ احساس اب تیزی سے پھیل رہا ہے حکومت کو چاہیئے کہ خبردار ہو جائے اور اپنے عمل اور انصاف سے اس انتشار کو پھیلنے سے روک لے ورنہ ایک ہی قصبہ میں غریب بھوکا اور زمین پر سوتا رہے اور امیر ڈنلپ کے بستر پر آرام سے سوئے، کیا یہ حالت بہت دن چل سکتی ہے؟ ہر گز نہیں۔ تو حکومت کی، ملک میں رہنے والے ہندو اور مسلمانوں اور دوسرے طبقات کی بھلائی اس میں ہے کہ سب مل بیٹھ کر انصاف کا کوئی طریقہ نکالیں۔

انگریز حکمرانوں کی یہ پالیسی کہ وہ ہندوؤں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں کو ہر طرح ذلیل و خوار کریں جنگ پلاسی کے بعد سے ہی چلی آتی تھی۔ اس کا خاص اظہار ۱۸۱۶ء میں کلکتہ میں ہندو کالج کے قیام سے ہوا جو کہ انگریز آفیسروں کی سرپرستی میں راجہ رام موہن کی تحریک کے سبب وجود میں آیا۔ ۱۸۴۲ء میں کابل اور غزنی پر انگریزوں کی فتح پر ہندوؤں نے خوب خوشی کا اظہار کیا اور اس طرح انگریزوں کو ہندوؤں کی مصلحت پسندی کا ایک اور ثبوت ملا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ایلنبرنے ۱۸۴۲ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا:

"مجھے اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ خاص وہ لوگ جن کی گذر ہمارے ہی ٹکڑوں پر ہے وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے۔ بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا کامل یقین ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا ساتھ دیں جس کی تعداد ۹/۱۰ ہے اور ہماری وفادار ہے" [۱]

ہندوؤں کی طرفداری کی یہ پالیسی ۱۹۰۰ء تک چلتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اس میں اور بھی شدت پیدا کر دی۔ بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر گئی اور انتقام اپنی تمام تر قہرمانی قوتوں کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمان انگریزوں کی بارگاہ میں مردود تو پہلے ہی تھے اور اب باغی اور حکومت کے بدترین دشمن بھی سمجھے جانے لگے۔ ہندوؤں کی نسبت یہ کیفیت نہ تھی۔ ہندوؤں کی زمانہ سازی اور انگریزوں سے مفاہمت کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ہنٹر ۱۸۷۰ء میں لکھتا ہے:

"مسلمانان ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے اپنے لیے بہت

---

[۱] محمد امین زبیری: مسلمانان ہند کی سیاست وطنی ۱۹۳۸ء۔ آگرہ ۱۶ (صفحہ)

بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں،، ۱؎

زمانہ ساز ہندوؤں نے غدر میں حصہ لینے کے بعد فوراً انگریزوں سے صلح کرنے میں عافیت سمجھی اور انگریزوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ سر سید طیب جی کو ایک مراسلے کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان جن چلے تھے بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان برباد ہو گئے،، ۲؎

باغی مسلمان قرار دیئے گئے اُن کو سزا دینے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہ تھی بس ان کا مسلمان ہونا کافی تھا۔ دہلی میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا تھا مسلمان صرف شناختی کارڈ دکھا کر ہی داخل ہو سکتا تھا۔ مغلوں کی دہلی میں مسلمان برباد تھے اور ہندو آباد۔

"اس ہنگامہ کی شروعات تو اس طرح ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بشانہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ انجام کار برادرانِ وطن نے حکمراں قوم سے مصالحت کرنے میں ہی عافیت دیکھی اور ان کے ہمنوا ہو گئے، ۱۸۵۷ کی رستا خیز کے بعد غالب کی دلی میں ہندو تو آباد تھے مگر مسلمان اجڑ گئے تھے اور بلا ٹکٹ ان کا داخلہ شہر میں ممنوع تھا۔ انگریز حاکموں کے نزدیک باغی کے معنی تھے مسلمان اور مسلمان کے معنی تھے باغی،، ۳؎

انگریزوں کی مسلم کش پالیسی شروع سے ہی چلی آتی تھی اس لئے کہ یہ ملک انہوں نے مسلمانوں سے ہی چھینا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی قوم اگر ہمارے مقابلے پر آتی ہے تو یہ مسلمان ہی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ہر طرح تباہ و برباد کیا گیا۔ غدر سے بہت پہلے ہی سے یہ پالیسی چلی آتی تھی کہ جتنا ہو سکے مسلمانوں کو دبا دیا جائے۔ مسلمان عام طور سے نوکر پیشہ تھے انگریز دور کی شروعات میں حکومت کے تمام محکموں میں مسلمان چھائے ہوئے تھے اور یہ محکمے ان کی دولت اور آمدنی کے

۲؎ (بحوالہ ناموران علی گڑھ پہلا کارواں صفحہ ۲۳۰) ۳؎ (نورالحسن نقوی: سر سید اور ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۸)
۱؎ (ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم صادق حسین ص۲۱)

سب سے بڑے ذرائع تھے لیکن انگریزوں نے ان کے نظام کو ختم کر کے ان پر سرکاری نوکریوں کے تمام دروازے بند کر دیئے اور ہندوؤں کو نوازنا شروع کیا۔ طبابت وکالت اور دیگر غیر سرکاری پیشے جن پر مسلمان قابض تھے وہ بھی حکومت کی مسلم کش پالیسی، انگریزی تعلیم اور طلب انگریزی کے اجراء کی بدولت مسلمان کے ہاتھ سے جاتے رہے تھے۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ نوکریوں کے اشتہاروں میں صاف لکھا جاتا تھا کہ اس میں مسلمان درخواست نہ گذاریں ہندو اور دوسری قومیں امیدوار ہو سکتی ہیں:

"اگر کچھ آسامیاں خالی ہوتیں تو اشتہار میں اس بات کی وضاحت کر دی جاتی کہ ہندوؤں کے علاوہ یہ کسی کو نہ دی جائیں گی یعنی جہاں تک ملازمتوں کا تعلق ہے مسلمانوں کی اہلیت یا نااہلیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا" [۱]

ہنٹر نے بہت واضح طور سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب یہ ملک انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو مسلمان علم سیاست اور حکمت عملی ہر طرح سے سب سے اعلیٰ قوم تھے لیکن اب ہر قسم کی نوکریوں کے دروازے ان پر بند ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھے وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں ہی برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکمت عملی میں بھی سب سے زیادہ افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے غیر سرکاری ذرائع میں بھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں ہے" [۲]

سرسید پر غدر کے اثرات غدر کے سبب خود سرسید کے خاندان پر بے انتہا تباہی آئی ان کے خاندان میں ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ انگریز فوج نے ان کے گھر کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔

"میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا

---

[۱] (جذبی: حالی کا سیاسی شعور صفحہ ۳۲) (ہمارے ہندوستانی مسلمان ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صفحہ ۲۴۹)
[۲] (ایضاً)

گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔ جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چل دیئے تھے اور سرسید کا کنبہ بھی۔ جبکہ ان کے ماموں وحید الدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں کے ہاتھ مارے گئے،، لہ

حدیہ کہ سرسید کی والدہ پر انتہائی پریشانی کا وقت گذرا۔ جب ان کا گھر پورا لٹ گیا تو انہوں نے ایک لاوارث بوڑھیا کی کوٹھری میں پناہ لی۔ اور آٹھ دن نہایت تکلیف کے گذارے حتیٰ کہ کھانے کو کچھ نہ ملا تو گھوڑے کے دانے پر گذر کی۔ محسنِ قوم کی قابلِ صد احترام والدہ نے جن سے کہ سرسید کی محبت اور عقیدت ضرب المثل تھی، انگریزوں کے ہاتھوں اتنی تکلیفیں اٹھائیں کہ سرسید جب میرٹھ سے دلی پہنچے اور والدہ سے ملاقات ہوئی تو ان کو دو دن سے پانی تک نہ ملا تھا۔

"جب ان کا سارا گھر لٹ گیا تو وہ حویلی چھوڑ کر جلو خانہ کی ایک کوٹھری میں جہاں زرین نام کی ایک بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اس کوٹھری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی،، کہ

کسی طرح سرسید ان کو میرٹھ لے آئے اور رفتہ رفتہ ان کا تمام خاندان وہاں جمع ہو گیا۔ بھوک پیاس کی شدت کی وجہ سے صفرا کی بیماری پیدا ہوئی اور آخر کار اسی مرض میں کچھ ہی دن کے بعد میرٹھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

"سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہو گیا تھا کوئی دوا یا غذا ہچتی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر میرٹھ میں انتقال کیا،، کہ

لہ (حیات جاوید صہ ۸۱) کہ (حیات جاوید صہ ۸۱) کہ (حیات جاوید صہ ۸۲)

ذرا تصور میں لایئے وہ حالات کہ گھر بار سارا لٹ گیا خاندان تباہ ہوا حتیٰ کہ تمام دنیا سے پیاری والدہ کا انتقال بھی انہیں مصائب سے ہوا جو کہ غدر کی وجہ سے ان پر پڑے اس کے علاوہ سارے دوست احباب اور ان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ اپنی قوم کے غم میں ہمہ وقت اشکبار رہنے والی آنکھوں میں کتنا خون نہ اتر آیا ہوگا۔ غم و غصے سے ان کے جذبات میں کیسے کیسے ابال نہ آئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا اور ہوش کا دامن نہ چھوڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نادان مجاہد کی طرح وہ بھی تلوار لے کر میدان میں اتر آتے۔ لیکن انہوں نے غور کیا سوچا اور سمجھا اس تباہی کی اصل وجوہات کا پتہ لگایا اور ایک دانا مجاہد کی طرح جہالت اور ان سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جن کی وجہ سے مسلمانوں پر یہ عذاب آیا تھا۔

سرسید کے کریکٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ خود ان کا خاندان تباہ ہوا ایک عام آدمی یہی سوچتا کہ کسی طرح پھر سے خاندان کو بساؤ اور مال و دولت جمع کرو لیکن ان کو اپنے خاندان کا مطلق غم نہ تھا بلکہ تمام مسلمانوں کے اجڑنے کا صدمہ تھا۔ اپنے لیے مال و اسباب جمع کرنا اور عیش کی زندگی گذارنا کچھ مشکل نہ تھا جبکہ خود انگریز حاکموں نے ان کو بجنور میں انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچانے کے عوض میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر دینا چاہی تو سرسید نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے زیادہ نالایق کوئی نہ ہوگا کہ قوم تو ایسی بربادی میں زندگی گذارے اور میں جاگیردار بن کر عیش کروں۔ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک لاکھ روپیہ کی جائداد کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ قوم مفلس ہے تو میں امیر ہو کر کیا کروں گا۔ اور آج ہم پوری پوری زندگی اس میں گذار دیتے ہیں کہ شاید کبھی کچھ مل جائے۔ اور ہمیں نہیں تو ہماری اولاد کو شاید ہماری وفاداری کا صلہ مل جائے سرسید پر انگریز پرستی کا الزام لگانے والے قوم پرور مسلمان ذرا پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسے شخص کی دکھائیں جس نے صرف اتنی قربانی ہی دی ہو۔

جو کچھ رنج تھا قوم کی بربادی کا ، ، غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنے گھر لٹنے کا رنج تھا

نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا... جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعوض اس وفاداری کے تعلق جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالایق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلق دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز یہ نہ سمجھا تھا کہ قوم پھر پنپیگی اور کچھ عزت پائے گی۔

جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا چند روز اسی خیال اور اسی غم میں رہا آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" [1]

اسی قومی ہمدردی نے انہیں آئندہ چالیس سال تک مضطرب رکھا اور اسی اضطراب سے انقلاب آفریں کارنامے انجام پذیر ہوئے۔

---

[1] (حیات جاوید ۸۶ صفحہ)

یوں تو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء حکومت کے خلاف ایک عرصہ سے چلی آ رہی بہت سی شکایتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ہوا مگر شروعات اس کی میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ انگریزوں نے فوج میں نئے کارتوس رائج کئے جن پر خوب موٹی چربی ہوتی تھی۔ دانت سے کاٹ کر یہ بندوق میں لگائے جاتے تھے۔ شہرت ہوئی کہ یہ گائے کی چربی ہے اس سے ہندوؤں میں اشتعال ہوا اور یہ بھی شہرت ہوئی کہ اس میں سور کی چربی ہے اس سے مسلمانوں میں بیزاری پھیلی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو یکایک میرٹھ چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ شروع کیا۔ انہوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا اور ان کے بنگلوں میں آگ لگائی اور وہ دہلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے اپنی سرپرستی پر مجبور کیا۔ اور وہ مجبور ہوکر عوام کے ساتھ ہو گیا۔ ورنہ جنگ اس کے اور مسلمانوں کے وہم و گماں میں بھی نہ تھی۔ غدر کے بعد جو کچھ ہوا اس بربادی کی داستان ایک روح فرسا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہے۔

مغلوں اور غالب کی دلی میں مسلمانوں پر بے پناہ قہر ٹوٹا ہزارہا مسلمان سرِعام پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے۔ کوئی باعزت مسلمان دلی میں نہ بچا اس تباہی و بربادی کی داستان کو حالی نے ایک مرثیہ میں بیان کیا ہے۔

تذکرۂ دہلیِ مرحوم اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

شاعر فلک سے فریاد کرتا ہے کہ اب تو تیرے مٹانے کے نشان بھی مٹ گئے

یعنی اس درجہ بربادی کہ مٹنے کے نشان تک برباد ہو گئے اب نہ مٹانا۔

مٹ گئے بتبرے مٹانے کے نشان بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

مایوسی اور نامرادی کا یہ عالم ہے کہ شاعر قسمت کے خراب ہونے کو اس کا آرام کرنا ظاہر کر رہا ہے اور کہتا ہے بہت جاگ لیے اب ذرا قسمت کو آرام کرنے دو اسے سونے دو۔

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماروں کو جگانا ہرگز

سرسید رقم طراز ہیں کہ:

"اب تمام ہندوستان میں پھرو اور قدیم شہروں اور قدیم قصبوں میں جاؤ اور دیکھو کہ جو معبد کہ ویران اور شکستہ حال پاؤ گے وہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں گی جو چھت بوسیدہ اور خم در خم رسیدہ دیکھو گے وہ سقف خانۂ مسلم ہوگی جو دیوار نبیدہ اور از سرتاپا افتادہ پاؤ گے وہ دیوار کسی مسلمان کے محل سرا کی ہوگی" [1]

یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ انگریز تو پہلے ہی سے مسلمانوں سے بدظن تھے ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔ اس زمانے میں انگریزوں نے جتنے مضامین رسالے اور کتابیں لکھیں ان میں مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا گیا۔ کبھی کہا گیا کہ مسلمان اسے جہاد خیال کرتے تھے اور کبھی کہا گیا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئی پر یقین کرتے تھے کہ اب انگریزوں کی عمل داری ختم ہو جائے گی اس لیے وہ بغاوت پر کمربستہ ہوگئے۔ یہ صورت حال سرسید کے لیے خاصی پریشان کن تھی لہٰذا انہوں نے یہ ثابت کیا کہ فساد ہندوؤں نے شروع کیا تھا مسلمان من چلے تھے بیچ میں کود پڑے۔ اس زمانہ کے متعلق سرسید لکھتے ہیں کہ

"یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو ۱۸۵۷ء۔۵۸ء میں ہندوستانی مسلمانوں

---

[1] سرسید کے لیکچرز کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین صفحہ ۱۳۹)

پر گذرا کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی گو وہ رام دین یا ماتا دین نے ہی کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمان کا گھر نہ ڈھونڈا ہو.... جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمان نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا،،[1]

سرسید کے یہ الفاظ مسلمانوں کی بربادی کی صحیح تصویر کھینچ رہے ہیں یہ بربادی صرف دہلی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام ہندوستان میں مسلمان دولت اور حاکمیت سے محروم کر دیئے گئے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کی جاگیریں جائدادیں ضبط ہوگئیں ہر طرف پھانسیوں کا بازار گرم ہوگیا گلی کوچہ تختۂ دار بن گئے۔ ان حالات کا سرسید نے ایک دور اندیش مدبر کی طرح جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔

،، ایک مدت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجیے جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھی جتنی امیدیں باندھتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو اسی بات پر دل ٹھہرا ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا،،[2]

---

[1] (لائل محمڈنز آف انڈیا صفحہ ۱۲)

[2] (مضامین تہذیب الاخلاق جلد دوم ۱۰۵ صفحہ مرتبہ ملک فضل دین)

کلمۂ حق

اسبابِ بغاوتِ ہند

سرسید کی مسلمانوں کو پھر باعزت وباوقار بنانے کی کاوشوں کی ابتدا اسبابِ بغاوتِ ہند کی تصنیف سے ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے واقعات کی ذمہ داری مسلمانوں اور دوسرے ہندوستانیوں پر نہیں انگریزوں کی حکمت عملی پر عائد ہوتی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ حکومت مسلمانوں سے بے انتہا بدظن تھی مسلمانوں کے جرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان کا مسلمان ہونا ہی کافی تھا اور برادرانِ وطن بھی حکومت کی خیر خواہی کی آڑ میں مسلمانوں سے بدلے لے رہے تھے مسلمانوں کی حمایت کرنا جہاد سے کم نہ تھا۔

"ہندوستانی خیر خواہِ سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا" [۱]

ایسے وقت میں جب کہ مسلمان ہر طرف سے گھرا ہوا مطعون ہو رہا ہو مسلمانوں کی خیر خواہی میں کچھ کہنا نہ صرف کہنا بلکہ خود حکومت کی غلط پالیسیوں کو غدر کے واقعات کا ذمہ دار قرار دینا خودکشی کے مترادف تھا۔ زمانہ نہایت نازک تھا خیالات ظاہر کرنے کی مطلق آزادی

---

[۱] حیات جاوید صفحہ ۹۲

نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ ایسے وقت میں انہوں نے جبکہ وہ مراد آباد میں تعینات تھے، اسباب بغاوت ہند لکھی جس میں عام ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کو جن پر سارا الزام غدر کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں حکومت پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کئے اور جو وجوہات انگریزوں کے ذہنوں میں تھیں ان کی تردید کی اور ان کو غلط بتایا۔ سرسید کی زندگی کا صرف یہ ہی ایک مجاہدانہ کارنامہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے چھینا تھا اور اس وقت تو مکمل غلامی تھی اور آج جب کہ ہندوستان آزاد ہے ملک میں جمہور کی حکومت ہے آزادی کی چالیس سالہ تاریخ میں ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے حق کو حق کہنے کی جرأت کی ہو اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو حکومت کے سامنے رکھا ہو بلکہ الٹا مسلمانوں کو ہی فرقہ پرست اور قدامت پرست کہہ کر موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو رسالہ مکمل کرنے کے بعد بغیر اس کا ترجمہ انگریزی میں کرائے سرسید نے اس کی پانچسو جلدیں چھپوالیں۔ جب انہوں نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مالغ آئے اور کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلادو اور ہرگز اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ لیکن سرسید کو جو آہنی عزم اور ارادہ کے مالک تھے قوم کی خیر خواہی منظور تھی چاہے اپنی جان ہی چلی جائے۔

"میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو اگر گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔......

سرسید نے اول دو رکعتیں بطور نفل ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانچسو جلدوں کا پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں" [1]

---

[1] (حیات جاوید صفحہ ۹۴)

یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو کچھ ممبران نے بہت برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس شخص کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیئے کیونکہ اس نے باغیانہ مضمون لکھا ہے سرسید کی اس کوشش کا خاطر خواہ اثر حکومت پر ہوا اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمی انگریز حکمرانوں میں چلی آ رہی تھی وہ کافی حد تک ختم ہو گئی۔ اس رسالہ میں سب سے بڑی شکایت جو سرسید نے کی تھی اور بغاوت کا اصلی سبب بتایا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہو پاتے تھے۔

"گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجسلیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے۔" لے

سرسید کی یہ ایک تاریخی خدمت ہے کہ ان کی کوششوں سے ہندوستانیوں کو حکومت کے معاملات میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا گیا۔ سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد مسٹر بارلیمن نے ایک مضمون ان کی پولیٹیکل خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ کانگریس کو سرسید کے اس احسان کو ماننا چاہیئے کہ ۱۸۵۸ء میں ہی انہوں نے حکومت سے کونسلوں میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

"انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد دل کھول کر انتقام لیں اور ان کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص طور سے بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں۔۔ اس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی۔۔۔۔ ۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے۔۔۔۔ اور جو گو

لے (حیات جاوید صفحہ ۳۲۶)

سرسید کے اس برتاؤ پر جو اس نے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا الزام لگائے

ہیں ان کے لیے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اس نے اتنی مدت پہلے

جتنی کہ ۱۸۵۸ سے اب تک گذری ہے گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لجسلیٹو

کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے،، لہ

اسباب بغاوتِ ہند دراصل حریت کا پہلا بیج تھا جو ہندوستان کی سنگلاخ زمین میں ڈالا گیا جو آگے

چل کر آزادی کی تحریک کا تناور درخت بنا۔ مسٹر ہیوم کو اس کتاب کو پڑھ کر ہی انڈین

نیشنل کانگریس بنانے کا خیال آیا تھا۔ رسالہ کی اس شکایت کو کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں

پر نہیں لیا جاتا اس طرح دور کیا گیا۔

"کتاب مذکور کے پیش ہونے سے دو برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی بار

پنڈت شمبھوناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ

اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوتے تھے ملنے لگے،، ٹہ

غلام ہندوستان میں مسلمانوں کی طرفداری میں جو پہلی آواز اٹھی وہ سرسید کی ہی تھی۔ قلم

کی طاقت تلوار سے زیادہ ہوتی ہے صرف تلوار اٹھانے والے ہی مجاہد نہیں ہوتے بلکہ

دانشمندی کے ساتھ اپنے قلم کو مسلمانوں کے لیے استعمال کرنے والے کو سب سے زیادہ

سراہا جانا چاہیئے اور یہ کہنا کہ جن لوگوں نے تلوار سے انگریزوں کا مقابلہ کیا صرف

وہی مجاہد تھے حقیقت سے انحراف اور قلم کی طاقت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔ کرنل گریہم سرسید

کے پہلے سوانح نگار، لکھتے ہیں۔

"غدر کے زمانے میں اور بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بددلی چھائی

ہوئی تھی اس خوفناک زمانے کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب

کئے جاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعصب زیادہ تر بیجا تھا

مسلمانوں کو اس کا بڑا رنج تھا اور یہ بات ان کو بری معلوم ہوتی تھی

لہ (بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۳۲۴) ٹہ (حیات جاوید صفحہ ۳۲۶)

ظاہراً کسی شخص نے ان کی حمایت میں حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمے لیا اور جہاں تک ان کی قدرت میں تھا انہوں نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر درست کیا۔ ؎۱

خاکہ اسباب بغاوت ہند ' اسبابِ بغاوتِ ہند سرسید کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس نے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے' اور ملک کی سیاست کا دھارا بول دیا۔ انگریز حکمرانوں کو اپنی غلطیوں کا احساس دلایا اور ان کو وسیع انسانی اقدار کے مطابق عمل کرنے کا درس دیا۔ اس کام کے لیے انہوں نے خود عیسائیوں کی مذہبی کتابوں مثلاً متی' پطرس اور زبور کے حوالوں کا استعمال کیا۔ اس کتاب کی مختصر تفسیر یا اجمالی خاکہ قارئین کے لیے اور موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک عبرت کے بطور ہم پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ پتہ لگے کہ جابر حاکموں کے سامنے سرسید نے کس طرح عام طور سے ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کے مسئلہ کو پیش کیا اور خود حکومت کو اس کی غلطیوں کا احساس دلایا کہ وہ اپنی پالیسی بدلیں اگر ہندوستان پر امن سے حکومت کرنی ہے۔ بہت سے انگریز لیڈران نے اس کتاب کو باغیانہ قرار دیا تھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروعات کرکے سرسید نے لکھا

"اس فساد کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیرخواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ گو ان کا علاج بخوبی ہو گیا ہے(۱) پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں ان کو بھی ظاہر کروں،، ؎۲

---

(۱) یہ اشارہ ملکہ وکٹوریہ کے اشتہار کی طرف ہے جس میں عام معافی اور امن وامان کا اعلان کیا گیا تھا۔ سرسید نے اس کے شکریہ کے طور پر مراد آباد میں شاہ بلاقی کی مسجد میں مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا جس میں پندرہ ہزار سے زائد مسلمان شریک ہوئے۔

؎۱ (انتخاب رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لاہور ۱۸۹۹ صفحہ ۱۵۵)
؎۲ اسباب بغاوت ہند صفحہ ۸۰۳ ضمیمہ حیات جاوید۔

اس تمہید کے بعد مضمون اس سوال سے شروع ہوا کہ ہندوستان کی سرکشی کا کیا سبب تھا

اس کے بعد سرکشی کی چند مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ

"جان لو کہ اپنی گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کے شریک ہونا یا مخالفانہ ارادے سے حکم نہ ماننا اور نہ بجالانا یا نڈر ہو کر گورنمنٹ کے حقوق اور حدود کو توڑنا سرکشی ہے"

سرکشی کی اس تعریف کے بعد سرسید نے سوال اٹھایا کہ سرکشی کا ارادہ دل میں کیوں آتا ہے بس یہیں سے ہندوستانیوں اور خاص مسلمانوں کے دلوں میں جو سرکشی پیدا ہوئی اور بغاوت ہوئی اس کی وجوہات بیان کرنے میں سرسید نے ہندوستانیوں پر ہوئی تمام زیادتیاں گنائیں ہیں اور اس طرح ثابت کیا کہ خود حکومت گنہگار ہے ہندوستانی نہیں۔ حکومت کا مدت سے عوام کی رائے کے خلاف عمل کرنے سے انکے دل میں سرکشی کے جذبات پنپ رہے تھے

"۱۸۵۷ کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدتِ دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سالِ گذشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی"

سرسید نے لکھا کہ چپاتی بٹنا کوئی سازش نہ تھی روس اور ایران کی سازش کچھ نہ تھی حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کا ایران کے فرمانروا کو لکھنا کچھ عجب نہیں لیکن یہ سرکشی کی بنیاد نہیں ہے پھر بھی اتنی بہت سی سازشیں اگر ہو رہی تھیں اور حکومت کو پتہ تک نہ تھا؟

"کیا تعجب نہیں آتا کہ اتنی بڑی سازشیں اور اتنی مدت سے ہو رہی ہوں اور ہمارے حکام بالکل بے خبر رہیں"

بس کوئی سازش پہلے سے نہ تھی بلکہ اچانک یہ لاوا پھوٹ پڑا۔ ۱۷۵۷ سے ہی انگریزوں کی حکومت ہندوستان پر قائم ہونی شروع ہو گئی تھی سو سال کے بعد ۱۸۵۷ میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت ختم کرنے کا خیال کیوں آنے لگا؟ بہت سے فسادات کے مواقع آئے اور ملک میں کچھ سرکشی نہیں ہوئی۔ مسلمانوں پر جہاد شروع کرنے کا الزام بالکل غلط ہے۔

"ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا مذہب کے بموجب جرم عظیم تھا پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا"

مسلمانوں کی ناراضگی باعتبار مذہب کے تھی اور ہندوؤں کی بنسبت مذہب میں مداخلت کی وجہ سے مسلمان زیادہ ناراض تھے۔ فوج میں کوئی پہلے سے سازش نہ تھی اور بادشاہ کو مطلق اس سازش کا علم نہ تھا۔

"بلاشبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی تھی۔ مگر جب اس نے سرکار سے بگاڑی تھی تو دلی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا جس کی طرف فوج رجوع کرتی اس میں کچھ پہلے سے سازش کی حاجت نہ تھی۔"

اہلِ ہند کی قانون ساز اسمبلی میں شرکت ضروری تھی

تمام ہندوستانیوں کو ہر الزام سے بری کر کے اور فرداً فرداً ہر طرح پر کی گئی سازشوں کا جواب لکھنے کے بعد جن کو کہ انگریز اپنے خیال میں لا سکتے تھے سرسید نے اصلی سبب شورش کا ہندوستانیوں کا ملک کی قانون ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونا قرار دیا۔ اور اس طرح ایک نئی تحریک شروع ہوئی اور ہندوستانیوں کی حکمرانی میں شمولیت کا دور جاری ہوا۔ سرسید نے بہت عظیم الشان الفاظ میں اظہار کیا:

"اصلی سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔ ... تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ (حکمرانی کے قوانین) کے اس باب میں میرے طرفدار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں ... پیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو اور یہ بات حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ مداخلت رعایا کی حکومت میں نہ ہو۔ علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کی رہنے والی تھی اور مذہب اور رواج راہ و رسم اور طبیعت اور عادات بھی اس ملک سے مختلف رکھتی تھی اس بات پر خیال رکھنا واجبات سے تھا۔ گورنمنٹ کا

انتظام اور اس کی خوبی اور اسلوبی اور پائیداری ملکی اطوار اور عادات کی واقفیت اور پھر اس کی رعایت پر موقوف ہے......... بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ تھی مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں،،

یہ تھا اعلان حق اور بیباکئ تحریر کہ تمام خرابیوں اور فسادات کی ذمہ داری خود حکومت پر عائد کر دی اس لیے کہ اس نے ہندوستانیوں کو حکومت میں شامل نہیں کیا۔ اگر سیلف گورنمنٹ اور حکومت خود اختیاری کا حاصل کرنا آزادی کی جنگ ہے تو بلاشبہ اس مطالبہ کی بنا پر اور ایسے وقت میں جب کہ ملک صحیح معنوں میں غلام ہوئے ابھی دو سال بھی نہ گذرے تھے سرسید سب سے بڑے جنگ آزادی کے رہنما قرار دیئے جانے چاہئیں لیکن پروپیگنڈہ اس کے برخلاف جاری ہے اور سرسید پر الزامِ وفاداری ہے یہ کیسا تاریخ کا المیہ ہے اور کیوں ایسا کیا جارہا ہے کیا مقاصد پوشیدہ ہیں اس الزام کے پیچھے ؟

،، بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گذرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتہً بہہ پڑے،،

آگے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے گورنمنٹ کو اور رعایا دونوں کو ان قوانین کی افادیت بڑھانے میں حصہ دینے کا موقع نہیں مل سکا، حکومت کے اچھے کام کو بھی رعایا غلط سمجھتی تھی اور حکومت کو صحیح طور سے فلاحی کاموں کے کرنے کے قوانین وضع کرنے میں بغیر ہندوستانیوں کی شرکت کے دشواری پیش ہوئی۔

،، رعایا کو اصلی منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ حکومت کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی

ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے ،،

تصورِ پارلیمنٹ

سرسید نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی کہ کس طریقے پر رعایا کو لجیلیٹو کونسل (مجلس واضعانِ قوانین) میں شریک ہونے کا اختیار دیا جاتا انہوں نے کہا کہ یہ موقع اس بحث کا نہیں ہے کہ انتخاب کے طریقوں پر گفتگو کی جائے۔ یعنی انتخاب یا الیکشن کا تصور سرسید کے ذہن میں ۱۸۵۸ء میں بھی تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کا انتخاب کونسلوں میں ہو۔

،، ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا لجیسلیٹو کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا اور کیا قاعدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ (برطانوی) کے لجیسلیٹو کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا۔
..... اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لئے بہت اچھی اور ضرور تھی اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اس کو دیکھنا چاہیئے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہیئے ،،

سرسید نے صاف الفاظ میں یہ مطالبہ رکھا کہ ہندوستان کی عوام کو لجیسلیٹو کونسل میں نمائندگی دی جائے اسی طرح جس طرح برطانوی عوام کو وہاں کی پارلیمنٹ میں نمائندگی ہے۔ اس زمانہ میں بھی سرسید کا ذہن اس قدر صاف انداز میں سوچ رہا تھا کہ عوام کی نمائندگی کے بغیر اور ان کے انتخاب کے بغیر حکومت ملک میں چل نہیں سکتی اور سارے فسادات کا سبب یہی کمی ہے باقی سب باتیں اس کی شاخیں ہیں لیکن حکومت نے سرسید کی اس تجویز کو محض اتنا مانا کہ عوام کی نمائندگی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے راجہ اور جاگیرداروں کو لجیسلیٹو کونسل میں تعلقات کی بنیاد پر نامزد کرنا شروع کر دیا بلا شبہ یہ بھی ایک بڑی رعایت حکومت نے ہندوستانیوں کو دی۔

اس کے آگے سرسید نے پانچ اصول سرکشی کے وقوع ہونے کے بتائے ہیں یہ پانچوں اصول حکومت کی بے احتیاطیوں اور ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے کی طرف نشاندہی کرتے ہیں

۱۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویزِ گورنمنٹ کا۔

۲۔ جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

۳۔ ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

۴۔ ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ کے لیے واجب اور لازم تھا۔

۵۔ بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔

عیسائی بنانے کی مہم غلط تھی

ان پانچوں اسباب کی تفصیل سرسید نے بتائی ہے اور فرداً فرداً ہر شق پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

عوامی غلط فہمیوں کا بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پہلا بڑا سبب اس سرکشی کا یہ تھا کہ عوام میں تمام طبقوں کے لوگ عاقل، اعلیٰ قابل و جاہل غرض ہر طرح کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت کا ارادہ ہندوستانیوں کے مذاہب و رسم و رواج میں تبدیلی کرنے کا ہے اور یہ سمجھتے تھے کہ حکومت علانیہ جبر سے مذہب تبدیل نہیں کرائے گی بلکہ جس قدر عوام ان کے قبضہ میں آتے چلے جائیں گے لالچ دے کر اپنے دین میں شامل کرتے جائیں گے۔

> "سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں گورنمنٹ اور حکام انگریزی ہر طرح ان کے مددگار و معاون ہیں... اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی میں پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا غرضیکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا

مذہب قائم رہے گا،، لہ

پادری صاحبان کی بہت سی بے جا کارروائیوں کا ذکر سرسید نے کیا ہے کہ وہ دوسرے مذہب کے پیشواؤں کو کھلے عام برا کہتے تھے اور زبردستی لوگوں کو وعظ سننے پر مجبور کرتے تھے اس سلسلہ میں مشنری اسکولوں کی کارروائیوں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے کہ وہاں جو بچے عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے ان کو زیادہ نمبر دیئے جاتے تھے۔ ان باتوں سے ہی عوام کا دل گورنمنٹ کی طرف سے پھر گیا تھا۔ اسی طرح لڑکیوں کے کالج شروع کرنے سے بھی عوام میں مخالف رجحان پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نوکریوں میں بھی پادریوں کی سفارش اور سرٹیفکٹ پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔

"چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکٹ پر جن کو ابھی تک لوگ کالا پادری سمجھتے تھے منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے،، ٹہ

یہ سب باتیں جمع ہوتی ہی جا رہی تھیں کہ ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ کا دارالسلطنت کلکتہ سے ایک خط شایع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک حکومت ہو گئی ہے لہٰذا مذہب بھی سب کا ایک ہونا چاہیئے اس لیے یہ اپیل کی گئی کہ سب لوگ عیسائی ہو جائیں۔

"میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو سب لوگ

لہ اسباب بغاوت ہند صفحہ ۸۱۶) ٹہ (۸۱۹ صفحہ)

بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں...... اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی،،۳

سرسید نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو ان تمام باتوں کا بہت دکھ تھا۔ کیونکہ ہندو اپنے مذہب میں مداخلت پر زیادہ برا نہیں مانتے بمقابلہ مسلمانوں کے کہ مسلمان اپنے عقائد اور احکام الٰہی کو ماننے ہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔

دوسرا سبب سرسید نے یہ بتایا کہ ایسے قوانین اور ایسا طریقۂ حکومت جاری ہوا جو ہندوستانیوں کی عادات کے خلاف تھا کئی ملکی قوانین سے ہندوستانیوں کے مذہب میں مداخلت ہوئی مثلاً ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء اور ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء۔

،، لیجسلیٹو کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء عام مذہبی قواعد پر خلل انداز تھا پھر اس ایکٹ سے ایک یہ بدگمانی لوگوں کو تھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے،،۴

ایکٹ ۱۵ کے تحت حکومت نے ہندو بیواؤں کو کچھ حقوق دیئے تھے اس پر بہت سے ہندو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے مذہب میں دخل اندازی ہے اس کے علاوہ زمین کی ضبطی کا قانون جو کہ ۱۸۱۹ء سے لاگو تھا اس سے عوام میں بہت شکایت تھی اس کے علاوہ حکومت نے لگان وصول کرنے میں جو سختیاں کی تھیں اور جس طرح اس کو وصول کیا جاتا تھا سرسید نے اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور خاص سبب سرکشی کا بتایا ہے:

،، اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہو گیا زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہو گئے زراعت کا سامان بہت کم ہو گیا... ادائے مال گزاری کے لیے وہ قرض دار ہوئے سود قرضہ

---

۳ صفحہ ۸۲۰، ۴ (صفحہ ۸۲۱)

زیادہ ہونے لگا بہت سے زمیندار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہو گئے، ؎

اس کے ساتھ ساتھ اودھ میں تعلق داری کا خاتمہ، اسٹامپ خرچ کا جاری ہونا کہ ہندوستانی اس خرچ سے واقف نہ تھے دیوانی، عدالتوں کا ناقص انتظام بہت سے اسباب بغاوت بڑھانے میں معاون ہوئے۔

ہندوستانیوں کو مفلس بنادیا گیا تیسرا سبب گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات واطوار وعادات اور ان پر جو مشکلیں ومصیبتیں پڑتی تھیں سے ناواقف رہنا بتایا ہے۔ اور کیونکہ حکومت کو رعایا کا حال معلوم ہوتا جب کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کسی طرح کا میل جول نہ تھا اور جو کچھ اطلاعات حکومت کو رعایا کے متعلق پہنچتی تھیں وہ حکام کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں جو کہ خود عوام کی مشکلات سے ناواقف تھے کیونکہ ان کے رعب اور دبدبہ کے آگے کوئی سچی بات ان کے سامنے نہ کہہ سکتا تھا اس طرح رعایا اندر ہی اندر گھٹتی رہی اور اس کی فلاح کی کوئی تجویز نہ ہوئی:

"جو نیا قانون گورنمنٹ کی طرف سے جاری ہوا اس سے جو مضرت رعایا کے مال اور رفاہ وفلاح کو پہنچی اس کا رفع کرنے والا اس کی خبر کرنے والا کوئی نہ تھا اس قسم کے امور میں کوئی غم خوار رعایا کا نہ تھا بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو کر چپ رہتے تھے،، ؎

مفلسی عوام میں دم بدم بڑھتی جاتی تھی خاص مسلمان اس سے بہت زیادہ متاثر تھے کہ ان کو نوکریاں دیا جانا تقریباً موقوف کر دیا گیا تھا ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ تر روزگار پیشہ تھے لہٰذا ان پر نوکریوں کے دروازے بند ہونے سے بہت اثر پڑا:

"مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں اگلے بادشاہوں کے ساتھ یہ

؎ (صفحہ ۸۲۵) ؎ (۸۲۹ صفحہ)

وسیلہ روزگار کے لیے ہندوستان میں آئے اُس لیے سب کے سب روزگار
پیشہ تھے اور کمی روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت تھی" ۱؎

اسی مفلسی کے سبب اکثر لوگ باغی فوج میں قلیل ترین آمدنی پر بھی نوکر ہو گئے بعض بعض کو یومیہ ایک آنہ تک ملتا تھا مگر جس طرح بھوکا اناج پر گرتا ہے اسی طرح رعایا نے ان نوکریوں کو قبول کیا۔ اس کے علاوہ سرسید نے بحالی جاگیروں کا نہ دیا جانا بلکہ ان کی ضبطی اور کمپنی کے عمل کے وجہ سے ملک میں عام مفلسی پھیل گئی تھی۔

چوتھی وجہ سرسید نے یہ بتائی کہ جو کام حکومت کو کرنے چاہیئے تھے وہ اس نے نہ کیے۔ سرسید نے حکومت کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور ملک میں امن قائم کرنے کی نئی راہ سمجھائی بلا شبہہ یہ کام ایک عظیم انسان ہی کر سکتا تھا۔ انھوں نے ان کاموں کو گناتے ہوئے جو کہ حکومت نے نہیں کیے اور کرنے چاہیے تھے لکھا کہ حکومت نے عوام اور حکام اور انگریز اور ہندوستانیوں میں راہ و رسم پیدا کرنے کی کوئی ترکیب نہ کی رعایا اور حکومت کا اتحاد اور میل اور محبت ہی وہ اہم چیز ہے جس کے سبب حکمرانی آسان ہوتی ہے انگریزوں کو حضرت مسیح کا قول یاد دلاتے ہوئے لکھا کہ :

"کیا مسیح مقدس کا یہ قول دل کو تسلی دینے والا نہیں ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ویسا ہی تم بھی ان سے کرو مراد مسیح مقدس کی اس نصیحت سے محبت ہے غرض کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محبت اور اتحاد بہت عمدہ چیز ہے اور بہت اچھے اچھے نتیجے دیتی ہے اور بہت سی برائیوں کو روکتی ہے آج تک ہماری گورنمنٹ نے یہ محبت ہندوستان کی رعایا کے ساتھ پیدا نہیں کی"۔ ۲؎

بلکہ اس کے برعکس حکومت نے عوام کو اپنے سے اتنی دور رکھا جیسے آگ اور سوکھی گھاس۔ حکومت اور ہندوستانی دو پتھر کے ٹکڑے ہیں ایک کالا اور ایک سفید ہندوستان کا مذہب

۱؎ (صفحہ ۸۳۰) ۲؎ (صفحہ ۸۲۳)

زبان اور کلچر سب انگریزوں سے الگ تھا پھر کس وجہ سے انگریز ہندوستانیوں سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے؟ یعنی سرسید کے خیال میں وفاداری کی کوئی وجہ موجود نہ تھی:

"اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستانیوں کا خون ایک نہ تھا مذہب ایک نہ تھا رسم و رواج ایک نہ تھا دلی رضامندی رعایا کو نہ تھی آپس میں محبت اور اتحاد نہ تھا پھر کس بات پر ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے؟" ؎

ہندوستانی ذلیل کئے گئے

انگریزوں سے پہلے مسلمان اس ملک میں حکمراں بن کر آئے مگر انہوں نے آتے ہی ہندوستانیوں سے میل محبت پیدا کر لی اس طرح آرام سے کاروبار حکومت چلتا رہا محکوم و رعایا دونوں خوش مگر انگریزوں نے ... سال کے عرصہ میں بھی ایسا نہ کیا بلکہ الٹا ہندوستانیوں کو ذلیل و خوار کیا اور ان کو ادنی سمجھا کوئی عزت ہندوستانیوں کی باقی نہ بچی مفلسی اور بے عزتی دو چیزیں ہندوستانیوں کو انگریزوں سے ملیں:

"بلا شبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستانیوں میں کوئی جنٹل مین نہیں" ؎

سرسید نے حکام کی بد تمیزی اور رعونت کا نقشہ بہت دلسوزی سے کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ دوسری طرح کے افسران بھی تھے مگر بہت قلیل اکثر حکام ہندوستانیوں کو مثل جانور کے سمجھتے تھے اور کوئی عزت ان کی نہ کرتے تھے بلکہ الٹا بے عزت کرنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے ان کی بد مزاجی اور بے پروائی کی حکومت نے مطلق خبر نہ لی۔

؎ (صفحہ ۸۳) ؎ ۱۳۵۱ صفحہ

"کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم کہ بڑے سے بڑے ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھے؟ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہلکار کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے" [1]

سرسید نے لکھا کہ کچھ ایسے حاکم بھی تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کی نصیحت یاد رکھی جو ایک بار انہوں نے مچھلی کا شکار کرنے والوں کو کی تھی کہ آؤ میرے پیچھے میں تمہیں آدمیوں کا شکار کرنے والا بناؤں گا اور ایسے ہی حاکموں نے حکومت کا رعب بھی رکھا ہے اور غرور بھی نہیں کیا۔ یہ تمام بے عزتیاں اور ذلتیں گو کہ تمام ہندوستانیوں کو بری لگتی تھیں مگر مسلمان چونکہ ایک عرصہ تک اس ملک میں حکمراں رہے تھے ان کو اپنی عزت زیادہ پیاری تھی اور بسبب اپنی غیرت اور فطرت کے عزت کے آگے کسی چیز کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

"یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گزرتی تھیں مگر اس کا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی باعزت چلے آتے تھے ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے دل میں روپیہ کا لالچ بہت کم ہے کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے بہت تجربہ ہوا ہوگا کہ اور قومیں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھا لیتی ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی ادنیٰ بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا ہے" [2]

یہی سبب تھا کہ مسلمان زیادہ رنج میں تھے اور اسی وجہ سے زیادہ جوش سے شورش میں حصہ لیا اور جتنا حصہ لیا اس سے کہیں بہت زیادہ حکومت کو بسبب اپنے تعصب کے دکھائی دیا اور اسی وجہ سے حکام نے انتقام بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ لیا۔ سرسید نے اس کی

---

[1] صفحہ ۸۳۶ [2] صفحہ ۸۳۷

وجہ پر غور کرنے کی دعوت دی کہ دیکھا جائے کہ اس شورش اتنی زیادہ دکھائی دی جتنی کہ تھی اس کا سبب انہوں نے انگریزوں کا تعصب اور مخالفین کی خود غرضانہ باتوں کو قرار دیا:

"جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی دیے اس کا سبب صرف یہی خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ دلی کی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا اور درحقیقت مسلمان اسی قدر مفسد ہوئے تھے جیسا کہ نظر پڑے ہیں حکام کا مزاج دفعتاً ان باتوں سے جو ظاہر میں مسلمانوں سے ہوئیں ناراض ہو گیا ان کے مخالفوں کی بڑی گنجائش ہو گئی. خود غرضانہ باتیں پیش کرنے کو تھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا ادھر حکام کو زیادہ ناراضی ہوئی ادھر مسلمانوں کو زیادہ تر خوف و مایوسی ہوئی اور اپنی تدبیر سے جتنے تھے اس سے زیادہ مفسد دکھائی دیئے" [1]

مگر سرسید نے یہ بھی حکومت کو یاد دلایا کہ مسلمانوں نے ہی زیادہ تر اپنی جان پر کھیل کر انگریزوں کی جانیں بچائیں.

پانچویں وجہ سرسید نے اس ہنگامے کی فوج کی بدانتظامی کو قرار دیا. خاص بدانتظامی سرسید کی نظر میں یہ تھی کہ فوج میں مخلوط پلٹنیں قائم تھیں اگر جدا جدا قوموں کی جدا جدا فوجیں ہوتیں تو سرکوبی کرنے میں آسانی ہوتی بلکہ یہ سرکشی ہی پیش نہ آتی اس صورت میں مسلمانوں کو شاید کارتوس کاٹنے میں بھی اعتراض نہ ہوتا.

"یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا مگر بہ سبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بہ سبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد وارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا اسی سبب سے ہندو و مسلمان کی

---

[1] صفحہ ۱۴۱، ۸۴

تمیز نہ تھی دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں۔۔۔۔۔اگر انہیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور دوسری پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس کاٹنے میں کچھ عذر نہ ہوتا،،

اس کے آگے لکھا کہ میرٹھ میں فوجیوں کو غدر سے پہلے سے سخت سزائیں دی گئیں تھیں اس وجہ سے فوج میں سرکشی تھی اور میرٹھ کی فوج میں حکومت کا اعتبار جاتا رہا تھا سب سے آخر میں سرسید نے پنجاب میں سرکشی نہ ہونے کے اسباب گنائے ہیں اور کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

اصلاحی کاموں کا آغاز: سائنٹفک سوسائٹی

مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اور ان کی انگریزی علوم اور سائنس سے وحشت دور کرنے کے لیے سرسید نے اپنے قیام غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یورپ کے بہترین علوم کا اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان انگریزی زبان سے نفرت کرتے ہیں اگر وہی علوم جو انگریزی میں ہیں ان کا ترجمہ کر کے اردو میں پڑھائے جائیں تو شاید مسلمانوں کو اعتراض نہ ہو گا۔

"مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا دوسری قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے جو اس وقت تک مسلمانوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی"[1]

مسلمان انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے اور ہندو محض نوکریوں کے حصول کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے دونوں کے دل میں انگریزی علوم کا نقش جمانے کے لیے ضروری تھا کہ کچھ علمی و تاریخی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرا کے اردو میں شائع کی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی افادیت کا ان کو اندازہ ہو سکے اور انگریزوں و ہندوستانیوں کی بیگانگی میں کمی آئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شانہ بشانہ مل کر کام کر سکیں لہٰذا سرسید نے ایک مضمون سے،

---

[1] (حیات جاوید صفحہ ۱۲۲)

بعنوان "التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہلِ ہند" چھاپ کر شائع کیا جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو مفید سائنس اور انگریزی لٹریچر کا ترجمہ کر کے اردو میں چھاپے۔ اس کے نتیجہ میں ۱۸۶۳ میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی سرسید اس کے آنریری سکریٹری قرار پائے وزیر ہند سوسائٹی کے پیٹرن اور گورنر صوبۂ شمال و مغرب اور گورنر صوبۂ پنجاب وائس پیٹرن۔

تمام شمالی ہند میں یہ سوسائٹی اپنی طرز کی پہلی تنظیم تھی اور اس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ہی بہت سی سوسائٹیاں اور سبھائیں وجود میں آگئیں اس کے علاوہ چند برس کے قلیل عرصہ میں ہی بہت سی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر چھپ گئیں علیگڑھ میں ایک بہت عمدہ عمارت سوسائٹی کے نام سے بنوائی گئی۔ سوسائٹی کو چلانے کے لیے سرسید نے خود بہت زیادہ خرچ کیا جو ہمیشہ ان کا دستور رہا جب کبھی کسی کام کے لیے چندہ مانگتے سب سے پہلے خود اس میں اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ اپنا ذاتی قیمتی پریس تک سوسائٹی کے حوالے کر دیا سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں کو قانون پر لیکچر دینا شروع کیا تاکہ جو فیس ملے وہ سوسائٹی کے کام آئے۔ غرض کہ سوسائٹی کی تمام کوششیں سرسید کی جانفشانی کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اس سوسائٹی نے مغربی علوم اور مفید لٹریچر سے ملّت اسلامیہ کو روشناس کرانے کی تاریخی خدمت انجام دی جس کے بغیر ہندوستانی مسلمان کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام دینے سے قاصر رہتے اور مغربی علوم کی وسیع دنیا سے یکسر ناواقف رہتے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں گزٹ نے بہت اہم کردار ادا کیا اگر یہ کہا جائے کہ یہ گزٹ ہی تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو پرانی بوسیدہ دنیا کے تعصبات سے نکال کر نئی روشنی میں لا کھڑا کیا اور نئی دنیا کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا تو شاید یہ حقیقت سے زیادہ دور نہ ہو۔ گزٹ کا اجرا سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے سرسید نے ۱۸۶۶ میں کیا۔ شروع میں یہ ہفتہ وار اخبار تھا بعد میں ہفتہ میں دو بار چھپنے لگا اس اخبار کا ایک کالم انگریزی میں اور دوسرا کالم اردو میں ہوتا تھا۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات

معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت و مذاق پیدا کرنا تھا۔

یہ اخبار مدرسۃ العلوم تحریک کا خاص آرگن تھا اس سلسلے میں جاری تمام کاروائیوں کا ذکر گزٹ میں تفصیل سے ملتا ہے اس کے ساتھ ساتھ روزمرہ پیش آنے والے واقعات اہم تقاریر اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ کانگریس کے قیام تک یہ گزٹ برابر تمام ہندوستانیوں کے اندر سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کی جان کاری پیدا کرنے کا خاص ذریعہ تھا۔ لیکن قیام کانگریس کے بعد خاص مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنے کی اہم خدمت گزٹ نے انجام دی۔ ۱۸۸۵ء کے بعد گزٹ سرسید اور ان کے ہمنواؤں کا سیاسی آرگن بن کر ابھرا جس نے ہندوستان کی سیاست پر دوررس نتائج مرتب کئے۔ کانگریس کے مطالبات حکومت اور مسلمانوں پر پوری طرح واضح کرنے میں گزٹ نے اہم رول ادا کیا کہ ان مطالبات کے مانے جانے پر حکمرانوں کو مسلمانوں کو اور خود ہندوؤں کو کیا کیا مشکلات پیش آسکتی تھیں اس کا واضح انداز میں بیان کرنا گزٹ کا خاص مشن تھا اس کے علاوہ سرسید کے اسلامی انجمنوں کے نام مراسلے کے جواب میں (جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان پورے ملک میں جلسے منعقد کریں اور کانگریس کے مطالبات سے اپنی بیزاری کا اظہار کریں) منعقدہ جلسوں کی کاروائیاں بہت جلی الفاظ میں سرسید کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوتی تھیں ان جلسوں کی کاروائیوں کی اشاعت سے گزٹ کے ۱۸۸۸ء کے بعد کے شمارے بھرے پڑے ہیں۔ انڈین پٹیریاٹک ایسوسی ایشن جو بمقابلہ کانگریس کے سرسید نے قائم کی تھی اور خود اس کے آنریری سکریٹری قرار پائے تھے کی مہم بھی گزٹ کے ہی ذریعہ وقوع پذیر ہوئی اس ایسوسی ایشن کے ختم ہونے کے بعد ۱۸۹۳ء میں سرسید کی محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے آرگن کی حیثیت سے گزٹ نے خدمت انجام دی۔ درحقیقت کانگریس کے بن جانے کے بعد گزٹ کے اکثر شماروں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سرسید کو سب سے زیادہ فکر مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی تھی جو کانگریس کے قیام کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ سرسید کے ان احساسات کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ گزٹ ہی تھا۔ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی پہلی میٹنگ جو سرسید کے گھر پر انہیں کی صدارت میں ہوئی اس کی تفصیل گزٹ نے بہت جلی الفاظ میں شائع کی۔ سرسید کے انتقال کے بعد گزٹ بند ہو کر جب دوبارہ محسن الملک کی ادارت میں شائع ہونا

شروع ہوا تو ایک بار پھر سرسید کی تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے محسن الملک نے مسلمانوں کو اپنا پیغام گزٹ ہی کے ذریعہ سنایا کہ اب سرسید نہیں رہے اس وجہ سے اب زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا ایک سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہئے۔ ۱۹۰۱ کے بعد کے گزٹ میں محسن الملک، وقار الملک اور دیگر معززین قوم کی تحریروں سے مسلمانوں کے سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کا احساس قوم میں پیدا کرنے میں گزٹ کا بہت اہم رول رہا۔ ۱۹۰۶ میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد گزٹ نے مسلمانوں کی اس تاریخی جماعت کو کامیاب بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا کیونکہ محسن الملک لیگ کے عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ گزٹ کے ایڈیٹر بھی تھے لہٰذا لامحالہ گزٹ نے اس جماعت کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں میں مقبول عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انگلستان کا سفر

قوم کی حالت کیسے درست ہو

جس زمانے میں سرسید نے انگلستان کا سفر اختیار کیا مسلمان عام طور سے اور دینی علماء خاص طور سے انگریزوں سے بے پناہ نفرت کرتے تھے اور کچھ تو ان کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اس تعصب اور نفرت نے انگریزوں کا تو کچھ نہ بگاڑا بلکہ خود مسلمان ہی بہت سی نئی حقیقتوں اور علوم سے ناواقف رہے جس کا سراسر نقصان خود مسلم قوم کو پہنچا۔ ایک بزرگ کا قول تھا کہ:

"کتا اگرچہ میرے مذہب میں نجس ہے مگر وہ انگریز کی طرف منہ کر کے بھونکے تو میں اس کا منہ چوم لوں"[1]

عطاء اللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے کہ:

"اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لیے سوروں سے اتحاد کر لوں"[2]

اور ایسے بہت سے بزرگ پائے جاتے تھے جو انگریز کو کہیں راستے میں دیکھ لیتے تو آنکھیں بند کر لیتے تھے یا کسی انگریز سے اگر ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو جب تک رگڑ رگڑ کر دھو نہ لیتے اس وقت تک نجس خیال کرتے تھے۔ اس انتہا پسندانہ رویہ کی بہت ٹھوس وجوہات بھی موجود تھیں مثلاً یہ کہ مسلمانوں سے حکومت کا غصب کرنا اور انہیں کو ہر طرح سے ذلیل و خوار کرنا یہ باتیں علماء کو زیادہ ناگوار تھیں مگر غصہ اکثر غلط راہ پر ڈال دیتا ہے اور بجائے اس کے کہ عزت حاصل ہو اور بے عزتی کی زندگی ہاتھ آتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ معزز بزرگ اور علمائے کرام ٹھنڈے

---

[1] انور الحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان صفحہ ۵۱) [2] (ایضاً صفحہ ۵۱)

دل سے حالات خراب ہونے کی وجوہات پر غور کرتے اور اصلی سبب بربادی کے تلاش کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے مگر ہوا اس کا بالکل الٹا بجائے مرض کی تشخیص اور صحیح علاج کے مرض کی ذمہ داری انگریزوں پر ڈال کر اپنے طور سے علماء نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی اور اپنے کو مطمئن کر لیا نتیجتاً مرض اندر ہی اندر بڑھتا رہا آج بھی ہمیں بجائے غصہ کرنے کے ٹھنڈے دل سے اپنے موجودہ مسائل کی وجوہات پر غور کرنا چاہیئے نہ کہ صرف دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنے کو مطمئن کریں۔

سرسیدؒ نے غدر کے بعد جب نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو:

"اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائے پوری قوم کیا دنیا کے باتوں میں کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں تو درکنار خود اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں وہ پڑی تھی"[1]

معاشی بدحالی اور اخلاقی تنزل کا چولی دامن کا ساتھ ہے معاشی طور پر تباہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی بہت پست ہو چکی تھی بقول حالیؔ

تغلب میں بدنیتی میں دغا میں — نمود اور بناوٹ فریب اور ریا میں
سعایت میں بہتان میں افترا میں — کسی بزم بیگانہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے — بڑھے پھر کیوں نہ شانِ اسلام ہم سے

غریبی ایمان کی سب سے بڑی دشمن ہے انسان ہر طرح کا جرم کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سرسید کے سامنے جو قوم کی حالت تھی وہ حالیؔ کے اس قطعہ سے کافی نمایاں ہو جاتی ہے۔

فلاکت جسے کہیئے ام الجرائم — نہیں رہتے ایمان پر دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم — معلیٰ ہیں دل جمع جس سے نہ صائم

وہ یوں اہلِ اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

بدترین دورِ غلامی، اخلاقی و معاشی پسماندگی سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے سرسید نے

---

[1] (مضامین تہذیب الاخلاق جلد دوم صفحہ ۵۰)

دو باتوں کو ان کی آئندہ بہبودی کے لیے انتہائی ضروری سمجھا اوّل یہ کہ مسلمانوں میں مغربی علوم جاری کیے جائیں اور انگریزوں سے زمانہ سے چلی آرہی نفرت اور بغض وعناد کا خاتمہ کر کے مسلمانوں اور انگریزوں میں قریبی میل جول پیدا کیا جائے۔ ان دونوں کاموں کو کرنے کے لیے سرسید نے انگلینڈ جانے کو ضروری خیال کیا تاکہ وہ خود وہاں جاری طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کر سکیں اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے لیے یہاں جاری کریں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم کام جو ان کے عشقِ رسولؐ اور حمیتِ اسلامی کی غمازی کرتا ہے۔ ایک انگریز آفیسر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جواب دینا تھا جس میں مصنف نے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں اور سیرتِ نبیؐ کو توڑ موڑ کر پیش کیا تھا اس کتاب کا جواب دینے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کی لائبریری میں مل سکتی تھیں۔

اس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا مگر سرسید نے اپنا تمام مال واسباب حتیٰ کہ کوٹھی تک رہن رکھ کر قرض لے کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

"جب سید احمد لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا تھا انہوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں ذکر کیا تھا کہ میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول وطرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔" [1]

ہماری قوم ایسی کیوں نہیں

سید اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود اور ایک نوکر تھا۔ راستہ میں ان کی ملاقات مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگوں سے ہوئی ہر جگہ انہیں اپنی قوم اور ملک یاد آیا۔ وہ جہاں بھی گئے قوم کا غم ان کے ساتھ گیا اور اسی غرض سے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔

---

[1] (بحوالہ حیات جاوید ۱۴۳ ص)

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے جب کبھی عمدہ پھول دیکھے جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت آدمی کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔"

ان کے اصل مقاصد میں ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا چنانچہ انہوں نے اس غرض سے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کو خود جاکر دیکھا اور بڑی چھوٹی تمام چیزیں جو یونیورسٹی سے تعلق رکھتی تھیں اپنے ذہن نشین کرلیں یورپ کا طرزِ معاشرت وہاں کی تہذیب و شائستگی وہاں کی صنعت و حرفت ہر چیز پر نظر کی۔ وہاں عمومی علمی شوق و جستجو کے جذبے کو دیکھ کر سرسید پر بڑا اثر ہوا انگلستان کی ترقی نے ان کو اور زیادہ فکر مند بنا دیا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ آج یہ تمام باتیں عام سی نظر آتی ہیں کیونکہ ہماری یہ نسل اپنی آنکھوں سے ہر طرح کی علمی و سائنسی ترقی دیکھ رہی ہے جگہ جگہ یونیورسٹیاں قائم ہیں اور تعلیم عام ہو چکی ہے مگر اس زمانے میں جب کہ جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لوگ جہالت کو ہی علم سمجھتے تھے یورپ جانا ایک معجزانہ واقعہ تھا سرسید کا انگلستان سے ترقی کا طریقہ بذات خود دیکھ کر آنا بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے سرسید کا وہاں جانا سیر تفریح کی غرض سے نہ تھا بلکہ اپنی قوم کی ترقی کی راہیں تلاش کرنے کے لیے تھا کہ بقول حالی:

"سید احمد خاں انگلستان گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوامِ روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انہیں کے گھروں میں انہیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ دیکھا واپس آکر اپنی قوم میں پھیلایا لوگ ولایت جاکر تماشہ گاہ تھیٹر پارک میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامئ دینِ اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطباتِ احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا

اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا اس شخص کا جانا قوم کے واسطے تھا رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے تھا۔“ ؎۱

انگریز قوم کی ترقی کو دیکھ کر انہیں اپنی قوم کی تنزلی کا اور بھی شدید احساس ہوا ایک مکتوب میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

”ہماری قسمت میں جلنا لکھا ہے یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک و قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہموطنوں کو ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔“ ؎۲

❊

؎۱ (حیات جاوید صفحہ ۱۵۹) ؎۲ (بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۱۵۰)

انگلستان کی حالت بھی خراب رہی

قیام انگلستان کے دوران انہیں ایک اہم انکشاف سے دوچار ہونا پڑا کہ جو حالت آج ہندوستان کی ہے وہی حالت کبھی ولایت کی بھی رہ چکی ہے اور ان حالات کو سدھارنے کے لیے لندن کے عظیم مصلحین ایڈیسن اور اسٹیل نے رسائل ٹیٹلر و اسپکٹیٹر جاری کیے تھے تاکہ

وہ انسان کی زندگی جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار ہوتی ہے اسے بے عیب کریں اور مکاری اور جھوٹی شیخی کو مٹا دیں اور بناوٹی پوشاک اتار دیں اور اپنی قوم کی پوشاک اور گفتگو اور برتاؤ میں عام سادہ پن پیدا کریں۔"

سرسیّد لکھتے ہیں کہ "ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق و عادات اور دینداری کو نہایت فائدہ پہنچا اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا جس زمانے میں پہلے پہل ٹیٹلر نکلا ہے انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بداخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضع دار لوگ کیا مرد کیا عورت تحصیل علم سے نفرت کرتے تھے اور علم پڑھنے کو خود فروشی و باد فروشی کہتے تھے اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ جہالت کی شرم کسی کو نہ تھی۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا عورتیں آپس میں بدگوئی کیا کرتی تھیں خلافِ تہذیب باتیں کرنا گویا ایک بڑی وضعداری گنی جاتی تھی ... ۲ اسپکٹیٹر میں ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالونگا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤنگا تاکہ جہاں

تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور حتا وقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے لوگ پڑے ہیں سنبھل جاویں ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہونگا کیونکہ جو دل ایک دن بھی بیکار پڑا رہتا ہے اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے ریشے بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں سے نکالا جلسوں اور چائے خانوں و قہوہ خانوں تک پھیلایا اور ہر ایک دل میں بسایا'' [1]

تہذیب الاخلاق:۔ آغازِ انقلاب

مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ دورِ تاریکی میں انگلستان کی تھی کوئی اخلاقی برائی ایسی نہ تھی کہ مسلمانوں میں نہ ہو۔ ان تمام برائیوں کو دور کرنے کے لیے اور مسلمانوں میں نئی تعلیم اور سائنس کا رجحان پیدا کرنے کے لیے سرسید نے انگلینڈ سے واپسی پر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اس وقت مسلمانوں پر دو مختلف کیفیتیں طاری تھیں۔ غدر کے حادثات نے ان میں ایک طرف مذہبی جوش و خروش نہایت زوروں پر پیدا کر دیا تھا دوسری طرف ایک طبقہ مسلمانوں میں ایسا بھی تھا جو اپنی قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو انتہائی مایوسی اور افسردگی سے دیکھ رہا تھا اور ان کی امید بندھنے کی کوئی آس نظر نہ آتی تھی پہلے طبقے کے لیے تہذیب الاخلاق کے مضامین بارود میں آگ لگانے کے مترادف تھے۔ وہاں ایڈیسن اور اسٹیل نے مذہبی معاملات میں دخل دینے سے احتراز کیا تھا اور اس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا یہاں یہ حال تھا کہ جب کسی کام کو کرنے کو کہا جاتا تھا تو یہ عذر پیش کیا جاتا کہ مذہباً ممنوع ہے اور اگر کسی کام سے باز رہنے کی تاکید کی جاتی تو فوراً

---

[1] (مضامین تہذیب الاخلاق جلد دوم صفحہ ۴۴)

جواب ملتا کہ ثواب ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر سرسید کو کہنا پڑا کہ جس چیز کو تم مذہب سمجھ رہے ہو؟ مذہب نہیں ہے بلکہ تمہاری اختراعات ہیں۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ مسلمان علماء کا طبقہ انتہائی برانگیختہ ہو گیا۔ انہیں کافر مرتد ملحد زندیق اسلام کا دشمن مسلمانوں کا ہاجی قوم کا عیب جو اور کیا کیا نہ کہا گیا۔ کئی بار مایوسیوں نے گھیرا مگر ہر بار اللہ پر بھروسہ کر کے محنت اور جد و جہد شروع کی۔ انہوں نے ایک بار اپنے بارے میں لکھا کہ؛

"وہ قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو اپنا دشمن پاتا ہے شہری وحشی بتاتے ہیں دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں بھائی بند عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جاتے ہیں"

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں ؂۱

بعینہٖ یہی حالت آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مسلمانوں کی ہے۔ مسلمانوں کی ہمدردی کرنے والے لوگ سماج میں تنہا رہ جاتے ہیں اور ابن الوقت اور تن آسان لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ چلے ہیں قومی خدمت کرنے۔ قومی خدمت کا جذبہ عام خود غرضی کے ماحول میں مذاق کا موضوع بن گیا ہے۔ سیاسی اصلاح کرنے والوں کو تو خاص طور سے ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ تہذیب الاخلاق کے نکلتے ہی چاروں طرف سے مخالفت کا شور اٹھا۔ ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جو کہ سرسیدؒ کے خیالات سے اتفاق رکھتا تھا

؂۱ (مضامین تہذیب الاخلاق۔ امید کی خوشی صفحہ ۱۱۰)

مخالفتوں کی وجہ سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچا کہ جو لوگ مذہباً سرسید کی مخالفت کرنا فرض خیال کرتے تھے انہوں نے دین اسلام کی حمایت سمجھ کر دینی تعلیم کے مدارس جگہ جگہ کھولے۔

"جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرستہ العلوم کی طرف بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کراتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدارس ہندوستان میں قائم ہو گئے"۔ [1]

تہذیب الاخلاق کی تعلیم نے سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کو جگایا۔ سرسید کی تعلیم کے رد عمل میں مسلمانوں کو دینی تعلیم کا خیال اور جوش جیسا اس زمانہ میں پیدا ہوا اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا بقول سرسید:

"سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دلوں کو جگایا ہے"۔ [2]

تہذیب الاخلاق کے پیغام کی مخالفت کے سبب اس کے حامیوں میں بھی اس کی تحریک کی زیادہ حمایت کرنے کا جوش پیدا ہوا۔ لہٰذا اس پرچہ کی مخالفت اور مدافعت دونوں نے قوم کے حق میں اچھے نتائج پیدا کئے۔ اس کے ایک اچھے نتیجہ میں ندوۃ العلماء کا قیام بھی ہے حالانکہ فی زمانہ دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا ہونا ملت کے لیے فائدہ مند ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہے لیکن اس زمانہ میں جبکہ دینی تعلیم کی طرف بھی لوگوں کا خیال نہ تھا ندوۃ العلماء کا قیام دینی تعلیم کے لیے نیک کام تصور کیا گیا۔

"اگر غور سے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلماء کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا یہی کا نور جو

---

[1] (حیات جاوید صفحہ ۳۴۹) [2] (بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۳۵۰)

تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں
سے تہذیب الاخلاق کے بر خلاف نور الانوار، نور الآفاق اور امداد الآفاق
اور کیا کیا مدت دراز تک شائع ہوتے رہے۔ وہیں سے علماء کی یہ جماعت
اس غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانہ حال کی طرز تعلیم کے
سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لیے اکثر علماء اس سے بدگمان ہو گئے ہیں
اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارے پر قائم ہوئی ہے،،[1]

بہت سے علماء کو یہ شک گذرا کہ کیونکہ یہ زمانۂ حال کی طرز سے دینی تعلیم دینا چاہتے ہیں لہٰذا سرسید کے کہنے سے ہی یہ مجلس بھی قائم ہوئی ہے اس لیے وہ اس کے خلاف ہو گئے حالانکہ ان علماء کی حالت بھی بشمول علامہ شبلی نعمانی کے جو دینی تعلیم کو نئے طرز سے پڑھانا چاہتے تھے۔ بقول ایک پروفیسر کے ایسی ہے کہ

وہ جیسے کسی محفل میں آپ اپنے مخالفین کا مزاج دریافت کریں اور انہیں
یہ محسوس کرا دیا جائے کہ ان پر احسان کیا گیا ہے۔ پرانی زندگی شبلی کے
لیے صداقت ہے وہ نئے میلانات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن انہیں
پھر کسی گوشہ میں شمس تبریز کی عبا نظر آتی ہے اور وہ نئی دنیا پر عاجزانہ
طنز کے ساتھ مسکرا کر اسے پہن لیتے ہیں،،[2]

مولانا شبلی کی یہ معمولی سی ترقی پسندی اور نئے علوم کی طرف رغبت بھی علماء سے برداشت نہ ہو سکی اور آخر کار ان کو ندوہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ نتیجتاً انہوں نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین اور کالج کی بنیاد ڈالی جو کہ آج بھی الحمد للہ ترقی کی نئی منزلیں سر کر رہے ہیں۔ دینی مدارس کا نقطۂ نظر تو صاف ہے وہ نئی بصیرت کے قائل ہی نہیں قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ضمیر میں خود سقراط اور بطلیموس کا خون ہے یہ اس زمانے کے علماء کی حقیقت پسندی اور علم پسندی تھی اور یہ آج کے علماء کی تنگ نظری اور حقیقت ناشناسی ہے یہ سقراط بھی یورپ

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۳۵۰ [2] (علی گڑھ میگزین) انتخاب نمبر ۷۶-۱۹۷۵ صفحہ ۱۹۲

کے تھے اور آج کا نیا علم بھی یورپ میں پلا بڑھا۔

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں اور مسلمانوں کو عقل کا استعمال کرنے کی دعوت دی توکل قناعت اور تقدیر وغیرہ کے جو غلط معنی مسلمان سمجھتے تھے اور جس غلط فہمی نے ان کو نکما کاہل اور جمادات کی طرح بے حس وحرکت بنا دیا تھا اس سے ان کو مطلع کیا نہ صرف مطلع کیا بلکہ ہزارہا مسلمانوں کے خیالات بدل دیئے اور تدبیر و کوششوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تقدیر کا مروجہ عقیدہ آج بھی محبوب و مقبول ہے حالی نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل ۔ کہ مقسوم بن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل ۔ برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل

ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

نکموں کے ہیں یہ سب دلکش ترانے ۔ سلانے کو قسمت کے رنگین فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے ۔ نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

تہذیب الاخلاق نے چند ہی سال کے عرصہ میں بہت شہرت حاصل کر لی اس کی شہرت کی ایک وجہ اس پرچہ میں استعمال کی گئی زبان کا نیا اور سلیس انداز تھا جس کے ذریعہ ہر طرح کے مضامین اردو میں ادا کیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ اسلام کی روشن تصویر تہذیب الاخلاق نے پیش کی کہ انگریزوں تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ سرسید کے ایک انگریز دوست نے لکھا کہ:

"تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک نہیں ہے

جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا ہے،، [1]

قصہ مختصر یہ کہ سرسید نے شدید مخالفتوں کے باوجود تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ،، سوتوں کو جھنجھوڑنے ،، کا کام اس وقت تک جاری رکھا جب تک قوم میں بیداری کے آثار نہ پیدا ہو گئے۔ یہ اسی پرچہ کا کارنامہ تھا کہ مسلمان قومی ہمدردی قومی خیر خواہی قومی ترقی جیسے الفاظ سے آشنا ہوئے۔ ان میں اپنی مدد آپ کر کے ترقی کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا اور ایک ہزیمت زدہ قوم نے پھر سے عزت و وقار حاصل کرنے کے لیے نئے طریقے سے کوششیں کرنے کا حوصلہ اور راستہ پایا۔ مسلمان جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں اجتماعی قوت کا احساس پھر سے پیدا ہونے لگا جو ماضی کی پے در پے شکستوں کے سبب ان کے اندر سے ختم ہوتا جاتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ادب اور شاعری کا تنقیدی نظر سے جائزہ لینا شروع کیا اور اس کی ترقی اور افادیت بڑھانے پر کمر بستہ ہوئے۔ مذہبی امور غیر مذہبی و غیر مفید رسم و رواج میں تمیز کرنا بھی تہذیب الاخلاق نے ہی سکھایا۔

---

[1] (بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۳۵۲)

مدرستہ العلوم کا قیام

انتھک جدوجہد اور کوششوں کے بعد بالآخر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ کو علی گڑھ میں مدرستہ العلوم مسلمانانِ ہند کا افتتاح عمل میں آیا۔ یہ ایک بیج تھا جو ہندوستان کی سنگلاخ زمین میں کچھ انگریزوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود سرسید کے مبارک ہاتھوں سے بویا گیا۔ جس کی آبیاری سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے اپنے خون پسینہ سے کی۔ باد صرصر اور شدید مخالفتوں کے باوجود یہ مدرسہ ترقی کے مراحل طے کرتا گیا۔ دشمن زیادہ تھے اور دوست اور ہمنوا کم لہٰذا سرسید نے پنشن لی اور مستقل علی گڑھ میں سکونت اختیار کرلی کہ اب دورہ کر اس نازک پودھے کی حفاظت و پرورش ممکن نہ تھی۔ پورے ۲۳ سال سرسید نے مسلسل جدوجہد اور دن رات محنت کر کے یگانوں بیگانوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر قوم کے لیے ایک بے مثال ادارے کی بنیاد ڈالی اور اس کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا۔ ایک ایسی ٹیم تیار کی جو ان کی طرح بے مثال قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ یہ بلا شبہ تاریخ کا نادر کارنامہ ہے کہ سرسید اپنے انتقال کے وقت ایسے لوگوں کا ایک مجمع چھوڑ گئے جن کو سرسید کی ہی طرح ان کا مشن عزیز تھا جس کی تکمیل ان حضرات نے ہمیشہ رو کی طرح اپنا سب کچھ قربان کر کے کی۔

۱۸۷۷ میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل ہند کے ہاتھوں ہوا۔ سید محمود نے جو سپاسنامہ وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا اس میں لکھا تھا کہ یہ صرف ایک کالج کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اس کالج کو ایک مکمل یونیورسٹی مثل آکسفورڈ کے بنانا مقصود ہے۔ ۱۸۷۳ میں بھی جو اسکیم سید محمود نے

کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہند کے سامنے پیش کی تھی اس میں انھوں نے اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنا ہے مقصد نیک تھا اور کام کرنے والے مخلص لہٰذا خدا نے برکت عطا فرمائی اور ۱۹۲۰ میں یہ کالج یونیورسٹی بن گیا

چندے کی فراہمی

مدرسۃ العلوم کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام چندے کا وصول کرنا تھا۔ مسلمان اول تو پہلے ہی سے انگریزی تعلیم اور سائنس سے نفرت کرتے تھے دوسرے جس وقت مدرسہ کی تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہوا جس کے مضامین سے اکثر دینی علماء اور نتیجتاً مسلمان نفرت کرتے تھے اور مدرسہ میں چندہ دینا گناہ تصور کرتے تھے۔ اخباروں اور رسائل میں مدرسہ کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے۔ سرسید کے کفر پر فتوے شائع کئے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی محفلوں اور مسجدوں کے ممبروں پر سے لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مدرسہ اسلام میں فساد پھیلانے کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت تک مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے ناواقف تھے چہ جائیکہ لاکھوں روپے چندے کے ذریعہ جمع کرنے کا ارادہ کیا جائے جس کا پورا ہونا امر محال تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا پیسہ سیکڑوں سال تک بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ مولوی علی بخش خاں سرسید کو لکھتے ہیں:

> "جب مدرسۃ العلوم کا قائم ہونا سو دو سو برس تک نظر نہیں آتا اور ایک امید موہوم ہے اور تھوڑے سرمایے سے اگر کوئی مدرسہ قائم ہوا تو کیا نہ ہوا تو کیا پھر وقف کرنا روپیہ کا فضول ہے وہی روپیہ کسی دوسرے کار خیر میں صرف ہو سکتا ہے ..... حکایت: ایک شخص سر بازار کہہ رہا تھا کہ قیامت کے وعدہ پر لاکھ روپیہ مانگتا ہوں کوئی نہیں دیتا۔ ایک ظریف سن کر بولے کہ وعدہ نہایت قریب کا ہے اور روپیہ بھی بہت تھوڑا ہے اور زبان مبارک بھی ماشاء اللہ بہت شیریں ہے اب روپیہ مل جانے میں کیا شک ہے"[1]

---

[1] (علی گڑھ آرکائیوز: ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری اے ایم یو ۲۶۰ صفحہ)

اکثر لوگ اتنے روپیہ کا جمع ہونا ناممکنات میں سے سمجھتے تھے۔ مگر سرسید کی جانفشانی و محنت سے لاکھوں روپیہ کی عمارتیں بن کر تیار ہو گئیں اور ہزاروں روپیہ ماہوار کی آمدنی کا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ سات آٹھ لاکھ روپیہ کی مالیت کی عمارت تیار ہو گئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سال اس میں خرچ ہونے لگا۔ سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اسی میں صرف ہو گا سب سے زیادہ چندے کی وصولی کا سبب بنا۔ پھر بھی جو مشکلات اور پریشانیاں سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے برداشت کیں ان کی تفصیل ایک کہانی یا افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص صرف قومی بھلائی اور دوسروں کے لیے کس طرح اتنی تکلیفیں برداشت کر سکتا ہے اور خاص طور سے اس زمانہ میں یقین کرنا مشکل ہے جب ہر آدمی قومی بھلائی کے نام پر صرف اپنا بھلا کرنا چاہتا ہے اور ڈھونڈنے سے بھی مخلص لوگ نظر نہیں آتے۔ سرسید نے اپنے سماجی مقام و مرتبہ تک کی پرواہ نہ کی اور نمائش میں دکان لگانے سے لے کر اسٹیج پر ایکٹنگ کرنے تک ہر کام روپیہ کی فراہمی کا قوم کے لیے کیا:

> "کون ہے جو آج مجھے اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہو گا؟ وہی جس کے دل میں قوم کا درد نہیں وہی جس کا دل جھوٹی شیخی سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسانوں کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کا کام سمجھیں آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔
>
> اے رئیسو اور اے دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بری حالت ہوا کرے ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں

چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی خود لوگوں سے بھیک مانگی مگر قلیل ملی ...
بس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں"
شبلی نے یہ منظر دیکھ کر قوم سے یوں خطاب کیا.

دوستوں کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقین
کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہو گا رنگین
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی ایک زہرہ جبیں
آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے تو بے جا سمجھے
نوحہ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا
ہے یہ حسرت کا سماں جوش مسرت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشہ دیکھے

مسلمانان ہند سرسید کی عظمت کا پورا پورا اندازہ آج تک نہ لگا سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انکی عظمت قید الفاظ میں نہیں آسکتی وہ الفاظ کی بندشوں سے آزاد ہے لیکن جو لوگ ذرا بھی کوششیں ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی کر رہے ہیں بس یہی ان کا سرسید کے لیے خراج عقیدت اور احسانمندی کے جذبات کا اظہار ہے جو سرسید نے ہم پر ہماری گذری ہوئی اور آئندہ آنے والی نسلوں پر کیا۔ کفر کے فتووں سے ڈرایا گیا، نیچری دہریہ اور کیا کیا نہ کہو

۱؎ سرسید نے یہ تحقیق کیا تھا کہ دہلی کے پاس تغلق آباد میں جو گھسیارے گھاس بیچ کر اپنا پیٹ پالتے تھے وہ سب شاہان تغلق خاندان سے تعلق رکھتے تھے زمانہ کی گردش نے انکی یہ حالت بنادی تھی (بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۱۹۴)

کہا گیا حتیٰ کہ مکہ و مدینہ تک سے ان کے واجب قتل ہونے تک کے فتوے لائے گئے۔ ایک بار ان فتووں سے تنگ آکر لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"فرض کرو میں بد عقیدہ ہوں مگر اے بزرگانِ پنجاب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم نہ سمجھیں گے؟ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدا کا نام لیتے ہیں چوہڑے چمار قلی کافر بت پرست بد عقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر نہ کبھی آپ اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کو منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے کیا آپ مجھ بدبخت نامۂ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبونا اور خراب و خستہ حال میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی فکر کرو۔"[1]

کیسی بے بسی کا عالم ہوگا اور مخالفت کتنی شدید ہوگی کہ سرسید کو اپنے تئیں قلی چمار سے تشبیہ دینی پڑی وہ وقت ضرور ایسا ہی تھا باطل اور گمراہ طاقتیں پورے شباب پر تھیں مگر آج حقیقت روزِ روشن کی طرح سارے زمانے پر عیاں ہے سرسید کی ذات سے فیض یاب ہونے والے دنیا کے گوشہ گوشہ میں مل جائیں گے۔ لندن اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں اس مرتد بد عقیدہ کے فیض سے پیدا ہوئے مسلمان سائنسٹ اور ایجوکیشنٹ ملت اسلامیہ کا

---

[1] (بحوالہ ناموران علی گڑھ پہلا کارواں صفحہ ۳۰)

نام روشن کر رہے ہیں اور غلط مخالفتیں کبھی کی ختم ہو چکیں مخالفین کا نام تک لینے والا کوئی نہیں ہر گھر میں سرسید کی بے مثل قربانی کا چرچا ہے ہر محفل میں ان کے گیت گائے جاتے ہیں

سرسید ہر چندہ جمع کرنے سے پہلے اس میں اپنا حصہ ڈالتے تھے حتیٰ کہ اپنے بیٹے کی شادی میں ولیمہ تک اسی لیے نہیں کیا اور وہ پیسہ جو ولیمہ میں خرچ ہوتا کالج فنڈ میں جمع کر دیا۔ آج ہم لاکھوں روپیہ صرف اپنی شان دکھانے کے لیے بے وجہ خرچ کر دیتے ہیں۔ اور قومی کاموں میں خرچ کرنا ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ اصلی فائدہ مند خرچ وہی ہے جو ایمانداری سے صحیح طریقہ سے قومی کاموں میں خرچ کیا جائے سرسید نے کالج فنڈ کی وجہ سے ہر طرح کا خرچ بند کر دیا تھا خاندانی تقاریب نہایت سادہ طریقہ پر مناتے تھے اور بچا ہوا پیسہ قومی کاموں میں دیدیتے تھے۔ اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی خرچ ہونے والا پیسہ کالج فنڈ میں دیدیا۔

"دیکھو میں نے اپنے بیٹے سید حامد کو نہیں بلایا کسی عزیز رشتہ دار کو جو علی گڑھ میں موجود نہ تھے نہیں بلایا جو لوگ اتفاق سے یہاں موجود تھے انہیں کے شمول پر اکتفا کیا یہ بڈھا شخص داڑھی منڈا راجہ جے کشن داس کی طرف اشارہ کر کے) جن سے مجھے ایسی محبت ہے جیسی بھائی سے ہوتی ہے اس تقریب کے لیے نہیں بلایا بلکہ میری خوش قسمتی ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے یہاں موجود تھے میری قوم کے بزرگ جو کثرت سے یہاں موجود ہیں انہیں کو اپنا بھائی سمجھا انہیں کے شمول کو اپنے دل کی خوشی سمجھا اور اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبوں میں سے جہاں تک ممکن ہو تمام اخراجات کو بند کیا جاوے اور قوم کی فلاح میں روپیہ خرچ کیا جاوے"

سرسید کی یہ نصیحت کہ تقریبات کا تمام خرچ بند کر دیا جائے صرف نصیحت نہ تھی بلکہ عمل بھی کر کے دکھایا اور آج کے مسلمانوں کے لیے سونے کے حروف میں لکھنے جانے قابل نصیحت ہے اور ہم سب کی تنزلی سے نکلنے کی ایک عمدہ ترکیب ہے سرسید نے ایسا عمل پیش کر دیا کہ جو

قابل تقلید اور ترقی کیلیے ضروری ہے جدیہ ہے کہ جو دوست احباب سرسید کی دعوت کرنا چاہتے تھے ان سے دعوت کے بدلے نقد روپے لیتے تھے اور کالج فنڈ میں جمع کر دیتے تھے ایک بار حیدر آباد سے لوٹنے پر ان کے دوست احباب نے بیس بیس روپیہ جمع کر کے سرسید کو شکر گذاری کے طور پر دعوت دینا چاہی سرسید نے کہا کہ اس کا انتظام میں خود کروں گا وہ سب روپیہ ان سے لے کر اور بیس روپیہ اپنے حصہ کا ملا کر دو سو چالیس روپیے دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کو دیدیں اپنے بیٹے سید محمود کی شادی کا ولیمہ تک نہیں کیا اور وہ رقم بھی مدرسے کے چندے میں دیدی:

"بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی مگر نہ ہم جاگیر دار ہیں نہ رئیس ہیں اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانچسو روپیہ لگا سکتے تھے سو ہم نے پانچسو روپیہ مدرسے میں دیدیا"[۱]

سرسید حیدر آباد کے آخیر سفر میں نظام حیدر آباد کے مہمان تھے ان کے کچھ دوستوں نے دعوتیں کرنی چاہیں وہ تمام پیسہ بھی نقد لے کر مدرسہ کے چندہ میں جمع کر دیا اور کہا کہ یہی دعوت ہے۔ محسن الملک نے جب پارٹی کرنی چاہی تو ان سے بھی ہزار روپیہ نقد حاصل کر کے چندہ میں جمع کر دیا۔ غرض بقول حالی،

وہ اسی قسم کی بے شمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ولایت سے آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے اس عرصہ میں برابر ان کو یہی ادھیڑ بن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرستہ العلوم میں مہیا کیا جائے،،[۲]

جن لوگوں سے زیادہ قربت اور دوستی تھی سب سے پہلے چندے کی شروعات ان ہی سے

---

[۱] بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۱۹۸) [۲] حیات جاوید صفحہ ۲۰۰)

کیا کرتے تھے۔ دوست احباب تنگ آ گئے کہ سر سید تو بغیر بتائے ہوئے ہی چندہ کی رقم خود ہی لکھ لیتے ہیں ان کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ سر سید ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں:

"ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدلتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔"[1]

الغرض سر سید نے کوئی طریقہ بھی جو ممکن ہو سکتا تھا چندہ جمع کرنے کے لیے اختیار کرنے سے نہ چھوڑا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے لے کر اسٹیج پر ایکٹنگ کرنے تک۔

---

[1] (بحوالہ حیات جاوید، صفحہ ۲۰۰)

تصورِ تعلیم

طریقہ تعلیم میں تبدیلی ضروری ہے

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو بہت سے امراض نے دفعتاً گھیر رکھا ہے۔ دینی و مذہبی تعصبات، ہندوؤں کی طرح فرقہ بندی، جہالت اور ماضی پر غرور، غیر مذہبی باتوں کو اسلام سمجھنا اور طرح طرح کی خرافات میں مسلمان گرفتار تھے۔ پرانا طریقہ تعلیم مسلمانوں کو ان برائیوں سے باہر نکالنے میں ناکام رہا تھا۔ ہندوستان کے اکثر مسلمان نئے حقائق سے یکسر ناواقف اپنی پرانی بوسیدہ دنیا میں مگن تھے جہالت کے اندھیرے نے ان کی بینائی چھین لی تھی کہ آس پاس ہونے والی ترقی بھی ان کو نظر نہ آتی تھی انگریز ہزاروں میل دور سے آکر مسلمانوں کو ہٹا کر ہندوستان کے حکمراں بن گئے تھے پھر بھی مسلمان اس کی وجوہات تلاش کرنے سے منھ چھپاتا پھرتا تھا اور پرانے طریقہ تعلیم و مروجہ علوم کے سائے میں اپنے لیے سکون تلاش کرتا تھا مسلمانوں کو ہندوؤں کی ترقی بھی نظر نہیں آتی تھی انگریزوں کی شاندار فتوحات کا بھی ان پر کچھ اثر نہ تھا۔ مسلمان عظمتِ رفتہ کا گوار پرانے بوسیدہ پیرہن میں ہی مگن تھا۔ سرسید کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی حکمرانی سے بیدخلی اور مفلسی کے اسباب کا پتہ لگا کر اس کا علاج کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمان جب تک نئے علوم اور نئے فلسفہ کو نہیں اپنائیں گے یوں ہی ذلیل خوار اور محکوم رہیں گے۔ وہ حقیقت کو سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان بھی اس حقیقت کو پہچاننے میں دیر نہ لگائیں کہ وقت کم ہے اگر کچھ دن اور غافل رہے تو چاہنے پر بھی کچھ نہ کر سکیں گے:

> "اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو ان کی پرورش کرو ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو تم کچھ بھی کہو میری بات سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو

تعلیم نہ دو گے، تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت دیکھو گے اور بے چین ہو گے رو ٔگے اور کچھ نہ کر سکو گے .... ابھی وقت ہے تم سب کچھ کر سکتے ہو مگر یاد رکھو میں یہ پیشن گوئی کرتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ آوے گا کہ تم چاہو گے کہ تم اپنے بچوں کو تعلیم دو ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہو گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر ملحد نیچری میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں تم ان پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ پچھتانا نہ پڑے۔[۱]

سرسیدؒ کو سب سے زیادہ مشکلات دینی علماء کے طبقہ کی طرف سے پیش آئیں یہی طبقہ تھا جس نے سرسید پر انکی مخلصانہ کوششوں کے عوض ملحد کافر و نیچری جیسے خطابات سے نوازا سرسید نئی تعلیم اور سائنس سے مسلمانوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے کہ اسلام کی تعلیمات کا بھی یہی تقاضہ تھا مگر دینی علماء کے ایک طبقہ کو پرانے فرسودہ نظام تعلیم سے زیادہ دلچسپی تھی بمقابلہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کو خوشحال بنانے اور دوسری قوموں کے برابر لانے کے سرسید آئینِ نو کی تعلیم مسلمانوں کو دے رہے تھے اور یہ طبقہ طرزِ کہن پر اڑا ہوا تھا۔

نئے علم و ہنر کا زمانہ تھا نئے علوم اور سائنس ترقیات نے مغربی قوموں کے ہاتھوں میں وہ قوت دے دی تھی کہ دنیا ان کے لیے مسخر ہو کر رہ گئی تھی۔ سرسید مسلمانوں کو انہی علوم سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔

لی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل
راس تھا اگلوں کو جو موسم گیا کب کا نکل
کام کے ہیں اب نہ دنیا میں ہنر ان کے نہ فن
اور اب کارآمد زمانے میں ہے کس انکا نہ بل
ہیں نئی رسمیں نئے آئین نئی ہے چال ڈھال
اور نئے علم و ہنر کا ہے جدھر دیکھو عمل

---

[۱] نامورانِ علی گڑھ ص۱۲

جدید تعلیم اور علوم و فنون سے مسلمانوں کی بیزاری کا یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک جاری تھا. ان میں کسی کو یہ خیال تک نہ تھا کہ ہمسایہ قوم نے اس میدان میں کتنی عظیم سبقت حاصل کرلی ہے اور اس وجہ سے وہ اقتصادی طور سے بھی مضبوط ہو گئے تھے. سرسید بڑے دکھ کے ساتھ یہ سب دیکھ رہے تھے کہ اگر یہ سب چلتا رہا تو کچھ دنوں کے بعد مسلمان بجز چپراسی اور خانساماں کے کچھ کرنے کے قابل نہ رہ جائیں گے۔ اپنے ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں.

"بھائی مہدی! تم پائنیر اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو، وہ لکھتا ہے آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں. چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان سے نہیں ہونے کا. اور آئندہ، بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نہیں ہوگا...... دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں" ؎۱

کچھ ہی دنوں بعد سرسید نے اس تکلیف دہ صورتحال کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

"جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اسی اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند برس ہی اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیسی خانسامائی خدمت گاری کے سوا اور گھس کھدے ہونے کے علاوہ اور کسی درجہ میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمانوں کے نام سے نہ پکارا جائے گا" ؎۲

مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ پرانے طریقۂ تعلیم میں دور رس تبدیلیاں کی جائیں اور جو نظام تعلیم مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے اس کو رائج کیا جائے۔ بدقسمتی سے پرانے نظام تعلیم کو آج تک اسلامی نظام تعلیم اور اصل دین سمجھا جاتا ہے سرسید یا دوسرے لوگ اسلام اور دین کی تعلیم کے ان سے بڑے حامی تھے. جو اپنے آپ کو اس کا حامی بتاتے ہیں.

؎۱ مکتوبات سرسید ص۱۶۵ ؎۲ مجموعہ لکچرز ص۲۰۳

لیکن فرق صرف طریقۂ تعلیم کا ہے اور نئے فلسفہ کی روشنی میں اسلام کو طاقت ور بنانے کا ہے آخر پہلے متفکرینِ اسلام نے بھی تو یونانی فلسفہ کی بنیاد پر اسلام کی تشریحات کی تھیں۔ دینی مکاتب اور مدارس کے سلسلہ میں اگر کہا جائے کہ ان میں جمہوری نظامِ انتظام رائج کرو تو بہت بڑا جھگڑا کھڑا ہو جائیگا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً تمام ہی مدارس خاندانی وراثتیں بنے ہوئے ہیں۔ والد بزرگ ہیں تو اس کے بعد پسرِ محترم ہیں اس کے بعد آئندہ آنے والی نسلیں ہیں نسلاً بعد نسلاً نظامت خاندان میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ پیسہ عام مسلمانوں کا اور نظام موروثی۔ لہٰذا سرسید بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ نئے حالات میں پرانی تعلیم کسی کام کی نہیں۔

"ہندوؤں کی پرانی تعلیم ننگا پنڈت پیدا کرتی ہے تو مسلمانوں کی قدیم تعلیم فاتحہ کی روٹی کھانے والا ملاّ" [۱]

مروجّہ علوم بے فائدہ ہیں اسی خیال کے پیش نظر سرسید پرانے طریقۂ تعلیم کے خلاف ہو گئے اور مسلمانوں کے لیے سودمند طریقۂ تعلیم جاری کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ جس زمانے میں سرسید انگلستان میں تھے ان کو پتہ چلا کہ دلی میں منشی امو جان کے مکان پر ایک قدیم طرز کا عربی مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"جانِ من و جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبتے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے، اور کس طرح کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ الشاراللہ

۱۔ نقوی سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۵ ۔ ۲۔ حیات جاوید ص ۲۴۴

تعالیٰ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کھونگا اور کرونگا مگر مجھ کافر مردود گردن مروڑی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟"

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے باندھتے رہتے تھے اس رائے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک کالج یا یونیورسٹی قائم کی جائے۔ تقلید اور جہالت مسلمانوں میں عام تھی اور جو مسلمان تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم قدیم علوم تک محدود تھی جن کا بے مصرف ہونا اب پوری طرح واضح ہو چکا تھا چنانچہ سرسید یہ کہنے پر مجبور تھے۔

"جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے کیونکہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں اس لیے کہ ان سے نہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود اپنا بھلا کر سکتے ہیں جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ ایک عقلمند آدمی کا قول ہے کہ حسبِ احتیاجِ وقت لوگوں کی تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس پھر محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل وخوار اور پھر چور بدمعاش ہوتے ہیں۔"[۱]

حالی اس صورتحال کو یوں واضح کرتے ہیں۔

تنائج ہیں جو مغربی علم وفن کے — وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے — کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہیں نقش اہل یوناں کی رائیں
جو اب وحی اترے تو ایماں نہ لائیں

---

[۱] مضامین تہذیب الاخلاق صہ ۴۲۹ جلد دوم

اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے   شفا اور مجسطی کا دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پر سر دھرنے والے   فلاطون کی اقتدا کرنے والے

وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل   نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل   نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر
وہ کھو گئے اور تعلیم پاکر

مرتے دم تک سرسید کی یہ کوشش رہی کہ مسلمان اپنے دوسرے ہموطنوں کے شانہ بشانہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں لیکن مسلمان قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند تھی جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی ایسی قوم میں کسی نئے طرزِ تعلیم کا اجرا کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کٹر مذہب پرست قوم میں نئے مذہب کا رواج دینا، یہ صورتحال آج تک جاری ہے۔ دینی مدارس میں جاری طریقۂ تعلیم کو بہت سے لوگ آج تک مذہب کی حیثیت دیتے ہیں۔ لہٰذا زمانہ بدلا دنیا میں ہزاروں تغیرات آئے خود عربی زبان میں بہت تبدیلیاں ہوئیں لیکن نہ بدلا تو ان مدارس کا نصاب اور طریقۂ تعلیم کچھ حساب اور انگلش اور بنیادی سائنس کو بھی یہ مدارس نصاب میں شامل کرنے کے لیئے تیار نہیں ہیں حیرت یہ ہے کہ کچھ دن پہلے دارالعلوم دیوبند نے طبیہ کالج تک بند کر دیا یہ خیال کر کے کہ اس میں تعلیم یافتہ لڑکے مکمل مولوی نہیں بن پاتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے بڑے عالم ندوہ میں سب طلباء کو انگریزی زبان پڑھائے جانے کے خلاف تھے کہ یہ ان کے نزدیک انگریزیت کو بڑھاوا دیتی ہے اور طلبا کو مولوی نہیں بننے دیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں،

"میں ندوہ میں ہر طرح طالب علم کا انگریزی پڑھنا ضروری نہیں

سمجھتا۔ یہی ناقص انگریزیت ان کو مولوی علماً اور عملاً نہیں بننے دیتی اور اسکول کالج کی راہ دکھا کر ان کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیتی ہے یعنی ان کے نقطۂ نظر کو بدل دیتی ہے“ ۱؎

پرانے اور نئے علوم کا فرق قدیم تعلیم بالکل اپنے پرانے طریقہ پر اسی طرح رواں ہے جیسی کہ صدیوں پہلے تھی۔ قدیم علوم میں دلیل کو دلیل سے حق یا باطل ثابت کیا جاتا ہے۔ جبکہ جدید علوم میں صرف دلیلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ سائنٹفک ثبوت ہر دعوے کا ہونا چاہیے جسے اگر ہوسکے تو تجربہ کرکے ثابت کیا جاسکے۔ اسی فرق کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے ایک بار کہا تھا:

”ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ معبدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو دلائل سے اور عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوگئی ہے جو اس زمانے کے فلسفے اور حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیٰحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں“ ۲؎

سرسید نے پرانے تصورِ علم کو بالکل رد کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی ترقی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم برائے علم نہ ہو بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مقصد ہو۔ علم خالی ذہنی آسودگی کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دنیا میں کسی مفید کام میں آنے کا ذریعہ بنے ایک مرتبہ کہا:

”افسوس یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ علم کیا چیز ہے جس سے قومی ترقی ہوتی ہے آج تک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا علم کی حقیقت کو اسی قدر جانا کہ ایک شے عقلی ہے جو خیال

۱؎ عبدالماجد دریابادی؛ مکتوبات سلیمانی ص۱۴۲ ۲؎ فکر و نظر، نامورانِ علی گڑھ، پہلا کارواں ص۳۱۳

اور حافظہ میں رہتی ہے اور نفس کو اس سے بہت حظ اور روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے مگر اس زمانے میں اصل علم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے برتنے اور تجربے میں آوے اور انسان کے تمام کاموں میں مفید ہو یہی سبب ہے کہ ہمارے اگلے زمانے کے عالم فاقے مرتے تھے اور خیرات کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرتے تھے اور اس زمانے میں تربیت یافتہ ملکوں کے جو عالم ہیں وہ دولت اور حشمت سے مالا مال ہیں اور ان سے اپنی قوم کی بھلائی اور ترقی ہردم ہوتی ہے۔" ۱؎

۱؎ نامورانِ علی گڑھ ص ۴۲

سرسیدؒ کے مذہبی افکار

سرسید کے مذہبی عقاید کے سلسلہ میں طرح طرح کی بدگمانیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ سرسید شیطان اور فرشتوں کے قائل نہ تھے، جنت و دوزخ کے قائل نہ تھے احکامِ معاد پر یقین نہ رکھتے تھے، معراجِ رسولؐ کو غیر سائنسی خیال کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اور طرح طرح کے دوسرے گمراہ عقائد سرسید سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آخر ایسا پروپیگنڈہ کیوں کیا گیا؟ اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یہ خیالات عوام میں حمایتِ اسلام کے نام پر پھیلائے اور سرسید کی امیج کو دھندلا کرنے کی کوشش کی؟ اس سلسلے میں جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے سب سے پہلے مولوی علی بخش خاں بہادر سب آرڈینیٹ جج گورکھپور نے سرسید کے مذہبی خیالات کو نشانہ بنایا اور ایک رسالہ "تائید اسلام" تصنیف فرمایا۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا کہ سرسید کے تعلیمی مشن کی مخالفت میں سب سے اہم رول مولوی علی بخش خاں اور مولوی امداد علی کانپوری نے ادا کیا۔ مولوی علی بخش خاں انگریز حکومت کے ملازم تھے اور سرسید سے ذاتی رنجش رکھتے تھے۔ حالی نے حیات جاوید میں اس کی طرف کچھ نشاندہی بھی کی ہے۔ کہ انگریزوں کے ایک طبقہ کی حمایت میں یہ ساری کاروائیاں کی جارہی تھیں جس میں ولیم میور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا مدلّل جواب سرسید نے دیکر ان کی علمی حیثیت کو مشکوک کر دیا تھا۔ ہم یہاں ذاتی رنجشوں کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ یہ سوال ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہے کہ مولوی علی بخش خاں کی علمی حیثیت کیا ہے اور کیا ان کا نام ہندوستان کے مقتدر علمار کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے؟

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر خود مولوی علی بخش خاں کا کوئی خاص علمی درجہ نہیں تو کیا کوئی تحقیقی تصنیف ان کے خیالات کی حمایت میں کسی مقتدر عالم کی موجود ہے جس میں سرسید

کی طرف اسی طرح کے عقائد منسوب کئے گئے ہوں؟ ہندوستان کے جانے پہچانے مقتدر علماء کا نام تمام مسلمانوں کو معلوم ہے چند ان میں سے یہ ہیں، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مودودی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا قاری طیب صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہم نے بہت تحقیق کی مگر ہمیں آج تک ان میں سے کسی عالم کی کوئی تحقیقی تصنیف مولوی علی بخش خاں کی حمایت میں یا سرسید کے مذہبی عقائد کی گمراہی کے سلسلہ میں فراہم نہ ہو سکی۔ سرسری طور پر سرسید کو بدعقیدہ قرار دے دینا ایک الگ بات ہے اور تحقیق کے دائرے میں اس خیال کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ ایک سنی سنائی بات مانی جائیگی۔ ایک وجہ سرسید کے بدعقیدہ ہونے کے سلسلہ میں کسی تصنیف کے نہ ہونے کی یہ ہو سکتی ہے کہ دینی علماء نے سرسید کے اس پہلو کو اہمیت ہی نہ دی ہو اور یہ مان لیا گیا ہو کہ سرسید تو گمراہ تھے ہی اس کا کیا ذکر کرنا۔ لیکن یہ بات اور زیادہ خطرناک ہے کہ اس طرح بہتان کا الزام بہت آسانی سے لگ سکتا ہے جبکہ خود سرسید کی تحریریں اپنی صفائی میں موجود ہیں۔ خدا کے حضور ایسا شخص اپنے اوپر لگائے گئے بہتان کا جواب طلب کر سکتا ہے اور اس وقت جب انصاف کا بول بالا ہو گا جواب دینا بہت مشکل ہو گا۔

اس ضمن میں چند خطوط کا تبادلہ سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی صاحب کے درمیان ہوا۔ سرسید نے اپنے عقاید علماءِ سہارنپور کو پیش کئے وہاں سے بھی سرسید کے اوپر کوئی الزام نہ لگایا گیا۔ اور ان کو گمراہ قرار دینے کی کوئی تحریر اس میں نہیں پائی جاتی یہ خط و کتابت تصفیۃ العقاید کے نام سے مجتبائی پریس دہلی سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ پیرجی محمد عارف، سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی دونوں کے دوست تھے سرسید نے پیرجی کے توسط سے اپنی تفسیر کے پندرہ اصول مع وضاحت کے مولانا قاسم نانوتوی صاحب کو بھجوائے تھے۔ ہم یہاں اس علمی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ سرسید اپنے مذہبی خیالات کے سلسلہ میں اپنے زمانے کے بڑے عالم سے رائے مشورہ طلب کرنا چاہتے تھے۔ فرمایا کہ!

بزرگانِ سہارنپور نے جو نوازش و دل سوزی میرے حالِ زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھونگا مگر اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

حضرت ناصح جو آویں دیدۂ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھا دیں گے کیا

جناب من میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر، مرتد ٹھہرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے، جو میرے نزدیک محالات سے ہے چند اصولوں پر مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگانِ سہارنپور کی خدمت میں بھیج دیں۔ اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلا شبہ نصیحت کارگر ہوگی ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے ہو جاویں۔[1]

اس کے بعد پندرہ اصولِ تفسیر سر سید نے نقل کئے ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی اور سر سید کے بیچ یہ خط و کتابت بہت سے مسائل کا حل پیش کر سکتی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ محقق حضرات اس کی روشنی میں سر سید کے مذہبی افکار کو سمجھنے کی کوشش کریں ہو سکتا ہے کہ قوم کی بھلائی کا کچھ راستہ اس سے بھی نکل آئے کہ سر سید کا کوئی کام ملتِ اسلامیہ کی بھلائی سے خالی نہ تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی کی کسی تحریر کا سر سید کے مذہبی عقائد کی مخالفت میں موجود نہ ہونا سر سید کے عقائد کی درستی کی بہت بڑی دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی عہد کے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے نظریات کو بہتر طور سے سمجھتے تھے۔ اگر قاسم نانوتوی صاحب کوئی خطرہ محسوس کرتے تو ضرور قوم کو اس سے خبردار کرتے کہ یہ انکا دینی فریضہ ہو جاتا۔

آئندہ صفحات میں ہم سر سید کے ایک مشہور مضمون "دافع البہتان" کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جس میں سر سید نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا ہے۔

---

[1] مکتوبات سر سید ص ۴۰

دافع البہتانؒ

سرسیدؒ کا جواب در "تائیدِ اسلام"

"جناب حضرت سید الحاج مولوی علی بخش خان بہادر سب آرڈینیٹ جج گورکھپور نے ایک کتاب "تائید اسلام" تحریر فرمائی ہے جس میں مجھ پر بہت سے اتہام کئے ہیں اگرچہ میں ایسی باتوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا مگر بہت سے دوست بضد ہیں کہ جن عقائد کو جناب سید الحاج نے تمہاری طرف منسوب کیا ہے ان کی نسبت بلا بحث واستدلال صرف اتنا لکھو کہ وہ حقیقت میں تمہارا عقیدہ ہے یا تم پر اتہام ہے میں ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں"۔

اس تمہید کے بعد سرسید نے فرداً فرداً تمام اتہاموں کا جواب دیا ہے۔ ہم نے نہایت مختصر کرکے صرف ان عقائد کا جواب یہاں نقل کیا ہے جو کہ عام فہم اور عوام کو غلط فہمی میں ڈالنے والے ہیں خالص علمی اور فلسفیانہ مباحث کا یہاں ذکر نہیں کیا ہے ان معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مضمون کو رسالہ تہذیب الاخلاق سے نقل کر سکتے ہیں۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ مجموعہ موجودہ اسلام مخاطب یعنی میرے نزدیک قطعاً باطل ہے۔ یہ محض اتہام ہے میرا یہ عقیدہ نہیں ہے میں نے ایک مقام پر جہاں بحث کی ہے کہ مذاہبِ مختلفہ میں کونسا مذہب سچ ہو سکتا ہے اور بعد ایک لمبی تقریر کے بیان کیا ہے کہ مذہبِ اسلام کے سوا کوئی مذہب سچ نہیں ہو سکتا وہاں میں نے لکھا ہے کہ اسلام سے مراد یہ مجموعۂ احکام نہیں ہے کیونکہ اس میں احکام منصوصہ اور اجتہادات وقیاسیات سب شامل ہیں جنہیں خطا کا احتمال ہے۔ اس مقام پر میری مراد مذہبِ اسلام سے صرف احکامِ منصوصہ ہیں پس یہ کہنا کہ میرے نزدیک مجموعہ موجودہ اسلام قطعاً باطل ہے کیسا غلط اور کتنا بڑا اتہام ہے سے سر بھی یہاں ...

—— مولانا سید الحاج فرماتے ہیں کہ مجموعہ اسلام مخاطب یعنی میرے نزدیک خلافِ مرضیِ الٰہی ہے۔

—— نعوذ باللہ میرے نزدیک کوئی مذہب سوائے مذہبِ اسلام کے مطابق مرضیِ الٰہی کے

۱؎ تہذیب الاخلاق ۱۵ شعبان ۱۲۹۱ ہجری ص۱۳۲

نہیں ہے"

——— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ احکام معاد پر اعتقاد لانا اور صحیح ماننا مخاطب کے نزدیک مانع ترقی ہے ۔

——— لعنت خدا کی ہو اس پر جس نے یہ لکھا ہو اور جس کا یہ اعتقاد ہو۔ میں نے یہ لکھا ہے کہ جب اس سچے مذہب میں بھی لغو خیالات اور بد تعصبات مل جاتے ہیں تو وہ ویسا ہی انسان کی ترقی کا حارج ہو جاتا ہے ۔ کجا یہ الفاظ کجا یہ عقیدہ جو سید الحاج نے میری نسبت لکھا ہے جس وقت انہوں نے یہ لکھا شاید خود ان کو احکام معاد پر یقین نہ تھا کیونکہ اگر یقین ہوتا تو وہ ضرور خیال فرماتے کہ مرنا بھی ہے خدا کے سامنے جانا ہے میں کیونکر ایک شخص پر اتہام کروں ۔

——— جناب موصوف فرماتے ہیں کہ ایجادِ شریعت مخاطب یعنی میرے نزدیک ضروری ہے ۔

——— لعنت اللہ . . میرے اعتقاد میں شریعت حقہ محمدیہ خاتم شریعت ہے جیسا کہ محمدؐ خاتم النبوت ہیں

——— جناب سید الحاج نے پانچ اتہام ایک فقرے میں میری نسبت کئے ہیں ایک اتباع سوادِ اعظم و اتفاق جمہور مخاطب کے نزدیک باطل ہے دوم کسی عالم کے قول کا اعتبار نہیں ۔ سوم مسلمات مذہبی سے انکار کرنا نہ بدعت ہے نہ کفر ہے چہارم تقلید ائمہ اربعہ کی ظلمت و ضلالت ہے پنجم فقہ وحدیث پر اعتقاد لانا بیجا ہے ۔

——— یہ سب جو کچھ لکھا ہے سب غلط ہے اور تمام تر مضامین کو تحریف کیا ہے ۔

——— جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے احکام معاد مثل جنت و نار صراط و میزان وحشر و نشر وغیرہ عذابِ قبر وغیرہ جو محسوسات نہیں ہیں باطل ٹھہرائے ہیں ۔

——— یہ محض اتہام ہے میں نے ایک حرف بھی اب تک ان کی نسبت نہیں کہا ۔ نعیم جنت و وعید جہنم پر اور بعث بعد الموت پر میں اعتقاد رکھتا ہوں ۔ باقی رہیں ان کی کیفیات وہ ہر شخص موافق اپنے مذاق کے بیان کرتا آیا ہے چنانچہ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم ان باتوں سے بھری ہے ۔

——— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ صرف فرائض پر عمل کرنا وہ بھی جو نیچر کے موافق ہوں کافی ٹھہرایا

ہے"

___ اگرچہ اس میں بھی کچھ تدلیس کی ہے مگر بلاشبہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جس قدر فرائض مذہب اسلام ہیں وہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہیں اور بلاشبہ صرف فرائض کا ادا کرنا اور گناہوں سے بچنا بہشت میں جانے کو کافی ہے۔

___ جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ جو عبادت خلاف نیچر ہو اس کو میں نے باطل ٹھہرایا ہے۔

___ اس میں بھی تحریف کی گئی ہے کیونکہ میں نے کہا ہے کہ زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل اور نفل پڑھنے اور نفل روزہ رکھنے میں منحصر سمجھنا (قطع نظر اس کے کہ ان کا ایسا کرنا حد اعتدال سے گذر جانا قانونِ قدرت کے خلاف ہے مقصود شارع ہے یا نہیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عبادت سہی) مگر اس کے سوا اور نیک باتوں کو عبادت نہ سمجھنا جو ان سے زیادہ مفید ہیں بڑی غلطی ہے کجا یہ مضمون اور کجا یہ اتہام۔

___ جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ جس قدر عبادات و حسنات خلاف نیچر ہوں ان کو میں نے باطل ٹھہرایا ہے۔

___ مگر جناب یہ نہیں سمجھتے کہ جس قدر نیک عادتیں و حسنات ہیں وہ نیچر یعنی فطرت اللہ کے برخلاف ہیں ہی نہیں کیا جناب سید الحاج عادات خلاف فطرت کو احسن سمجھتے ہیں؟

___ وہ میرا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ مذہب خدا کا قول اور فطرت خدا کا فعل ہے دونوں ایک ہیں

___ کیا جناب سید الحاج کو اس میں شک ہے کیا ان کے نزدیک خدا کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔

___ جناب سید الحاج میرا قول نقل کرتے ہیں کہ طریقہ لباس و اکل و شرب و اخلاق و عادات ایسی اختیار کرنی چاہیے جس سے تہذیب یافتہ قوموں کی نظر میں حقارت نہ ہو۔

___ کیا جناب سید الحاج کی خواہش اس کے برخلاف ہے کیا اپنی قوم کو تمام تہذیب یافتہ قوموں کے سامنے حقیر و ذلیل رکھنا چاہتے ہیں، کیا ان کی مرضی ہے کہ مسلمان ہمیشہ ذلیل رہیں اور تربیت یافتہ قوموں کی نگاہ میں ان کی کچھ قدر و عزت نہ ہو؟

—— جناب سید الحاج میری نسبت الزام لگاتے ہیں کہ میں ترقی قومی کو دیگر حسنات پر ترجیح دیتا ہوں۔

—— جناب سید الحاج بلاشبہ میرا یہ عقیدہ ہے۔ یہی مذہب ہے اور یہی قول ہے اور خدا اسی قول پر میرا خاتمہ کرے کہ بعد ادائے فرض کے کوئی عبادت قومی بھلائی میں کوشش کرنے سے بہتر نہیں ہے البتہ خود غرض نفس کے بندے قومی بھلائی میں کوشش کرنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے تعلیم دینیات کی جو مروّج ہے غیر مفید ٹھہرائی ہے اور اس کی دلیل میں میرا یہ قول نقل کیا ہے کہ "زمانہ حال میں دینیات کی تعلیم بھی مسلمانوں میں مفید طریقہ پر نہیں ہے"

—— اے مسلمانو! انصاف کرو کہ میرے اس قول کا یہ مطلب ہے جو جناب سید الحاج نے نکالا ہے کیا ان کا ایسا لکھنا اتہام نہیں ہے؟ اور کیا دیدہ و دانستہ انھوں نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کہ طریقہ تعلیم کو غیر مفید کہنا اور کیا تعلیم دینیات کو غیر مفید کہنا۔

—— جناب سید الحاج میرا قول نقل کرتے ہیں کہ احکام نیچر (یعنی فطرت اللہ) کبھی نہیں ٹوٹنے کا اور پھر اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ معہذا احکام حشر و نشر و فنا باطل ٹھہریں گے۔

—— مگر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ جناب میرا یہ مطلب نہیں ہے حضور نے قصداً یا خطاً غلطی فرمائی ہے حشر و نشر و فنا خود نیچر و فطرت اللہ میں شامل ہے جب وہ ہوگا عین نیچر ہوگا افسوس ہے کہ جناب کو نہ قرآن کے لفظ فطرت اللہ کی تحقیق ہے اور نہ انگریزی لفظ نیچر کی مگر قلم پکڑ کر جو دل میں آتا ہے اس کو تحریر فرما دیتے ہیں۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں کل احادیث کی صحت کا انکار کرتا ہوں۔

—— لاحول ولا... یہ محض غلط اتہام میری نسبت ہے میں خود بیسیوں حدیثوں سے جو میرے نزدیک روایتاً و درایتاً صحیح ہوتی ہیں استدلال کرتا ہوں۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے ایڈیسن اور اسٹیل کو پیغمبر ٹھہرایا ہے۔

—— شاید جناب سید الحاج اس لیے خفا ہوئے کہ میں نے جناب ممدوح کو پیغمبر کیوں نہیں ٹھہرایا۔ خیر معاف فرمایئے میں جناب ممدوح کا مرتبہ اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں وہ تو پیغمبران سخن تھے میں سید الحاج کو خدائے بہتان و اتہام جانتا ہوں۔

—— جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے بمقابلہ فلسفیات جدیدہ کے قرآن و حدیث کو بیکار قرار دیا ہے۔

—— لعنۃ اللہ.. اس قدر کہنا بس ہے کہ کیا فائدہ ہے ایسے اتہامات سے اور کیا نتیجہ جناب سید الحاج نے اس میں سمجھا ہے۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے خاتم الانبیاء صلعم کو نیچرلسٹ ٹھہرایا ہے۔

—— میں نے تو یہ لفظ نہیں کہا اور اگر جناب سید الحاج نے بنظر تحقیر یہ لفظ جناب خاتم المرسلینؐ کی نسبت ارقام فرمایا ہے تو اس کا مظلمہ خود جناب کی گردن پر ہوگا کیونکہ سید الحاج کے ہم مشرب علماء کے فتوؤں سے پہلے ہی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی کی نسبت کلمۂ تحقیر کا بلا قصد نقل کرنا بھی کفر ہے

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک علاوہ مذہب اسلام کے دوسرے مذاہب بھی سچے ہو سکتے ہیں۔

—— میں نہیں جانتا کہ یہ مطلب جناب سید الحاج نے کہاں سے استنباط فرمایا ہے میرا تو یہ مذہب ہے کہ مذہب اسلام ہی سچا مذہب ہے اور جو مذہب سچا ہوگا اسلام ہی ہوگا۔

—— جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اہل سنّت وغیرہ جو فرقے اسلام کے ہیں سب باطل ہیں صرف ملتِ نیچریہ حق ہے

—— میں چاہتا ہوں کہ جناب سید الحاج اور ہم دونوں مل کر کہیں کہ لعنت اللہ علی الکاذبین اور ہمارے اور ان کے دوست پکاریں آمین باد۔ معلوم نہیں کہ جناب سید الحاج نے ایسی لغو اور بیہودہ باتوں سے کیا فائدہ سمجھا ہے۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جو مسئلہ شرعیہ خلاف عقل و مخالف نیچر ہو

وہ باطل ہے۔

—— معلوم نہیں سید الحاج الٹی راہ کیوں چلتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ میرے عقیدے میں کوئی مسئلہ شریعت حقہ محمدی کا خلاف عقل و خلاف فطرت اللہ نہیں ہو سکتا۔

—— جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے اصول و فروع اسلام سے اپنے اختلاف کا اقرار کیا ہے۔

—— یہ الفاظ تو جناب کے دل کے بخارات ہیں مگر بلاشبہ اس زمانے میں جو مسائل مسلمانوں میں رائج ہیں ان میں سے چند مسائل سے مجھے اختلاف ہے اس لیے کہ وہ مسائل میرے خیال میں خلاف شرع ہیں اصول و فروع سے اختلاف ہونا جو جناب فرماتے ہیں یہ محض اتہام ہے۔

—— جناب سید الحاج مجھ پر یہ اتہام کرتے ہیں کہ اگر علوم جدید میں مذہب اسلام خلل انداز ہو تو مذہب اسلام کا چھوڑ دینا لازم ٹھہرایا ہے

—— سبحان اللہ کیا دادِ سخن فہمی دی ہے۔ جناب یہ مطلب نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ مذہب اسلام ایسا پختہ ہے کہ کیسے ہی علوم جدیدہ کیوں نہ پڑھائے جاویں مذہب اسلام سے بد اعتقادی نہیں ہو سکتی۔

—— جناب سید الحاج نے بغیر سوچے سمجھے ان الفاظ سے میرا عقیدہ بیان کیا ہے کہ ذاتِ باری قانونِ فطرت کو توڑنے یا تبدیل اور تغیر کرنے پر اختیار نہیں ہے۔

—— یہ بالکل اتہام محض ہے قانونِ فطرت کبھی نہیں ٹوٹتا کیونکہ جو کچھ خدا کرتا ہے وہی قانون ہے

—— قول: ۔ سوائے عقل کے کوئی رہنما نہیں ہے۔

—— بے شک عقل رہنما ہے اور اسلام اور کفر میں جو تمیز کرنے والی ہے وہ بھی عقل ہے۔ جناب نے اس کتاب میں عقل سے کام نہیں لیا اسی واسطے غلطی میں پڑے۔

—— قول: ۔ قانونِ فطرت یعنی نیچر کے خلاف کوئی امر ظہور میں آنا ممکن نہیں ہے لہٰذا معجزات

انبیاء پر یقین لانا صحیح نہ ہوگا۔

—— یہ قول جناب کا محض غلط ہے۔ جو شخص کہ فطرت اللہ اور قانونِ قدرت اور نیچر کے معنی ہی نہ جانتا ہو اس کو دخل در معقولات کا ضرور ہے جناب سید الحاج نے خود اپنی غلطی سے سمجھ لیا ہے کہ معجزات انبیاء خلاف فطرت اللہ یا خلاف نیچر ہیں حالانکہ کوئی معجزہ کسی نبی کا خلاف نیچر اور خلاف فطرت اللہ نہیں ہے صرف ثبوت اس کے وقوع کا درکار ہے اور جب ثابت ہو کہ فلاں امر واقع ہوا تو بلاشبہ اس پر یقین کیا جاویگا کہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہے گو کہ اس کی ماہیت ہماری سمجھ میں نہ آوے کیونکہ ہزاروں کام نیچر کے ایسے ہیں جن کی ماہیت ہماری سمجھ سے باہر ہے سید الحاج صاحب نے بڑی غلطی کی ہے جو یہ لکھا ہے کہ سب باتیں یعنی معجزات انبیاء قانونِ فطرت کے توڑنے والے ہیں حالانکہ وہ قانونِ فطرت کے پورا کرنے والے ہیں اور یہ بھی غلطی کی ہے کہ اگر معجزاتِ انبیاء مان لیے جائیں تو عقلیات کے خلاف اقرار کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ یہ محض غلط ہے۔

—— قول: ملائکہ سے مراد قوائے انسانی سے ہیں

—— میرا یہ قول ہے کہ ملک کے لفظ کا قوائے انسانی پر بھی اطلاق ہوا ہے اور میں نے کسی ایسے وجود کا جو علاوہ انسان کے ہو ملک کا جس پر اطلاق کیا جاوے انکار نہیں کیا ہے۔

—— قول: شیطان کا وجود نہیں ہے۔

—— میں شیطان کے وجود کا قائل ہوں مگر انسان میں ہی وہ موجود ہے خارج من الانسان نہیں اگرچہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس عقیدے سے رجوع کر دوں کیونکہ اس زمانے میں بہت سے شیطان مجسم دکھائی دیتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اور اکابر بھی وجودِ شیطان خارج من الانسان کے منکر ہیں۔

—— قول:۔ قرآن کے معنی جس قدر نیچر اور فلسفہ کے خلاف ہوں اس کو خواہ مخواہ نیچر اور فلسفہ کے اقوال سے ملا دینا چاہیے۔

—— یہ ایسی تقریر ہے جیسے کہ ایک جلا ہوا کسی شخص کی اچھی بات کو بھی برا کر کے دیکھتا ہے فلسفۂ قدیم تو ایک لغو چیز ہے اس کے مطابق قرآن کا ہے کو ہونے لگا مگر فطرت اللہ نہایت عمدہ اور مستحکم چیز

ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ نہ قرآن اس کے برخلاف ہے اور نہ وہ قرآن کے برخلاف ۔

—— عقیدہ :۔ اس عقیدہ میں نعیم جنت اور وعید دوزخ کو بیان کرکے میرا یہ عقیدہ لکھا ہے کہ یہ سب چیزیں اپنی حقیقت پر محمول نہیں ہیں ۔

—— جناب کے نزدیک اگر حور کی وہی حقیقت ہے جیسی کہ ایک خوبصورت رنڈی اور غلمان کی یہ حقیقت ہے جیسے کہ ایک خوبصورت لونڈا تو بلاشبہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس حقیقت پر وہ محمول نہیں ہے ۔

—— جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے ہر فعل میں مختار ہے مسئلۂ بین الجبر والاختیار کا غلط ہے ۔

—— اس مطلب کو بھی بگاڑ کر بیان کیا ہے ۔ بیشک میرے نزدیک بین الجبر والاختیار تو کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان اپنی جبلّت اور فطرت میں مجبور اور اپنی قدرت میں مختار ہے ۔

—— قول :۔ تقلید کرنا کسی بشر کی کفر اور شرک ہے صحابہ ہوں خواہ اہل بیت خواہ ائمہ اربعہ کسی کی تقلید کرنا نہ چاہیے ۔

—— جو الفاظ تشدد کے سید الحاج نے ارقام فرمائے ہیں یہ سب دل کے بخارات ہیں میرا تو صرف یہ عقیدہ ہے کہ سوائے رسولِ خدا کے کسی کی تقلید واجب نہیں ہے اور سوائے رسول خدا کے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا قول فعل دینی امور میں بلا دلیل دحجت ہو اور جو شخص کسی کو ایسا سمجھے مشرک فی النبوّت ہے ۔

—— جناب نے میرا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے کہ جس قدر کتب حدیث وتفسیر فقہ واصول فی زمانہ پڑھائی جاتی ہیں ۔ ان سے سوائے فساد مذہب اور بدتہذیبی اور خرابی دنیا اور عقبیٰ کے کچھ فائدہ نہیں لہٰذا ان کی تعلیم قطعاً موقوفی کے لائق ہے ۔

—— جو کلمات کہ جناب نے اس عقیدہ میں ارقام فرمائے ہیں وہ تو سب ان کے دل کے بخارات ہیں وہ الفاظ میرے نہیں ہیں ہاں میرے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ علم کلام جو حکمت یونان کے مقابل بنایا گیا تھا اس زمانے میں محض بیکار ہے ۔ اور علماء پر فرض ہے کہ علم کلام کو از سرِ نو اس طرح پر تدوین کریں کہ وہ بمقابلہ حکمت اور علوم جدیدہ کے جو اس زمانے میں رائج ہیں کار آمد ہو ۔

کتب تفسیر میں جو بے سند حدیثیں اور بے سند قصہ اور کہانیاں لکھی ہیں ان میں جو جو بھی غلط ہیں ان کی تنقیح ضرور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید اور احادیث کا پڑھنا صرف عمل کرنے کے لیے مقصود ہے مگر اس زمانے میں اس پر عمل کرنے کے لیے نہیں پڑھا جاتا۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن و احادیث عمل کرنے کے لیے پڑھو اور جو مسئلہ اس میں پاؤ اس پر عمل کرو۔ خواہ وہ شافعی کے مطابق ہو خواہ حنفی کے اور اگر عمل کرنے کے لیے نہیں پڑھتے تو ان کا پڑھنا محض بے فائدہ ہے۔

—— عقیدہ " معراجِ جسمانی بے اصل ہے صرف خواب میں مسجد اقصیٰ نظر آگئی تھی۔ اور شق صدر آنحضرتؐ کا بھی بے اصل ہے۔

—— ضد سے ایک شخص دوسرے شخص کی بات کو بگاڑ کر اور اصلیت چھپا کر دوسرے پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے۔ اصل اس کی صرف یہ ہے کہ نسبت معراج جناب رسولؐ کے تین مذہب ہیں اول حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض صحابہ کا جو اس بات کے قایل ہیں کہ معراج روحانی تھی نہ کہ جسمانی۔

دوسرا مذہب چند اکابرین دین کا ہے اور وہ یہ ہے کہ معراج بیت المقدس تک جسمانی تھی اور وہاں سے ملاء اعلیٰ تک روحانی۔

تیسرا مذہب جو سب میں مشہور ہے کہ تمام معراج جسمانی تھی میری یہ رائے ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ پر قرآن مجید و احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو مذہب حضرت عائشہ صدیقہ کا ٹھیک اور درست معلوم ہوتا ہے۔ وہی مذہب میں نے اختیار کیا ہے۔ اس معاملہ میں جو الفاظ طنز میری طرف کہتا ہے درحقیقت حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض صحابہ کی نسبت کہتا ہے۔

شق صدر کی نسبت بھی چند مذہب ہیں بعضوں کا قول ہے کہ پانچ دفعہ شق صدر واقعہ ہوا۔ اکثر کا قول ہے کہ ایک دفعہ ایام طفولیت میں واقع ہوا، یا دریوں نے ان روایات ضعیفہ غیر معتبرہ کی بنا پر یہ استدلال کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرتؐ کو صرع کی بیماری تھی اور حالت صرع میں جو کیفیت واقع ہوتی ہے اسی کو راویوں نے شق صدر تعبیر کیا ہے۔ میں نے ان تمام روائتوں کی بقدر اپنی طاقت کے تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ وہ روائتیں محض نامعتبر ہیں۔ تیسرا مذہب محققین کا یہ تھا کہ واقع شق صدر ایک جزو تھا ان تمام واقعات کا جو شب معراج کو واقع ہوئے تھے یہی روایت میرے نزدیک صحیح و معتبر ہے۔

سرسید کی مخالفتیں

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ عظیم شخصیتوں کو اپنے ابتدائی دور میں سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جتنے بھی نبی، پیغمبر اور مصلحین دنیا میں آئے ان سب کی یہ مشترک سنت رہی ہے اور حیرت انگیز مماثلت ان کے مخالفین کے رویہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عظیم انسانوں اور مصلحین کی نظریں ماضی حال اور مستقبل سب دیکھتی ہیں جبکہ زمانہ ان سے محض نابلد ہوتا ہے خاص طور سے وہ لوگ نہیں جانتے جن سے کہ وہ مخاطب ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی آواز زمانے سے بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے اور اکثر جمہور کو انتہائی ناگوار گذرتی ہے خاص طور سے با اثر اور صاحب اقتدار طبقہ سب سے پہلے مخالفت شروع کرتا ہے کیونکہ نئے قسم کے خیالات عام ہونے سے اس کے اقتدار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ نئے خیالات اور نظریات کے عام ہونے سے عوام الناس کے ذہن و دماغ سے پہلے سے موجود صاحبِ اقتدار طبقے کی عزت و وقار جاتا رہتا ہے اور نتیجتاً ان کا اثر سماج پر سے ختم ہو جاتا ہے۔ یہی سب کچھ سرسید کے ساتھ پیش آیا۔ سرسید کے مخاطب ہندوستان کے مسلمان تھے اور مسلمانوں پر دینی علماء کا طبقہ حکومت کر رہا تھا لہٰذا اسی طبقہ کی طرف سے پہلے مخالفت شروع ہوئی۔ کچھ نے نا سمجھی میں حمایت اسلام کے نام پر جوش پکڑا اور بہت سے ایسے بھی تھے جو انگریزوں سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔ اس طبقہ نے مجموعی طور سے اس بات کی کوشش کی کہ سرسید کی تحریک کو شروع ہی میں خاک میں ملا دیں لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے اور سرسید کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئیں

حتیٰ کہ کفر و ارتداد کا فتویٰ لگانے والوں تک کو نئی تعلیم کی افادیت اور اہمیت کو تسلیم کرنا پڑا۔

ہماری باتیں ہی باتیں تھیں سید کام کرتا تھا
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

لیکن سرسید کی مذہبی تصنیفات کے سلسلے میں اتنا عمل ڈالا گیا کہ سرسید کو اپنے تعلیمی مشن کو جاری کرنے کے لیے اپنے مذہبی خیالات کو نظر انداز کر دینا پڑا اس امید پر کہ شاید کوئی وقت آئے جب میری مذہبی تحقیقات مسلمانوں میں بحث کا موضوع بنیں اور امت اس سے مستفید ہو۔ اس وقت اپنے دینی خیالات اور تحقیقات پر زور دیکر سرسید اپنے تعلیمی مشن کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے نتیجتاً آج سرسید کے مذہبی نظریات پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور دینی علوم اصولِ تفسیر علم کلام وغیرہ میں سرسید کسی بڑی اصلاح کے کرنے میں ناکام رہے۔ دینی علماء کرام سے صلح کرنے کے لیے ان کو اپنے مذہبی نظریات اور تحقیقات کی تشہیر سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ لیکن کیا سرسید اس قربانی کو دینے کے باوجود دینی علماء کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کے برخلاف آج تک وہ فتوے واپس نہیں لیے گیے جو سرسید کے خلاف لگائے گیے تھے اور جو سرسید کو ملحد نیچری کافر دجال وغیرہ قرار دیتے ہیں۔ آج بھی اکثر دینی علماء کا رویہ سرسید کے تئیں ہتک آمیز خاموشی کا ہے اور زیادہ سے زیادہ جو گنجائش وہ سرسید کو دیتے ہیں وہ یہ کہ اب ان کے معاملے پر خاموش رہتے ہیں اور ان کے کفر پر اصرار نہیں کرتے۔

سرسید کے مشن کی سب سے زیادہ مخالفت خود مسلمانوں کی طرف سے ہوئی لیکن حکمراں انگریزوں کے ایک بہت با اثر طبقہ اور بعد کے دور میں برادرانِ وطن کی مخالفتیں بھی سرسید کو برداشت کرنی پڑیں۔ انگریزوں میں ولیم میور اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو سرسید کے مشن کو انگریزی حکومت کے لیے خطرہ کی گھنٹی سمجھتا تھا اور ان کو علی گڑھ کالج سے "بغاوت کی بو" آتی تھی۔ خود علی گڑھ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

کالج کے لیے زمین دینے پر راضی نہ تھا اور بہت زمانہ تک مخالفت کرتا رہا۔ سرسید کے دو بڑے مخالفین مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش خاں بھی انگریز حکومت میں ملازمت کرتے تھے اور اہم عہدوں پر فائز تھے ان کی مذہبی مخالفتوں کے پس پشت ذاتی رنجشوں کے علاوہ بہت سے انگریز افسران کا بھی ہاتھ تھا۔ سرسید کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں جتنی بھی افواہیں پھیلائی گئیں انہی دونوں حضرات کا کرشمہ ہیں حتیٰ کہ آج تک کچھ بڑے بڑے علماء بھی بغیر کسی تحقیق کے مولوی علی بخش خاں اور مولوی امداد علی کے لگائے ہوئے الزاموں کو دہراتے رہتے ہیں۔

مخالفت کے اسباب

ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ سرسید کے مذہبی عقائد کی وجہ سے ان کی مخالفت ہوئی گویا سرسید سے پہلے مسلمان تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے اور سرسید کے گمراہ عقائد کی وجہ سے اس راستہ سے ہٹ گئے۔ اس بات کی عام تشہیر کی گئی ہے کہ چونکہ سرسید کے عقائد درست نہیں تھے لہٰذا ان کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کی گئی۔ یعنی اگر سرسید کے عقائد ٹھیک ہوتے تو تمام دینی علماء ان کا دل سے ساتھ دیتے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ غلط عقیدے والے مسلمان کے ساتھ یہ حضرات کام نہیں کر سکتے چاہے مشرکین کے ساتھ کام کر لیں۔ غیرتِ ایمانی کا تقاضہ یہ ہے کہ عقیدہ میں ذرہ برابر خرابی برداشت نہ کریں اور ایسے شخص کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کر دیں۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کو دینی حمیت اور جوش اسلامی کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے اور تاریخ کی گواہی اس مفروضہ کے خلاف جاتی ہے کہ دینی علماء سرسید سے بہت پہلے ہی سے انگریزی و سائنسی تعلیم کو اسلام کے منافی خیال کرتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تعلیم سے مسلمان عیسائی بن جائیں گے چنانچہ ۱۸۳۵ء میں سرسید کی تحریک کے آغاز سے ۲۵ سال پہلے جب حکومت نے انگریزی تعلیم پھیلانے کے لیے اقدامات کرنے چاہے تو تقریباً آٹھ ہزار علماء اور رؤساء نے حکومت میں عرضی ارسال کی کہ حکومت کا انگریزی تعلیم پر زور دینا ثابت کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔

وو کلکتہ کے مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار علماء اور رئیسوں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر زور دینا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے،، لے

حالانکہ شاہ عبدالعزیز پہلے ہی یہ فتویٰ دے چکے تھے کہ انگریزی علوم حاصل کرنا جائز ہے لیکن یہ فتویٰ خود دینی علمار کے طبقہ میں قبولِ عام کا درجہ نہ حاصل کر سکا بلکہ اس فتوے کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی اس فتویٰ کی موجودگی سے ایک بڑے عالم نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علمار سائنس کی تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ اگر ایسا ہے تو اس زمانہ کا ذکر چھوڑیئے آج دینی مدارس میں ذرا کچھ انگریزی اور بنیادی سائنس کے چند مضامین شامل کرا لیجیے! آج جب یہ حال ہے تو اس زمانہ میں یعنی آج سے سو سال سے بھی زیادہ پہلے اگر دینی علمار اور ان کے اثر میں عوام الناس انگریزی زبان اور علوم کے حاصل کرنے کو اسلام کے لیے انتہائی نقصان دہ سمجھتے تھے تو کیا غلط کرتے تھے؟ لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کی مخالفت ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے ہوئی سراسر غلط ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا جیسے جیسے سرسید کے مذہبی عقائد لوگوں کے سامنے آتے گئے مخالفین نے اس میں ترمیم کر کے ان کو طرح طرح کے ہتھیاروں کی مثل استعمال کیا۔ ایسا نہ تھا کہ پہلے علمار ان کے تعلیمی مشن کے حامی تھے اور ان کے مذہبی خیالات پتہ چلتے ہی ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ بلکہ یہ سلسلہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ یہ لوگ تعلیمی تحریک بلکہ مسلمانوں میں کسی بھی طرح کی اصلاحی تحریک کے پہلے سے مخالف تھے اور سرسید کے مذہبی خیالات کو بہانہ بنا کر ان پر کافر ملحد زندیق وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نافذ کر دی گئیں کہ ان کی مخالفت اسلامی حمایت کی تحریک سمجھی جائے

جہالت کا اندھیرا اس قدر دبیز تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے والے بھی کرشان قرار دیدیئے جاتے تھے۔ چنانچہ سرسید نے انگلستان جانے سے پہلے کہ اس وقت تک سرسید کے ذہن میں تعلیمی تحریک کا خاکہ بھی مکمل نہ ہوا تھا، رسالہ احکامِ طعام اہلِ کتاب لکھ کر

لہ (حیات جاوید صفحہ ۳۵۸)

شایع کیا تو ان کو کرستان کا خطاب دیا گیا اور مسلمانوں کے اخباروں میں مشتہر کیا گیا کہ سرسید کرستان ہو گئے۔ انگلستان جانے سے کچھ دن پہلے سرسید نے یہ معمول باندھ لیا تھا کہ اپنے ایک پڑوسی انگریز کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ایک دن محسن الملک سید مہدی علی خاں سرسید کے گھر پہنچے تو وہ انگریز کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا انہیں سخت نفرت ہوئی اور باوجود اصرار کے کھانا نہیں کھایا لیکن دوسرے وقت سرسید کے اصرار پر کہ شرعاً ممنوع نہیں ہے انہوں نے پہلی بار انگریز کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ یہ خبر الہ آباد میں ایک دوست کو ملی تو انہوں نے سید مہدی علی خاں سے استفسار کیا۔ سید مہدی نے مفصل واقعہ نقل کر کے ان کو بھیج دیا۔ آخر یہ خبر اٹاوہ پہنچی تو پورے اٹاوہ میں اعلان کر دیا گیا کہ مہدی علی کرستان ہو گئے۔:

"بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرستان ہو گئے' جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے" [1]

خبر کے مشہور ہوتے ہی ان کے گھر کا سوشل بائیکاٹ شروع ہو گیا عزیز رشتہ داروں اور خدمت گاروں نے آنا جانا چھوڑ دیا:

"اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کمانا سقے نے پانی بھرنا اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا" [2]

سید مہدی علی خاں نے اٹاوہ جا کر لوگوں کو سمجھایا کہ میں کرستان نہیں ہوا ہوں بلکہ تمہاری ہی طرح مسلمان ہوں تو لوگ راضی ہوئے۔

مندرجہ بالا واقعات سے چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کی شروعات سے پہلے ہی مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا غلط سمجھتے تھے۔

---

[1] (حیات جاوید صفحہ ۵۳۶) [2] (حیات جاوید ص ۵۳۷)

۲۔ انگریزوں سے کسی بھی طرح کا میل جول حتیٰ کہ ان کے ساتھ کھانا کھانے کو غیر شرعی سمجھتے تھے اور ایسا کرنے والا ان کے نزدیک عیسائی ہو جاتا تھا۔

۳۔ تعصب اور جہالت کے سبب غیر اسلامی اخلاق و عادات کو قطعی اسلامی سمجھتے تھے

دوران سفرِ انگلستان سرسید سفر کے حالات سائنٹفیک سوسائٹی کو لکھ کر بھیجتے تھے اس سلسلہ میں ایک بار لکھا:

"میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزیدار گوشت مٹن، بیف اور مرغ و کبوتر کھائے۔"

اس تحریر کا چھپنا تھا کہ مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا اور عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو انہوں نے سرسید کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا۔ مسلمانوں کے تمام اخباروں اور رسائل میں سرسید کو گردن مروڑی مرغی کھانے والا کافر کہہ کر لمبے لمبے مضامین چھاپے گئے۔ کانپور، الہ آباد، رامپور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ وغیرہ شہروں سے نکلنے والے اخبارات تمام کے تمام سرسید کی ان تحریروں کے خلاف جو سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھیں کالم کے کالم سیاہ کرتے تھے جس میں کوئی عیب برائی اور الزام ایسا نہ تھا جو سرسید کی ذات سے منسوب نہ کیا جاتا ہو۔ لندن سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہم وطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ الٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہم وطنوں یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لیے میرے ہم وطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی مجھ کو ناگوار نہیں گذری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے۔ نہ الہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں۔ نہ مراد آباد اور رام پور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خانقاہ حاجیان حرمین شریفین

کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے۔ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی۔"ے

سرسید کا بائیکاٹ

قیام انگلستان میں ہی سرسید کو ان مخالفتوں کا اندازہ ہو گیا تھا جو وطن آکر انہیں جھیلنی تھیں مگر انہیں اپنے مشن کی سچائی اور صداقت پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ لوگوں کی سخت سست باتیں اور ہر طرح کی مخالفتیں بھی ان کو اس راہ سے نہ ہٹا سکیں جو انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے اختیار کی تھی۔ یہ خیال رہے کہ ابھی تک سرسید کے ان مذہبی عقائد کا ذکر نہیں آیا تھا جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے سرسید کی تحریک کی مخالفت ہوئی۔ سرسید ابھی لندن میں ہی تھے اور لائف آف محمد کا جواب بعنوان "خطبات احمدیہ" لکھنے میں مصروف تھے وہاں کے طریقۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کر رہے تھے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کو کھنگال رہے تھے اور وہاں کے طلبہ و اساتذہ سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ابھی کالج کی اسکیم اور تہذیب الاخلاق کا نام و نشان تک بھی نہ تھا کہ ہندوستان میں دینی علماء اور اس کے نتیجہ میں عوام کی مخالفت کا جوش بڑھتا ہی جارہا تھا لندن سے واپس جب آئے تو ان کا استقبال مخالف مضامین اور اشتہارات نے کیا جن میں لکھا گیا تھا کہ کوئی شخص سید احمد سے نہ ملے اور جو ایسا کریگا اس کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا:

> "جب سرسید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اضلاع شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی سید احمد سے نہ ملے اور نہ ان کے ساتھ کھانا کھائے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرہ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے خارج ہو جائیگا۔"ے

لہٰذا ان کے آنے کے بہت دنوں کے بعد تک لوگ سرسید کے ساتھ کھانا کھانے تک سے پرہیز کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ پرہیز ختم ہوتا چلا گیا اور مسلمانوں نے نہ صرف سرسید بلکہ انگریزوں کے

ے بحوالہ حیات جاوید صفحہ ۵۲۹) ے حیات جاوید صفحہ ۱۸۱)

ساتھ بھی کھانا پینا شروع کر دیا اور میز کرسی کا استعمال ہونے لگا۔ لیکن ان مخالفتوں کو حالی ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سے منسوب کرتے ہیں، بمقابلہ ان مخالفتوں کے جو آگے چل کر سرسید کی ہوئیں۔ تہذیب الاخلاق اور کالج کی اسکیم لوگوں کے سامنے آتے ہی مخالفت کا ایک مہیب طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس نے پورے مسلم معاشرہ کو اپنے اندھیرے میں ڈبو دینا چاہا لیکن تہذیب الاخلاق کی روشن کرن رفتہ رفتہ آفتاب بن گئی اور تمام مسلمانوں کو حق اور سچائی کا راستہ صاف صاف نظر آنے لگا۔ یہ ساری مخالفتیں اسلام کے نام پر ہوئیں اور نامی نامی دینی علماء اس میں پیش پیش رہے حتیٰ کہ مکہ و مدینہ کے علماء بھی اس مخالفت میں شریک رہے اور سرسید کے واجب القتل ہونے تک کے فتوے صادر کیے گئے۔ سرسید کی تحریروں اور تقریروں سے ایک کیس ان کے خلاف بنایا گیا اور بہت سی ایسی باتیں بھی سرسید سے منسوب کی گئیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آج ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ خدانخواستہ اگر مخالفین سرسید کامیاب ہو جاتے یا سرسید ان مخالفتوں سے گھبرا کر اپنے گھر بیٹھ رہتے یا تعلق دار بننا منظور کر لیتے تو کیا ہوتا؟ سرسید کا ذاتی نقصان کچھ بھی نہ ہوتا بلکہ وہ بہت فائدے میں رہتے اور بجنور میں جاگیر دار بن جاتے لیکن ہاں ہندوستانی مسلمان جدید علوم اور سائنس سے ناواقفیت کی بنا پر بجز خدمت گار، منشی، قلی و چپراسی کے کچھ نہ رہ جاتے۔ لوگوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو بہکانے کی جو کوششیں کیں چاہے ناسمجھی میں کی ہوں یا وہ مخلص ہی رہے ہوں اس کا جو نتیجہ نکلتا وہ یقینی طور سے اسلام کی ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی دشمنی ہوتی۔ خلوص اور نیک نیتی کوئی ہوا میں تیرنے والا جذبہ نہیں ہے اس کا اظہار عملی زندگی میں ہونا چاہیئے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ کو خودکشی کا مشورہ خلوص میں دیا ہے یا میری کم عقلی تھی۔ زہر کو تریاق سمجھ کر پلانے والے پر بہر حال قتل کا الزام عائد ہوگا۔ ہندوستان کے مسلم سماج میں آج بھی وہی صورت حال ہے جو اس زمانے میں تھی۔ وہی سائنس اور جدید علوم سے بیزاری اور پرانے فلسفہ اور طریقۂ تعلیم کو بذاتِ خود مذہب سمجھنا عام مسلمانوں کا آج بھی وہی اندازِ فکر ہے دینی علماء نئے زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے سے کتراتے سے نظر آتے ہیں انہیں خوف ہے کہ

نئے علوم اور مذہب میں ٹکراؤ سے شاید نئے علوم حاوی ہو جائیں یہ خوف جب تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان نئے علوم کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ان کو پوری طرح نہ سمجھ لیں پھر یہی علوم اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

خاص مخالفین

سرسید کی مخالفت کرنے والوں کی قیادت دو حضرات کر رہے تھے ایک مولوی امداد علی اور دوسرے مولوی علی بخش خاں۔ دونوں انگریزی حکومت کے ملازم تھے ایک کانپور میں ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے گورکھپور میں سب جج مذہبی عقائد میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے پہلے سخت قسم کے وہابی اور دوسرے سخت قسم کے بدعتی لیکن مدرسہ کی مخالفت میں دونوں ہم زبان تھے۔ ہندستان میں جتنی بھی مخالفتیں سرسید کی ہوئیں ان کا مرکز یہی دونوں حضرات تھے ان دونوں حضرات کی مخالفت شخصی بغض و عناد کی حیثیت رکھتی تھی اسلامی حمیت و جوش سے اس کا کچھ تعلق نہ تھا اور بہت سے انگریز دوستوں کو خوش کرنا مقصود تھا جو سرسید کے اس مشن کے سخت مخالف تھے کہ ان کی نظر میں یہ تحریک انگریز حکومت کے لیے مستقبل میں خطرہ بن سکتی تھی:

> "اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش اور حمیت اسلامی ہوتی تو انکا کام نہایت تعریف کے لایق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح ان کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ ان کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرستہ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لیے سرسید کی مخالفت کو انہوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخ روئی کا سمجھا تھا۔" [1]

بہت سے اخبارات نے اپنی پالیسی محض اس وجہ سے سرسید کے خلاف رکھی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ عام طور سے مسلمانوں کا رجحان سرسید کے خلاف ہے اس لیے وہ بھی اپنے اخبارات کی

---

[1] (حیات جاوید ص ۲۴۳)

اشاعت بڑھانے کے لیے اس راستہ پر چل نکلے۔ سرسید کے خیالات کی مخالفت میں اخبارات اور رسائل کی بھرمار ہو گئی اور خاص طور سے ان کی کتابوں کے رد میں رسائل تصنیف کیے گئے کہ یہ مالی منفعت کا ذریعہ تھا۔ نور الآفاق، نور الانوار، لوح محفوظ، ہتر ہویں صدی، امداد الآفاق شہاب ثاقب اور تائید اسلام وغیرہ رسائل شایع ہونے شروع ہوئے سرسید کو ملحد، لامذہب کافر، دجال، کرسٹان، نیچری اور کیا کیا نہ خطاب دیئے گئے ان کے کفر پر ہر شہر سے مولویوں کے دستخط کرائے گئے۔ معدودے چند مولویوں کے تمام ہی سرسید کے کفر پر متفق تھے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے پر خاموشی اختیار کی ان کو بھی کافر کہا گیا کہ جو سرسید کو کافر نہ مانے وہ بھی کافر۔

عام طور سے سرسید مخالفت میں چھپے مضامین کا جواب نہیں دیتے تھے لیکن دوستوں کے مجبور کرنے پر اور اس بات کے پیش نظر کہ کہیں خاموشی کو اقرار نہ سمجھا جائے سرسید نے تہذیب الاخلاق میں، دافع البہتان،، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون مولوی علی بخش کی کتاب تائید اسلام کے جواب میں لکھا تھا آخری چند لائنیں سرسید کے ظریفانہ جواب کا عمدہ نمونہ ہیں۔

> وہ جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھیگا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور یعنی غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہرا اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب ہی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہو گا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں حج کے بعد تو پاک ہو ہی جائیں گے ...... مگر جناب سید الحاج کو معلوم ہونا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کر دوں معاف نہیں ہو سکتے پس متقاضائے ایمان یہ ہے کہ آپ حج در احمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیئے ورنہ روز جزا

اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ ملے

وہ تمام الزامات جو مولانا علی بخش خاں نے سرسید اپنی کتاب "تائید اسلام" میں لگائے سرسید ان کو محض تہمت قرار دیتے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے خیالات پر جو سرسید کے بارے میں انہوں نے جمالئے تھے ڈٹے رہے کہ نہیں حضور جو ہم کہہ رہے ہیں کہ آپ کے اعتقادات ایسے اور ایسے ہیں وہ صحیح ہے:

"ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزماں محمد رسول اللہؐ کے سوا بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں ...... کتاب اللہ کے علاوہ انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے ہم سچے خدا ِ واحد کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہؐ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں پھر وہ لوگ ہم کو ملحد زندیق اور لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔"

دراصل دنیائے اسلام اور خاص طور سے ہندوستان میں ہم نے رسولؐ اور قرآن کے علاوہ بہت سے دینی علماء کرام کو اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو خدا اور قرآن کا درجہ دیدیا ہے کہ ان سے اتفاق نہ کرنا خدانخواستہ اسلام سے اختلاف سمجھا جاتا ہے۔ سرسید نے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا اور نتیجتاً کافر اور ملحد قرار پائے۔

سرسید کو ان الزامات کا مطلق افسوس نہ تھا مگر اسلام کے نام پر جھوٹ اور مکر و فریب پھیلانے پر وہ افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے۔

"مگر طرفہ تماشہ یہ کہ ہم کو کرسٹان بھی کہتے ہیں ...... ہم کو اپنی قوم کے حال پر

ملے بحوالہ حیات جاوید صہ ۵۴۴

نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اعلانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم و حیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹادی ہے اس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا مگر جو رنج و غم و افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہے۔[1]

سرسید کے خلاف فتوے

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا سرسید عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں ان کے نزدیک کوئی برائی نہ تھی لیکن اس کے برخلاف دینی علماء کرام کا یہ حال تھا کہ انگریز سے اگر ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو جب تک اس کو رگڑ رگڑ کر دھو نہ لیتے نجس خیال کرتے تھے۔ انگریزوں کے مقابلہ میں کتوں اور جانوروں تک کو اچھا خیال کرتے تھے۔ سرسید نے قرآن و حدیث اور فقہی روایات کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ عیسائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا چاہے انہیں کا ذبح کیا ہوا ہو سراسر جائز ہے بشرطیکہ دسترخوان پر شراب اور خنزیر کا گوشت اور کوئی دوسری حرام چیز نہ ہو۔ اس میں انہوں نے شاہ ولی اللہ کے فتویٰ سے بھی استدلال کیا تھا۔ یہ خیالات بالکل نئے تھے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ مولوی امداد علی نے سرسید کے رسالہ "احکام طعام اہلِ کتاب" کے رد میں رسالہ "امداد الاحتساب" تالیف کیا اس میں انہوں نے سرسید کے خیالات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی اس کے علاوہ ایک مختصر رسالہ 'مظاہر الحق' لکھا اس کا مقصد مؤلف کے الفاظ میں:

"سید امداد علی اکبر آبادی کہتا ہے کہ جناب سید احمد خاں صاحب نے 'احکام طعام اہل کتاب' میں جو مداہنت کا کام فرمایا تھا اس خیر خواہ انام نے

---

[1] (بحوالہ حیات جاوید ص ۵۴۶)

'امداد الاحتساب' میں بشرح لبسیط اس مداہنت کو ظاہر کیا۔ اب یہ رسالہ بطرز مختصر کہ نام اس کا تاریخی 'مظاہر الحق' ہے منع مواکلت میں ساتھ اہل کتاب کے عام فہم لکھا جاتا ہے اور اس میں بیان کرنا چند اغلاط جناب سید احمد خاں صاحب کا اس مراد سے کہ لوگ علم اور فضل ان کا اور بے احتیاطی ان کی دریافت کر کے 'احکام طعام اہل کتاب' میں دھوکہ کھائیں،،لہ

۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اپنے تعلیمی خیالات نیز مذہبی خیالات کہ جن کی وہ ضرورت محسوس کرتے تھے، کا اظہار کرنا شروع کیا۔ یہ رسالہ ان کی تحریک کا ترجمان تھا اس کی مخالفت میں بہت سے پرچے نکلے اس میں ایک 'نورالآفاق' پندرہ روزہ پرچہ تھا اس کا اولین شمارہ ۳۰ر اگست ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی غرض وغایت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی تھی :

،، ان دنوں ہندوستان میں ایک قرن شیطانی ہوا جس کے سبب سے عجیب فتنہ ہو پیدا ہوا۔ درِالحاد بار ہوا۔ دنبالۂ زمادقہ دراز ہوا۔ عملی پنے کی عادت کے ساتھ سیرت انبیاء کی اہانت ہونے لگی۔ بہ تحریف کتاب سنت ائمہ دین پر بغاوت ہونے لگی۔ شعار اسلام رسوم کفر قرار دیئے گئے گمراہی کے طریقے ٹھیٹ اسلام شمار کیے گئے۔ الحادی باتوں کے شائع کرنے کو ایک نیا پرچہ ایجاد کیا اور بمصداق مصرعہ برعکس نہند نام زنگی کافور 'تہذیب الاخلاق' نام نہاد کیا۔ پس حامیانِ اسلام کی طرف سے جوابِ شبہات ان ملاحدہ کا قلم بند ہونا اور اس کا شائع ہونا مناسب ہوا،، ؎۲

اس وقت کے دینی علماء کرام کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ سرسید دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں۔ سرسید کے کفر و ارتداد کے مجموعی طور سے تین فتوے ہیں جن پر ہر طبقہ فکر کے دینی عالموں نے اپنی رائے زنی فرماتے ہوئے سرسید کے کفر پر سند دی ہے :

لہ (بحوالہ نامورانِ علی گڑھ صہ ۲۱۹) ؎۲ ایضاً

"مولوی امداد علی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کئے تھے ان میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے کہ نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہتا ہے اس میں چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے کہ نہیں؟ اور تیسرا اس تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت جس میں مصنف نے آنحضرتؐ کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور نا ملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد علی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام "امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق" ہے چھاپ کر اس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سنی کیا شیعہ کیا مقلد کیا غیر مقلد کیا وہابی کیا بدعتی سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سنی مولویوں نے بہت شرح و بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔" [۱]

ان فتووں میں سرسید کے مدرسہ کی مخالفت کرنے کے لیے دینی مدارس سے تقابل کیا گیا تھا اور چونکہ دینی مدارس سے یہ فتوے دیئے گئے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔ ذیل میں دیئے گئے اقتباسات پر غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح سرسید کے تعلیمی مشن کو دینی مدارس کے مدمقابل کھڑا کیا گیا ہے:

پہلا فتویٰ کیا فرماتے ہیں علماء شرع شریف کہ ان دنوں میں بعض مسلمانوں نے

---

[۱] حیات جاوید، ۵۴۷

واسطے تعلیم علوم دینی و علوم دنیاوی مسلمانوں کے ایک مدرسہ قائم کرنا تجویز کیا ہے اور جو جو علوم اس میں پڑھائے جاویں گے اور جس طرح کہ مدرسوں اور طالب علموں کو تنخواہ ملے گی اس کی تجویز انہوں نے چھاپی ہے جو نسخہ اس سوال کے ساتھ مرسل ہے۔ پس پہلا سوال یہ ہے کہ ایسے مدرسہ کا قائم و جاری ہونے کے لیے عموماً چندہ دینا یا اس طرح پر خاص کر کے چندہ دینا کہ ہمارا روپیہ خاص فلاں علم کی تعلیم میں صرف ہو اور فلاں علم کی تعلیم میں نہ صرف کیا جاوے شرعاً درست ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تجویز میں جو علوم پڑھانے مندرج ہیں ان میں سے کون سے علوم ایسے ہیں جن کے پڑھانے کے لیے مسلمانوں کو چندہ دینا جائز ہے اور کون سے ایسے ہیں جن کے لیے جائز نہیں تم۔ لہ

پورے سوال میں کہیں بھی سرسید کے اعتقادات کا ذکر نہیں آیا صرف یہ پوچھا گیا ہے کہ فلاں فلاں علوم جو مدرسہ میں پڑھائے جانے تجویز ہیں اس کے لیے چندہ دینا جائز ہے؟

دوسرا فتویٰ

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدارس کو جن میں علومِ دین اور ان علوم کو علم دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتی ہے جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کانپور لغو اور برا کہتا ہے اور ان مدارس کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور پر تجویز کرنا چاہتا ہے اور اس شخص کا یہ حال ہے کہ صدہا امور کو بموجب آیات اور احادیث اور روایات فقیہ باتفاق اہل اسلام ہیں ناجائز ہیں دین کے پیرایہ میں رواج دیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس شخص کے افعال اور اعتقادات پر اعتماد نہیں ہے۔ پس اس مدرسہ کے لیے جو اس شخص کو

لہ (بحوالہ ناموران علی گڑھ ص ۲۱۹)

اہل اسلام سلف وخلف کے امور مذہبی میں مخالف ہے۔ اپنے طور پر ایک مدرسہ فندمیں مدارسِ اسلامیہ قائم اور حال کے تجویز کرنا چاہتا ہے اور ان میں کچھ علوم دنیاوی اور کچھ علوم مذہبی اپنے طور پر تعلیم کرانا اس کو منظور ہے مسلمانوں کو ایسے مدرسہ میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟" (ایضاً)

تیسرے فتوے میں سرسید کے اعتقادات کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا گیا ہے اور پوچھا گیا ہے کہ ایک شخص جس کے ایسے اور ایسے عقیدے ہوں اس کی اعانت کرنا اور جاری کرنا ایک مدرسہ بواسطے تعلیم ہندوستان کے مسلمانوں کے جائز ہے کہ نہیں۔

فتوے دینے کا غلط طریقہ

ان سوالات کے جواب پورے ہندوستان کے ہر طبقۂ فکر کے دینی علماء کے پاس سے منگوائے گئے اور سب نے فیصلہ دیا کہ ایسے کسی مدرسہ کی اعانت کرنا ناجائز ہے اور ایسے عقائد والا شخص کافر ہے۔ کمال یہ ہے کہ کسی بھی استفتے میں سرسید کا نام کہیں نہیں آتا۔ بس یہ لکھا جاتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے عقائد ایسے اور ایسے ہیں اس کے بارے میں دینی علماء کا کیا خیال ہے۔ اور جب خیال صریح کفر کی شکل میں سامنے آتا ہے تو اس شخص پر چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ فتویٰ تو سرسید کے لیے آیا ہے۔ کیسا عجیب و غریب طریقہ ہے کہ جس شخص پر الزام لگایا جا رہا ہے اس کا نام تک نہیں لکھا جاتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سراسر انصاف کے خلاف ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کے عقائد غلط ہیں اور اس بنیاد پر اس پر اتنا بڑا الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہی نہیں رہا اور تمام زمانے اور قوم میں اس کو ذلیل کیا جا رہا ہے اس شخص سے کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ آپ پر یہ الزامات ہیں آپ کیا کہتے ہیں ان کے سلسلہ میں۔ دنیاوی عدالتوں تک میں یہ رواج ہے کہ جس شخص پر الزام لگایا جاتا ہے اس کو بلا کر پوچھا جاتا ہے اور اپنی صفائی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے پھر دونوں پارٹیوں کا نقطۂ نظر سن کر فیصلہ دیا جاتا ہے۔ یہاں آج تک انتہائی غیر منصفانہ طریقہ رائج ہے کہ بس انسان کا نام نہ لکھ کر اپنی طرف سے اس کے عقائد درج کر دیئے جاتے ہیں اور ان عقائد کی بنیاد پر فتویٰ حاصل کر کے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کے لیے یہ فتویٰ آیا ہے کیونکہ اس کے عقائد ایسے ہیں

اب وہ بے چارہ لاکھ کہے۔ کہ میرے عقائد ایسے نہیں ہیں یا مجھ سے انکوائری تو کی گئی ہوتی۔ کوئی نہیں سنتا۔ بس فتویٰ آ گیا اور بعد کو اس شخص پر جس کو کہ بدنام کرنا مقصود ہے جاری کر دیا گیا۔ بعینہ یہی سرسید کے ساتھ ہوا۔ کسی عالم فاضل نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ ان الزامات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ حالانکہ سرسید نے اور محسن الملک نے ان الزامات کے جوابات پوری تفصیل سے تہذیب الاخلاق میں چھاپے۔ مگر کون سنتا ہے۔ خدا اور رسولؐ شریعت اور قرآن پورا استحقاق اور دین کے پورے حقوق بنام دینی علماء کرام ضبط ہو چکے ہیں چاہے جس کو کافر بنا دیں ملحد بنا دیں اور دوزخ کا حکم سنا دیں اور چاہے جس کو امام الہند اور نائب رسولؐ بنا دیں۔ سرسید نے اپنے کئی مضامین میں جیسے کہ "دافع البہتان" اور "حال خود دیاران خود" اور محسن الملک نے اپنے مضامین "تکفیر مسلمان" اور "سوال و جواب" میں خصوصیت کے ساتھ اور پوری تفصیل سے ان الزامات کے جواب لکھے ہیں جو ان پر لگائے گئے۔ "حال خود دیاران خود" مضمون میں سرسید لکھتے ہیں

"پرانے دل تو بعضے ہم کو برا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو برا کہنے میں نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے۔ ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے ان کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے ان کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں ان کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے....

ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمد رسول اللہ صلعم کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے ان کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی دیا گیا کوئی آرہ سے چیرا گیا کوئی جلا وطن کیا گیا بس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہئے تھا اس کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہوا۔"[۱]

[۱] (بحوالہ حیات جاوید ۵۴۵)

ان استفتے کے جواب میں علماء حضرات نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے چند فقرے بطور مثال ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

"......معاونت کرنی ایسے طلبار کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حالِ بد اس سوال میں مذکور ہے، بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرہ حیوانیت میں داخل ہوتا ہے...... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور للٰہ سمجھنا اپنے مال کا خیالِ خام ہے، نادان یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں۔ پس مرد دیندار بلکہ تمام سنی و شیعی و خارجی و سائر ہنود و تمامے سکنائے اہلِ زمین پر واجب ہے کہ ایسے کلام واہی...... پر عقیدہ اپنا نہ جماویں،،[1]

حیرت ہوتی ہے کہ تمام ساکنان اہلِ زمین پر مع ہندوؤں کے یہ واجب کیسے ہوگیا کہ ایسے مدرسے کی مدد نہ کریں۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں پر بھی یہ فرض شرعی عائد کر دیا کہ وہ ایسے مدرسے کی مدد نہ کریں۔ مسلمان تو خیر آپ کا فتویٰ مان لینگے لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں پر بھی پابندی لگانے کی کوشش کرنا عجیب تر ہے۔ ان کے مذاہب کو اس مدرسے سے کیا خطرہ ہے؟۔ اسی طرح مولوی عبدالحیٔ صاحب فرنگی محل جو ایک نامور عالم تھے فرماتے ہیں کہ:

"وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر ان کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں

---

[1] حیاتِ جاوید صـ۲۴۷)

...... وجود آسمانی منصوصِ قرآنی ہے منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے..... مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر متشرع اور متدین کو اس کے قبول سے ابا ہے...... ہر مسلمان کو حق جل شانہٗ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسد ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مجذب دین ابلیس لعین کے وسوسے سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسہ جدیدہ فسا شریعت اس کی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں..... ایسے شخص کی معاونت اقامت مدرسہ میں کہ فی الحقیقت وہ مدرسہ نہیں بلکہ مفسدہ ہے حرام ہے........ اگر احیاناً اس شخص نے کوئی مدرسہ قائم کیا تھوڑے عرصہ میں دین محمدی میں فتور واقع ہو جائے گا اور تمام انتظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا ہر شخص کو لازم ہے کہ ایسے شخص کی معاونت سے اجتناب کرے۔ لے

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ان تمام الزامات کا جواب سرسید اور محسن الملک کی متفرق تحریروں، اور خاص اسی مقصد کے تحت لکھے گئے مضامین میں تفصیل سے ملتا ہے ان تمام کا جواب لکھنا یہاں ضروری نہیں صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں: تاکہ ان الزامات کی حقیقت کا قارئین کو اندازہ ہو سکے۔ سائینٹفک سوسائٹی نے انگریزی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی تحریک شروع کی تو اس کے تحت الفنسٹن کی ہسٹری آف انڈیا، کا ترجمہ بھی اردو میں کیا گیا۔ انگریز مصنف نے مسلمانوں کی تاریخ میں رسول اللہؐ کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا۔ اور وہاں آپ کی نسبت نعوذ باللہ۔ پیغمبر باطل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ لہٰذا ترجمہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال پر بھی مولوی امداد علی نے سرسید پر کفر کا فتویٰ

لے (بحوالہ ناموران علی گڑھ صہ ۲۳۰)

عائد کیا اور مضمون کے آخر میں لکھا کہ "جس شخص نے ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے"۔ سرسید نے اس کا جواب اس طرح لکھا کہ "مجھ میں اور امداد علی میں کیا فرق رہ گیا اگر صرف لکھنے سے ہی انسان کافر ہو گیا۔ کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا ہے اور انہوں نے اردو سے"۔

قتل واجب ہے

تمام علمارِ ہندوستان کا اجماع اس پر ہو گیا تھا کہ سرسید کافر ہیں بلکہ ابلیس لعین ہیں۔ بہر حال یہ بھی عام مسلمانوں کے لیے مقامِ شکر ہے کہ تاریخ میں پہلی بار تمام فرقوں کے دینی عالموں کو متفق دیکھا گیا کیا سنّی وہابی۔ بدعتی، شیعہ، خارجی، اہلحدیث حتیٰ کہ قادیانی سبھی۔ ہم یہ بھی سرسید کی ذات کا کرشمہ سمجھتے ہیں کہ ہر دم باہم دست و گریباں رہنے والے حضرات کلیتہً اس مسئلہ پر متفق ہیں اور ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دینی علمار حضرات ہمیشہ لڑتے ہی نہیں رہے ہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جس میں یہ معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ بات صرف انسانوں تک ہی محدود نہ رہی تھی بلکہ بقول حالی:

> "صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی بھی پوری کر دی"۔[۱]

لہٰذا اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ مدینہ میں جا کر چاروں فقہوں کے عالموں سے سرسید کے کفر پر مہر لگوائی اس استفتے کا ملخص یہ ہے:

> "اس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ بشئہ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفۂ جدیدہ کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کئے ہیں بے فائدہ ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر سئہ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب

---

[۱] (حیات جاوید صفحہ ۵۵)

دینیہ میں ایسے مضامین انتخاب کئے جائیں جو فلسفۂ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں اور جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا اور اس کی اعانت سے انکار کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آوں گا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اسی کے گروہ کے ہیں اور ان کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہے پس ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس کی اعانت کرنا جائز ہے کہ نہیں ہ،،[1]

اس کا جواب چاروں فقہوں کے علماء نے الگ الگ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے:

"یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیتِ اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں جہاں تک قدرت ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے مخالف ہو،،[2]

مدرسے کے انہدام کی بات بہت خوب ہے قابل غور بات ہے کہ اسی طرح کے مدرسہ مکہ اور مدینہ میں اب قائم کئے جارہے ہیں نہ صرف قائم کئے جارہے ہیں بلکہ بڑی بڑی یونیورسٹیاں بن گئے ہیں ان علماء کرام کے جانشیں شاید اب وہاں نہیں ہیں ورنہ ان مدرسوں کے انہدام کا فتویٰ آج بھی ضرور دیتے۔ شاید اب نئی تعلیم سے کفر و الحاد جاری نہیں ہوتا کہ یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں سے لے کر ہندوستان سے مشرکین تک کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر بلایا جاتا ہے کہ للہ ہماری نسلوں کو پڑھاؤ کہ یہ جاہل رہے جاتے ہیں علم زندگی ہے خوشی ہے اسلام کی سربلندی کا احساس علم سے پیدا ہوتا ہے کچھ لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں آج

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۵۵۲ [2] حیات جاوید صفحہ ۵۵۲

شاہان سعودیہ بلکہ دنیائے اسلام کے تمام سربراہان اسی تعلیم کو پھیلا رہے ہیں جس کو سرسید نے سو سال پہلے رائج کرنا چاہا تھا۔ اب وہ مفتیانِ کرام کہاں ہیں؟

سرسید ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور عام طور سے اپنے مخالفین پر برگشتہ نہیں ہوتے تھے اور نہ الزامات کا جواب دینا ضروری خیال کرتے تھے مگر جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا تھا تو مجبوراً جواب بھی دیتے تھے۔ مولوی علی بخش خاں جو مکہ مدینہ سے فتوے لے کر آئے تھے ان کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج نصیب ہوا ان کے لائے ہوئے فتوے ہم بھی دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی بنا دے اور کسی کو پاجی اور کسی کو کافر کسی کو مسلمان بنا دے"[۱]

مدینہ کے شیخ محمد امین پابی مسلک حنفیہ کے مفتی تھے انہوں نے سرسید کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا:

"جو کچھ در مختار اور اس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا..... اہل مذہب حنفی کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور گمراہیوں سے رجوع کیا اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لیے اور ولاۃ پر واجب ہے کہ ایسا کریں"[۲]

آخری سزا سرسید کی تجویز ہو گئی۔ سرسید اور مفتی صاحب دونوں دنیا سے اٹھ

---

[۱] (بحوالہ ناموران علی گڑھ صفحہ ۲۲۵) [۲] (حیات جاوید صفحہ ۵۵۲)

گئے مگر دنیا نے دیکھا کہ اسی طرح کے ادارے مکہ و مدینہ میں آج قائم کئے جا رہے ہیں جو سرسید نے چاہے تھے اور کوئی فتوے دینے والا دنیا میں نہیں ہے حتیٰ کہ یورپ اور امریکہ تک سے ماہرین کو بلایا جا رہا ہے کہ علم پھیلائیں۔

سرسیّد کی مصالحانہ کوشش

باوجودیکہ شدید مخالفتوں اور توہین آمیز رویہ کے جو سرسید کے تئیں دینی علمار کا تھا سرسید نے آخر تک مصالحت کی کوششیں جاری رکھیں اور علماو وقت سے خط وکتابت اور صلح صفائی کا سلسلہ چلتا رہا۔ واضح ہو کہ یہ پیش قدمی ہمیشہ سرسید کی طرف سے ہوئی۔ مدرسہ بننے کے وقت علما نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ چونکہ سرسید گمراہ عقائد کے حامل ہیں اور دینی تعلیم مسلمان بچوں کے لیے ایک ضروری مضمون مدرسہ میں رکھنا چاہتے ہیں لامحالہ اس مضمون میں ایسی کتابیں پڑھائی جائیں گی جس سے طلبار کے عقیدہ میں بگاڑ آنا لازمی ہے لہٰذا مدرسہ کی مخالفت اور زیادہ زور وشور سے حمیت اسلامی کے نام پر کی جاتی رہی سرسید نے اس سمت میں بہت بڑی پیش قدمی کی اور دینی تعلیم کا شعبہ اس وقت کے دینی علمار کے اختیار میں دیدینے کا فیصلہ کر لیا کہ اس طرح علمار اور مسلمانوں کے ذہن سے اس بڑے خطرے کا ڈر نکل جائیگا اور مسلمان مدرسہ میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں گے اس سلسلہ میں مولوی علی بخش خاں، سرسید اور محسن الملک کے درمیان ہوئی خط وکتابت سے کئی انکشافات سامنے آتے ہیں۔

پہلا یہ کہ دینی علمار اس مدرسہ کا مقصد سرسید کے مذہبی عقائد کی تشہیر سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ سرسید اپنے گمراہ عقائد کو پھیلانے کے لیے یہ مدرسہ قائم کر رہے ہیں۔ مولوی علی بخش جو اس گروہ کے سرغنہ تھے سرسید کو لکھتے ہیں:

"یہ امر مخفی نہیں رہا کہ جناب والا کے خیالات مذہبی عموماً اہل اسلام کے خلاف

ہیں اور ابتدائے اجرائے تہذیب الاخلاق سے ایک مدرسہ انہیں خیالات کے ترویج کی خاطر صراحتاً کنایتاً بعض تحریرات میں آپ نے ضروری قرار دیا ہے۔..... جب ہم لوگ خود ہی بنا و ایک ایسے مدرسہ کی قائم کریں گے یا اس میں شریک ہو کر چندہ دیں گے اور عمر اس کی تائید کے واسطے بنیں گے جس میں ہمارے مذہب کا استحصال یا انقلاب ہو جانے کا خطرۂ عظیم ہو اور ہماری نسل میں جو لوگ پیدا ہوں گے وہ اس طریقہ پر قائم ہو جائیں گے جس کی ہدایت تہذیب الاخلاق میں ہے اور جس کو آپ رحمت خدا کی سمجھ کر یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ضرور زمانہ اس کو قبول کرنے کا آئے گا..... اگر واقعی خدا تعالیٰ کے موافق مرضی ہمارا ہی مذہب ہے (اور یقیناً ایسا ہی ہے) نہ آپ کا مذہب تو ایسا مدرسہ اور اس کی شرکت قیامت ہے۔[۳۱]

مولوی علی بخش خاں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اس مدرسہ میں سرسید کے عقائد کے موافق کتابیں پڑھائی جائیں گی جس سے کہ موجودہ دینی طریقۂ تعلیم کی مخالفت ہونے کا خطرہ ہے ان کی نظر میں یہ طریقۂ تعلیم خدا اور رسولؐ کی مرضی کے عین مطابق تھا اور سرسید کا مدرسہ اس کے برخلاف۔ مولوی علی بخش خاں نے سرسید سے جاننا چاہا کہ آیا ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی آگئی ہے؛ اگر ایسا ہے تو سرسید کو اس امر کا اعلان کرنا چاہیئے۔

"اگر آپ کی رائے پلٹ گئی ہے اور تعلیم مذہبی موجودہ زمانۂ حال آپ کے نزدیک عمدہ اور ناقابل تبدیل ہے اور اس سے جو اثر مسلمانوں کے دلوں میں ہوتا ہے اور ہوگا وہ مرضی خدا اور رسولؐ اور موافق شریعت ہے اور آپ نے اپنی رائے سے رجوع فرمایا ہے تو صاف ارشاد ہو جائے کہ گو ہمارے سابقہ خیالات کیسے ہی کیوں نہ تھے مگر جمہور اہل اسلام کے

---

[۳۱] (یوسف حسین: علی گڑھ آرکاوز ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری صفحہ ۱۵۲)

ساتھ اب ہم کو موافقت ہے اور ہم خیالات سابقہ سے تائب ہو گئے ہیں ،،

(ایضاً)

علی بخش خاں کو مدرسہ کی مینجنگ کمیٹی پر شدید اعتراضات تھے وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہ کمیٹی ایسے ہی لوگوں سے بھری ہے جو سرسید کے ہر طرح سے ہمنوا ہیں لہٰذا دینی تعلیم جو اس مدرسہ میں ہوگی وہ سرسید کے عقائد کے موافق ہوگی

"اہل اسلام کو کیوں کر یقین کامل ہو کہ کمیٹی بالاتفاق ان امور کے ترویج و تعلیم کو منع کرے گی جو آپ کی خواہش قلبی کے خلاف نہیں ہیں اور اگر اس کمیٹی کے ممبران نے اختلاف بھی کیا تو کس کام آئیگا،، (ایضاً)

سرسید نے اس خط کا بہت معقول جواب مولوی علی بخش خاں کو بھیجا جس میں اس تجویز پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا کہ ایک کمیٹی الگ سے دینی تعلیم کی نگہداشت کے لیے قائم کی جائے اور وہ کمیٹی پوری طرح سے مختار ہو کر دینی تعلیم کا جو چاہے نصاب قائم کرے۔ سرسید نے اس کمیٹی کی ساری ذمہ داری اپنے سب سے بڑے مخالف مولوی علی بخش خاں کو سونپنے کی پیش کش کی یہاں تک کہ اس کمیٹی کے ممبران بھی مولوی علی بخش خاں کی مرضی سے بنائے جانے کی تجویز رکھی لکھتے ہیں کہ:

"اگر میرے عقائد جیساکہ آپ خیال فرماتے ہیں کفر و ضلالت ہیں تو قومی ہمدردی اور محبت کا مقتضا یہ ہے کہ آپ اپنے اوقات خاص میں میرے حق میں دعا فرمادیں .... بہرحال اب مدرسۃ العلوم میں آپ کا مددگار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ میرے عقائد کی مداخلت کا اندیشہ جس کو آپ خلاف شرع سمجھتے ہیں اور کمیٹی کی دست اندازی کا خوف مسائل مذہبی میں نہ رہے اور اس کے رفع کرنے کے لیے یہ تجویز فرماتے ہیں کہ کمیٹی خزینۃ بضاعت تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور ایک کمیٹی جس پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو امور متعلقہ تعلیم مذہبی کے لیے مقرر کی جائے میں نہایت خوش دلی سے جو امر کہ آپ نے پیش فرمایا ہے اس کو منظور کرتا ہوں اور

مجھ کو کامل یقین ہے کہ کمیٹی کے کسی ممبر کو بھی اس میں کچھ عذر نہ ہوگا..

......پس جو ہدایت آپ نے فرمائی ہے اس کو میں دل سے قبول کرکے یہ عرض کرتا ہوں کہ جو طریقہ تعلیمی کمیٹی میں پیش ہوا ہے اس میں ایک دفعہ اور بڑھائی جائے اور خاص مذہبی تعلیم کے لیے ایک جداگانہ کمیٹی مقرر ہو جس کے ممبروں کی تعداد اس قدر ہو جس قدر کہ آپ تجویز کریں اور ان کا انتخاب بھی ابتداً صرف آپ کی رائے پر اور جس کو آپ اپنا شریک کرنا چاہیں اس کی شرکت رائے پر منحصر ہو اور جو ممبر اس کمیٹی کے مقرر ہوں وہ لائف ممبر اس کمیٹی کے ہوں تاکہ آئندہ کسی شخص اور کسی کمیٹی کو ان کی نسبت کچھ اختیار باقی نہ رہے اور یہ قاعدہ تجویز ہو کہ کوئی عہدہ اس کمیٹی کی ممبری کا خالی ہو تو باقی ممبران موجودہ کسی دوسرے شخص کو اپنی تجویز سے بلا مداخلت کسی اور کے خود مقرر کریں اور تمام امور متعلقہ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت و سلسلۂ کتب درسیہ مذہبی اور تقرر مدرسان کا اس کے لیے اور تمام امور جو تعلیم مذہبی سے علاقہ رکھتے ہیں اس کمیٹی کی رائے پر منحصر ہو اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کو یا مجھ کو کبھی اس میں مداخلت نہ ہو،، [1]

یعنی سرسید نے دینی علماء سے مصالحت کی کوشش میں یہاں تک ان کو اختیار دے دینا چاہا کہ مولوی علی بخش خاں خود دینی تعلیم کمیٹی کے ممبران کو چن لیں اور وہ ممبران لائف ممبر ہوں یہ کمیٹی ایسی بااختیار ہو کہ مدرسین کا تقرر و کتابوں کا تعین و نصاب تعلیم سب کچھ اس کمیٹی کے اختیار میں ہو یہاں تک کہ اس کمیٹی کے کاموں میں خود سرسید کو بھی مداخلت کرنے کا کچھ اختیار نہ ہو۔ ان قانونی تبدیلیوں کے لیے سرسید نے فوراً عملی قدم اٹھایا اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے ممبران کے پاس اس بارے میں اپنی رائے لکھ کر بھیجی اور ان کی منظوری حاصل کر لی۔

---

[1] (ایضاً صفحہ ۲۶۱)

"..... دو ممبر کمیٹی کے اس وقت یہاں موجود ہیں ان کے دستخط منظوری
کے میں نے اس پر ثبت کرالئے ہیں اور ممبروں کے پاس بھی میں ان خطوط
کی نقل بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں مگر اب آپ بخوبی سمجھ لیجئے کہ
اہل سنت وجماعت کی تعلیم کا بوجھ اور اس کی کمیٹی کے ممبر مقرر کرنا یہ
سب آپ کے سر ہے اور اب آئندہ سے آپ اس کے ذمہ دار ہیں اور
علاوہ اس کمیٹی کی ممبری کے آپ کو کمیٹی خزینتہ البضاعتہ کا بھی ممبر مقرر
کریں گے تاکہ اس میں جو کچھ غلطی ہو اس میں آپ کی ہدایتوں سے فائدہ اٹھائیں"

(ایضاً)

یہ سرسید کی قربانی اور خلوص کی انتہا تھی کہ جو شخص سرسید کی مخالفت میں اس قدر شدید تھا کہ ان کے واجب القتل ہونے تک کے فتوے لے کر آیا اسی شخص سے مصالحت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ کمیٹی کی ممبری تک پیش کر دی علاوہ اس کے دینی تعلیم کا پورا انچارج بھی بنا دیا مگر اتنے پر بھی دینی علماء کا طبقہ سرسید کا مخالف ہی رہا اور کسی طرح بھی قومی ہمدردی کے کام میں ہاتھ بٹانے پر راضی نہ ہو سکا جب سرسید کی یہ تجاویز محسن الملک کو پہنچیں تو انہوں نے مولوی علی بخش خاں کی شرکت کو امید موہوم قرار دیا۔ محسن الملک کا خیال تھا کہ علی بخش خان کی تجاویز کو ماننا اس امر کے مترادف ہے کہ سرسید اور کمیٹی کے سارے ممبران نے اپنے کافر ہونے پر اقرار کر لیا اور دینی علماء کو صحیح مان لیا۔ سرسید کو لکھتے ہیں:

"جناب مولوی علی بخش خاں کے خط پر جو رائے آپ نے دی ہے وہ
آپ ہی کا کام ہے اور کوئی مسلمان ممبر مجلس خزینتہ البضاعتہ کا تو آپ
کی رائے سے غالباً اتفاق نہ کرے گا اس لیے کہ ہر لفظ سے مولوی صاحب
موصوف کی نہ صرف آپ کے کفر و ارتداد پر اشارہ ہوتا ہے بلکہ تمام ممبران
کمیٹی اور معاونان مدرسہ کی بد دینی اور بے ایمانی پر ملکہ کے فتوے کو
سند پیش کی جاتی ہے میری غیرت اور حمیت اس بات کو قبول نہیں کرتی
کہ ایسی حالت میں اپنا کفر و ارتداد قبول کر کے اور تمام مسلمانوں کو

جواب تک ہماری کمیٹی میں شریک ہوئے ہیں کافر اور مرتد ٹھہرا کر ایک امید موہوم پر آپ کی رائے سے اتفاق کروں۔ آپ تو مدرسہ کے خیال میں قد شغفاحبا کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں اور دین و دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں مگر میں ہنوز اس درجہ پر نہیں پہنچا ہوں۔ میں یہ بات منظور کر سکتا تھا کہ مولوی علی بخش صاحب اس مجلس کے سکریٹری مقرر ہوں جو مذہبی تعلیم کے قواعد تجویز کرنے کے لیے مقرر ہو مگر بہ شرط کہ آپ اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ مذہبی تعلیم میں مداخلت نہ کرے جس سے شاید یہ مراد ہوگی کہ آپ اور کوئی ممبر کمیٹی کا استحقاق شرکت مجلسِ تعلیم مذہبی کا بوجہ کفر و ارتداد کے نہیں رکھتا مجھے منظور نہیں ؎

لیکن سرسید کے زور دینے پر کمیٹی نے متفقہ طور سے ان کی تجویز کو منظور کر لیا اور علی بخش خاں کو اس فیصلہ کی اطلاع دیدی گئی لیکن اس پر بھی مولوی علی بخش خاں نے مدرسہ کے دینی تعلیم کے شعبہ کی سربراہی سے انکار کر دیا کہ ان کا مقصد مسئلہ کا حل نہیں تھا بلکہ مخالفت برائے مخالفت کرنا تھی سو وہ اپنا کام پوری تندہی اور لگن سے کرتے رہے اور دینی علما کے قومی کام میں ہاتھ بٹانے کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔

(ایضاً صفحہ ۲۶۳)

سرسید کے سیاسی نظریات

و کارنامے

یہ خیال عام کیا گیا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے صرف اور صرف تعلیمی ترقی کی کوششوں کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس خیال میں ایک بہت بڑی خرابی اور غلطی مضمر ہے۔ پہلی تو یہ کہ لفظ سیاست کے معنی سمجھنے میں عام طور سے غلطی کی جاتی ہے اور دوسرے علم حاصل کرنے کے مقاصد سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے۔ سیاست جو آج کل کے معنی میں مستعمل ہے یقینی طور سے ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں ایک ناخوش گوار عمل ہے اور ہر شریف انسان سیاست کی گندگیوں سے بچنا اور اپنے دوستوں کو بچانا چاہے گا لیکن اگر صحیح معنوں میں سیاست کو سمجھا اور برتا جائے تو یہ ایک قابلِ تحسین فعل ہے اور قوم کو باعزت بنانے کا ذریعہ ہے۔ سرسید کے تمام سیاسی اعمال اس بات کی طرف صاف نشاندہی کرتے ہیں کہ سیاست کا مقصد یہ ہے کہ اپنی قوم کو درپیش مسائل کو سمجھا جائے، اُن کے حل کی راہیں متعین کی جائیں، عام طور سے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی اصلاح کے لیے دوسری طاقتوں کی سازشوں کی بروقت اطلاع قوم کو دی جائے۔ اور قومی اتحاد کے ذریعہ اُن خطرات کا مقابلہ کیا جائے جو مسلمانوں کو درپیش آئیں۔ ان مسائل اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے تعلیم اور علم حاصل کرنا ازبس ضروری عمل ہے۔ لکھنؤ میں ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ تعلیم دینے سے میرا مقصد قوم کو قوم بنانا ہے۔

"اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو

قوم بنانے کی ہے۔،، ؎۱

یعنی تعلیم حاصل کرنے سے جو سمجھ اور دانشمندی حاصل ہو اس کا استعمال قومی مسائل کو سلجھا کر قوم کو باعزت بنانے کی کوششوں میں کیا جائے۔

سرسید کی تمام زندگی سیاسی اصلاحات جاری کرنے میں گذری۔ اسبابِ بغاوتِ ہند سے لے کر میرٹھ اور لکھنؤ کی تقاریر میں مسلمانوں کو کانگریس کے خطرات سے آگاہ کر کے اس سے مقابلہ کرنے کے لیے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن بنانے تک، دراصل ان کی تمام تحریکیں بشمول تعلیمی تحریک و مذہبی اصلاحات کی تحریک مسلمانوں کی سیاسی اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو دنیا میں باعزت اور طاقتور بنانے کی تحریکیں ہیں۔ بقول حالیؔ،

"اگرچہ بظاہر سرسید کے پولیٹیکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ ان کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ انہوں نے لکھا کہا یا کیا اس کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولیٹیکل اصلاح سے تعلق رکھتا ہے،، ؎۲

اسی طرح کے خیالات کا اظہار جذبیؔ نے بھی کیا ہے۔

"سرسید کی تحریک کے بارے میں مختلف رائیں ملتی ہیں کوئی اسے مذہبی سمجھتا ہے کوئی معاشرتی اور کوئی تعلیمی۔ ذاتی طور سے میں کچھ اس طرح سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک بڑی حد تک سیاسی تھی جسے مسلمانوں کے عام سماجی حالات نے پیدا کیا تھا۔ اس پر مذہب، معاشرت اور تعلیم کے جتنے دبیز یا ہلکے پردے پڑے ہوئے ہیں اس سے عموماً دھوکا ہوتا ہے۔،، ؎۳

بنیادی طور سے سرسید کی تحریک مسلم قوم کو پولیٹیکل بے وقعتی سے نکال کر حکومت میں دخیل بنانے کی تھی جو آگے چل کر خود حکمرانی کی دعویدار ہو سکتی تھی۔ سرسید کے انتقال پر اخبار پائنیر نے لکھا تھا کہ:

"سرسید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت

؎۱ (مجموعۂ لیکچرس صفحہ ۲۵۹) ؎۲ (حیات جاوید صفحہ ۵۰۸) ؎۳ (جذبیؔ: حالی کا سیاسی شعور ۲۴)

سرگرم حامی تھا اس کے انتقال کے ساتھ اس نہایت مفید بااثر اور
نہایت زبردست پولیٹیکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے موجودہ صدی کے
آخر ربع میں ہندوستان کی اسلامک دنیا کو متحرک کر دیا تھا۔،، لہ

علامہ شبلی کو اعتراف ہے کہ:

،، وہ پرزور دست و قلم جس نے اسباب بغاوتِ ہند لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ جانباز جو آگرے کے دربار سے اس لیے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر نہ تھیں۔،، ٢ہ

ہندوستانی مسلمان جس وقت تاریخِ ہندوستان کے سب سے قیامت خیز سیاسی تغیر کے شکار ہوئے اس وقت سرسید کی عمر چالیس سال تھی۔ غدر کے وقت سرسید بجنور میں تعینات تھے بجنور میں انہوں نے خود انگریزوں کا قتل عام دیکھا اور بدلہ میں انگریزی فوجوں کی انتقامی کاروائیاں دیکھیں۔ دہلی، مرادآباد، میرٹھ میں جتنے واقعات گذرے وہ ان کے عینی شاہد تھے۔

خود ان کا خاندان حتیٰ کہ ان کی والدہ تک اس سیاسی تغیر کا شکار ہو گئیں اور اس دوران انہیں تین دن تک پانی تک پینے کو نہ ملا اور کھانے کے نام پر گھوڑے کا دانہ کھانا پڑا۔ دہلی میں کوئی عزت دار مسلم خاندان نہ بچا غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں اور بہادر شاہ ظفر پر عائد ہونے کے سبب مسلمانوں پر وہ عتاب نازل ہوا جس کا دائرہ تحریر میں لانا بھی مشکل ہے۔ شہزادوں کے سر بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے جس پر ذرا بھی شک گذرا اس کو بغیر کسی مقدمہ کی کاروائی کے سرِعام سولی پر لٹکا دیا گیا۔

لہ (بحوالہ حیات جاوید ص۲۹۵) ٢ہ (بحوالہ نور الحسن نقوی: سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص۱۵)

ایسے وقت میں جب کہ دنیا کا ہر جرم مسلمانوں سے منسوب کیا جا رہا تھا سرسید نے مسلمانوں اور بالعموم تمام ہندوستانیوں کی خیر خواہی میں "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر ایک عظیم الشان سیاسی کارنامہ انجام دیا یہ ایک ایسا کام تھا جس میں ان کی جان بھی جا سکتی تھی۔ دوستوں نے سمجھایا بھی کہ جان خطرے میں نہ ڈالو مگر حق بات کہنے اور کر گذرنے کا جو جذبہ سرسید میں پایا جاتا تھا وہ عدیم المثال تھا جس کی بدولت سرسید نے بغاوت کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں پر سے ہٹا کر خود انگریزوں پر ڈال دی اور حکمرانوں کو عوام سے بے خبر اور ان کی بہبودی کے کاموں سے دور رہنے کا الزام لگایا اس کتاب سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو وائسرائے اور پریزیڈینسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شامل کیا گیا۔ برمنگھم ڈیلی گزٹ نے اس کتاب کا خلاصہ لکھ کر تحریر کیا تھا کہ،

"وہ ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی ویورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈینسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شریک کئے گئے۔" [۱]

اصلی سبب غدر کا جو سرسید نے تحریر کیا تھا ہندوستانیوں کا قانونی کونسلوں میں شریک نہ کیا جانا تھا جس کے سبب گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہو پاتے تھے۔ چنانچہ پہلی بار:

"جنوری ۱۸۶۲ء میں مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو وائسرائے کی کونسل میں شریک کیا گیا۔"

سرسید کی رائے میں انقلاب: اردو کا مسئلہ ۔ اس وقت تک سرسید کے ذہن میں

---

[۱] بحوالہ حیات جاوید ص ۲۲۵)

ہندو اور مسلمان کا جداگانہ مسئلہ نہ تھا اور وہ دل سے تمام ہندوستانیوں کی بھلائی چاہتے تھے اپنی اکثر تقریروں میں انہوں نے ہندو اور مسلمان کو دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی اور ہمیشہ آپسی نفاق سے بچنے کی صلاح دیتے رہے کہ دلہن بھینگی نہ ہو جائے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ:

"ہندوستان میں رہتے سہتے دونوں کا خون بدل گیا دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی اور نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصہ سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کر لیں تو در حقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار ہم وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔" لے

مگر یہی مشترکہ زبان آخر کار مستقل نزاع کا سبب بن گئی سرسید سمجھتے تھے کہ یہ زبان ہم دونوں نے مل کر بنائی ہے مگر ہندوؤں نے آج تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور ۱۸۶۷ء سے لے کر آج تک اس بات پر بضد ہیں کہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہے لہٰذا اس کو آزاد ہندوستان میں تو کیا غلام ہندوستان میں بھی جینے اور پھلنے پھولنے کا حق نہیں دینا چاہتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں اردو کے خلاف ہنگامہ آرائیاں ہندوستان میں ہندو سیاست اور مسلمان سیاست کی بنیاد بن گئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس کی بہت سی اور وجوہات کے علاوہ اہم وجہ یہ رہی کہ انگریزی تعلیم کی طرف ہندو بہت پہلے متوجہ ہو چکے تھے اور تاریخِ ہند میں جو اس زمانہ میں کیا بلکہ آج تک پڑھائی جاتی ہے نہایت تعصب سے مسلمانوں کے دور کو ظالمانہ رنگ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جس کی اس وقت بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی مسلمانوں کی طرف سے نفرت

لے لیکچر پٹنہ ۱۸۸۳ مجموعہ لیکچرز ص ۱۵۹)

تخم جم گیا اور رفتہ رفتہ وہ ایک نہایت تناور اور گھنا درخت بن گیا۔ تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کو نہایت تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ بقول حالی :

وہ جو عزت اور جاہ و منصب اور امورِ سلطنت میں شرکت تعلیم کے بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے اور واقعہ ، ۱۸۵۷ء نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ و امنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانے کہ دریا میں خاک کیوں اڑائی ہو اس سے دست و گریباں ہو جائے ،، لہ

لہٰذا شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں نے الٰہ آباد اور بنارس کو صدر مقام بنا کر جگہ جگہ اردو کو ہٹانے اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی تحریک چلائی :

چنانچہ لیفٹننٹ گورنر بنگال سے مل کر بہار اور بنگال سے اردو ہٹا کر بہاری زبان اور کیتھی حروف بہار میں اور بنگالی زبان بنگال میں جاری کرانے میں کامیاب رہے اردو کو ان دو بڑے علاقوں سے ایک طرح سے ختم کرنے کی شروعات کی داغ بیل ۱۸۶۸ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ سرسید کے اخیر زمانے میں ایک بار پھر الٰہ آباد اور بنارس کے ہندوؤں نے حکومت میں درخواست گذاری کہ ہندی کو نافذ کیا جائے۔

سرسید اس زمانہ میں مرض الموت میں مبتلا تھے اور بقول حالی ، مارے رنج والم و مایوسی کے ،، نقش دیوار ،، بن گئے تھے انہوں نے اس درخواست کے خلاف ایک لمبا مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کے انتقال سے ۹ دن پہلے چھپا اور اس طرح اس مرد مجاہد نے مرتے مرتے بھی قومی خدمت کا حق ادا کیا۔

لہ (حیات جاوید صفحہ ۱۳۸)

اردو کے خلاف محاذ آرائی

تین سال علی گڑھ میں رہنے کے بعد سرسید مئی ۱۸۶۷ء میں ترقی پاکر بنارس چلے گئے۔ بنارس کا قیام سرسید کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے ایک اثر چھوڑ گیا اور جو تجربات انہیں بنارس میں ہوئے اس سے ان کے دل میں یہ خیال جم گیا کہ اب ہندو اور مسلمان امن اور آشتی سے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔ آج تک فسادات کا سلسلہ ہندو اور مسلمانوں کے بیچ جاری ہے اور کسی بھی طرح صورت حال کے بدلنے کے آثار نظر نہیں آتے جب کہ اس صورت میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کا برابر کا نقصان ہے۔ قیام بنارس کے دوران سرسید کو اردو مخالف تحریک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کو ہیڈ کوارٹر بناکر یہ تحریک چلائی گئی کہ اردو کو سرکاری زبان کے درجے سے ہٹاکر اس کی جگہ دیوناگری رسم الخط والی ہندی زبان کو رواج دیا جائے اور بڑا شور و غوغا پورے شمالی ہندوستان میں مچایا گیا۔ اس تجربے سے پہلے اور بعد کو بھی سرسید نے جو کام بھی کیے وہ دونوں قوموں کی مشترکہ بھلائی کے لیے کیے حالانکہ اس سے پہلے راجہ رام موہن رائے کی خاص ہندوؤں کی اصلاح کی تحریک اور غدر میں ہندوؤں کا انگریزوں سے ملاپ دو ایسے اہم واقعات تھے کہ ان کا اثر ہر انسان پر پڑنا لازمی تھا مگر اس کے باوجود بھی سرسید نے صلح و آشتی کا راستہ نہ چھوڑا کیونکہ وہ تمام انسانوں سے بلا تفریق مذہب و ملت محبت کرنے والے تھے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ کچھ لوگ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان امن سے نہ رہ سکیں۔

"سرسید ہمیشہ اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مگر

بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔" [1]

ہم یہاں حالی کی زبان میں اردو ہندی کے تنازعہ کے متعلق ان کا مضمون نقل کرنا چاہتے ہیں جس میں کہ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت عبرتیں پوشیدہ ہیں جو قوم پرور مسلمان آج ہندوستان میں مسلمانوں اور خاص طور سے اردو کی زبوں حالی کی ذمہ داری تقسیم وطن پر ڈالتے ہیں (حالانکہ تقسیم وطن کی ذمہ داری بھی قوم پرور قیادت کے سر جاتی ہے) اور قیام پاکستان کو اصلی سبب قرار دیتے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ مضمون کافی ہے بشرطیکہ تعصب نے آنکھیں بند نہ کر دی ہوں۔ اس کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہمسایوں کے آج کے خیالات اور ڈیڑھ سو سال پہلے کے خیالات میں سر مو فرق نہیں ہے۔ اس وقت بھی اردو کو ختم کرنے کے لیے تحریکیں چلائی گئیں اور آج آزاد ہونے کے بعد اردو کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ انگریزی دور حکومت میں اردو کو ختم نہ کیا جا سکا مگر آزادی کی روشنی میں اردو اندھیروں میں ڈبو دی گئی آج یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اردو کو اس لیے نہیں زندہ رہنے دیں گے کہ اس نے پاکستان بنوایا، ۱۸۶۷ء میں کون سے پاکستان کا ذکر تھا یا آزادی کا ہی کوئی تصور تھا؟ قوم پرور مسلمانوں نے جن کے سردار مولانا آزاد رہے تھے حق اور انصاف سے ہمیشہ منہ موڑا اور نتیجتاً غلط بیانیاں کیں اور خلاف حقائق ایسی باتیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہنوں میں ڈالیں جن سے کہ ہندو مسلمان کا ٹکراؤ بڑھا گھٹا نہیں۔ ٹکراؤ میں ہندو مسلمان بلکہ ملک کسی کا بھی بھلا نہیں ہے سب کا نقصان ہے۔

جو زندہ رہیگا دیکھیگا [2]

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج تھیں۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان

---

[1] (حیات جاوید صفحہ ۱۳۷) [2] (مضمون حالی۔ حیات جاوید صفحہ ۱۳۷)

درخت ہو جائے. چنانچہ ایسا ہی ہوا.... اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا...... اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے.. اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس لیے مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی ۔

چنانچہ ۱۹۶۷ میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے :

"سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے. ان کا بیان ہے کہ ,, انہیں دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے. آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ ہندوستانیوں کی بھلائی کا ذکر کیا کرتے تھے میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ عناد اور مخالفت ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے. جو جو زندہ رہے گا دیکھے گا انہوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے. میں نے کہا مجھے نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے ,,

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم ہوئی تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اس کے لیے کمیٹیاں مجلس سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم ہوئی جس کے تحت

تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں .... الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے سکریٹری بابو سردو پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت شروع کی سرسید بطور اختلاف رائے ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کیے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے حکومت میں بھیجے۔

۱۸۸۲ میں جب سرسیدؒ والسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا موقع پھر ملا اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغرب اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور میموریل کمیشن میں بھیجے مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ سرسید نے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۰ میں جس کی ستائیسویں کو سرسیدؒ نے دنیا سے رحلت کی گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسیدؒ اس زمانہ میں بہجوم رنج و الم کے سبب سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے تھے ان کو یقین تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ ہندو دوستوں کی ناراضگی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے ......

فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں ہی

عمر صرف کی ہے وہ اس مسئلہ کی بنسبت لکھتے ہیں کہ ”ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے“ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال کے بعد اسی طرح ان کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انہوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسا ارادہ رکھتے ہیں لے

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا سیکولر جمہوری ملک میں بسنے والی تمام قومیں اس کی حکمراں ہیں مگر بعض لوگ اسے جمہوری ملک نہیں مانتے لہٰذا تمام زبانوں کو یکساں ترقی کے مواقع فراہم نہیں کئے گئے۔ اس تعصب کی سب سے زیادہ شکار اردو ہوئی جو کہ ملک کی بلاشبہ سب سے خوبصورت اور سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت پرانا ہے اسے ۱۹۴۷ء کے واقعات سے جوڑنا محض تاریخی حقیقتوں سے ناواقفیت کا اقرار کرنا ہے یا عوام کو اندھیرے میں رکھنا ہے مگر زیادہ دنوں تک کذب نہیں چلتا اور آخر کار سچ کی فتح ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی مشہور تصنیف ”ہندوستان کا مستقبل“ میں اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ”اپریل ۱۹۰۰ء میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے ایک تجویز پیش کی جس کی وجہ سے صوبہ میں اردو ناگری کی تحریک شروع ہوگئی۔ ہندوؤں نے حکومت کی اس تجویز کی تائید کی کہ عدالتوں کی کاروائی میں ناگری رسم الخط استعمال کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی کئی سال سے ہندو اس بات کی تحریک کر رہے تھے کہ ناگری رسم الخط کی اجازت مل جائے لیکن سرسید کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہ ہوتی تھی،،“ ۲

اردو کی مخالفت کی داغ بیل ۱۸۶۷ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ شمالی ہند کے تمام سربرآوردہ ہندو اردو مٹانے کی تحریک متحد ہو کر چلا رہے تھے سرسید اسی زمانے سے اردو کو بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور بقول راجندر پرشاد اردو کو ہٹانے کی تحریک سرسید کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہوتی تھی لہٰذا ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد

---

۲ (راجندر پرشاد صفحہ ۲۱۲) لے (مضمون حالی ختم ہوا)

یہ تحریک ایک بار پھر زور شور سے اٹھی اور اس بار ہندوؤں کو کامیابی ملی کہ صوبۂ متحدہ وغیرہ سے اردو کو ہٹا کر ہندی رائج کر دی گئی۔ ایک بار پھر اس فیصلہ کی مخالفت کی ذمہ داری جانشین سرسید محسن الملک نے نبھائی۔ اردو کے تحفظ کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ محسن الملک ان کے روح رواں بنے۔ نتیجتاً محسن الملک کو حکومت کے دباؤ میں آکر کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دینا پڑا کہ انگریز پوری طرح ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے تھے اور علی گڑھ کالج کو بھی اردو کی حمایت کی تحریک کی وجہ سے ایک طرح سے ختم کر دینے کے درپے ہو گئے تھے۔ لہٰذا محسن الملک سے یہ کہا گیا کہ یا تو اردو کی حمایت بند کر دیں یا علی گڑھ کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دیدیں۔ اردو کو سرے سے ختم کر دینے کی تحریکیں چلتی رہیں بالآخر آزادیٔ وطن کے بعد اس زبان کو کلیتہً ختم کر دیا گیا حالانکہ اردو ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر بنائی لیکن کیونکہ اس کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی لہٰذا برادرانِ وطن کو اس کا وجود منظور نہیں۔

ہم جو آج زندہ ہیں سرسید کی پیشین گوئی کو حرف بہ حرف پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اردو کے خلاف تحریک اس قدر بڑھی کہ آزاد ہندوستان میں اس کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ مسجدوں، مکتبوں اور مسلمانوں کے مدرسوں میں یہ زبان باقی بچ گئی ہے حکومت کی یونیورسٹیوں و کالجز میں دور دور تک اس کا نام و نشان نہیں اردو کا روزی روٹی سے تعلق بالکل ختم کر دیا گیا اب سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر کرتے ہوئے چلے جائیے کہیں اردو کا ایک حرف بھی لکھا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ بعض پرائمری اسکولوں میں یہ زبان آج بھی پڑھائی جاتی ہے مگر اس کا پروپیگنڈہ اس قدر کیا جاتا ہے گویا حکومت سارا زور اردو کی ترقی پر لگائے ہوئے ہے۔ پورے ملک میں کہیں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہ مل سکا حالانکہ حامیانِ اردو اب محض دوسرا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مسلمان اب اس پر بھی بہت زیادہ خوش ہو جائے گا اگر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ہی دیدیا جائے اتر پردیش جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد رہتی ہے آج تک باوجود یاد دہانیوں اور الیکشن کے موقعوں پر وعدوں کے اردو کو کوئی سرکاری درجہ نہیں مل سکا ہے (حیات جاوید صفحہ ۲۰۰)

ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں

لوکل سلف گورنمنٹ بل پر سرسید کی ترمیم

غدر کے بعد ہندوستان پر ۱۸۵۸ء میں باقاعدہ تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی اور بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی پارلیمنٹ کی حکمرانی ہندوستان پر قائم ہوگئی۔ ہندوستان میں پہلی بار کسی عوامی نمائندہ مجلس کو اختیارات حاصل ہوئے چاہے وہ نمائندہ جماعت کسی دوسرے ملک کے عوام نے بنائی تھی۔ اس کا لامحالہ اثر ہندوستانی نظام پر بھی ہونا تھا۔ لہٰذا اسباب بغاوت ہند کی اشاعت اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کے بعد ہندوستان میں وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو شامل کیا گیا اور بڑے بڑے عہدوں کے دروازے غیر انگریزوں کیلئے کھول دیئے گئے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں عام نمائندگی کی شروعات تھی۔ اس خیال کو قانون بنانے کے لیے اٹھارہ ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء کو وائسرائے کی کونسل میں لوکل سلف گورنمنٹ بل پیش ہوا اس بل پر سرسید نے اپنی زندگی کی بہت اہم تقریر کی اور اس میں پہلی بار اپنے نظریۂ قومیت کی وضاحت کی کہ ہندو مسلمان اور دوسری قومیں ملک میں رہتی ہیں اور ایک کی بالادستی دوسری قوم کے لیے نقصان دہ ہوگی یہ واقعہ کانگریس کے قیام سے تین سال پہلے کا ہے۔ جب سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا اس وقت کانگریس کا تصور تک نہ تھا لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کے سیاسی خیالات کانگریس کی مخالفت میں قائم ہوئے غلط ہے بلکہ سرسید کے نظریہ کی مخالفت میں جب کانگریس نے اپنے مشن کی شروعات کی تو لامحالہ سرسید کو اس کی مخالفت میں کمربستہ ہونا ہی تھا۔

اپنے ان خیالات کی بنیاد پر کہ ہندوستان میں تمام قوموں کی تعلیمی واقتصادی پوزیشن برابر نہیں ہے اور تعداد میں بھی بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ سرسید نے اس بل پر ایک بہت مدلل تقریر کی اور انھیں کی کوششوں سے ایک بہت اہم ترمیم اس میں پاس ہوئی جس کی رو سے

ایک تہائی ممبروں کا تقرر حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا تاکہ مسلمان جو کہ اپنی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان انجمنوں میں زیادہ نہیں آپائیں گے ان کو نامزد کیا جا سکے۔

"گورنمنٹ کو لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں کے واسطے ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جس کی تعداد کل ممبروں کی ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو۔ مسودہ کی اس دفعہ کو میں بالکل پسند کرتا ہوں اور چوں کہ یہ اول ہی موقع ہے جبکہ لوکل سلف گورنمنٹ کا معاملہ قانونی کونسل میں پیش ہوا ہے اس وجہ سے میں اس امید کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ اس پالیسی کا اظہار ہے جو گورنمنٹ قانون بنانے کے باب میں اور صوبوں کے واسطے بھی اختیار کرنا چاہتی ہے۔"[۱]

سر سید کے ذہنِ دور رس میں یہ اشکال ابھرنے لگا تھا کہ چوں کہ حکومت لوکل بورڈوں میں ریپریزنٹیشن کا اصول جاری کر رہی ہے لہٰذا آئندہ یہ اصول پورے طور سے ملک کی ہر انجمن میں رائج ہوگا۔ لہٰذا اسی وقت سر سید نے اس کی نشاندہی کی اور کہا کہ اس اصول کو برطانیہ کی طرح رائج کرنے میں بہت خرابیاں بھی ہیں اور چونکہ برطانیہ کی طرح ہندوستان میں ایک قوم نہیں رہتی اس لیے برطانیہ کا سادہ اصولِ ریپریزنٹیشن ہندوستان پر لاگو نہیں ہو سکتا۔

"مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصّہ اب تک اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے جب ریپریزنٹیشن کا اصول معاملات مختص المقام کے لحاظ سے بھی پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جاوے۔ ریپریزنٹیٹو اداروں کے ذریعہ سے سلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی فیاضی ہندوستان کو سکھا دے گی۔ لیکن انگلستان سے اس اصول کو مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کو یاد رکھنا نہایت ضروری ہے جس کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سوشل اور پولیٹیکل حالت کئی صدیوں کی خود مختار حکومت اور ایک قوم کی دوسری قوم پر ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر غلبہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔"[۲]

---

[۱] مجموعہ لکچرز مرتبہ امام الدین گجراتی ۱۹۰۰ء ص ۱۴۰ [۲] ایضاً

مختلف قوموں کے مذہبی و تمدنی اختلافات اور ان کے باہمی تعلیمی فرق کو واضح کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ ان حقائق کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے

"ہندوستان فی نفسہٖ ایک برِ اعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے اور ذات کا قاعدہ اب تک بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت مند اور صاحبِ تجارت ہو تو دوسرا گروہ باعلم اور ذی رعب ہو ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو..... ایک قوم بخوبی اس سے واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوموں کو مطلق اس کی پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیشن کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور پولیٹیکل و سوشل خطرات پیدا ہوں گے"[1]

ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی

سر سید نے ظاہر کیا کہ جس ملک میں اس طرح کے اختلافات نہ پائے جاتے ہوں ریپریزنٹیشن کا اصول نہایت مناسب ہے لیکن ہمارے ملک کی حالت ایسی نہیں ہے جیسی کہ برطانیہ میں رہنے والے وطن اور مذہب کے متحد ہونے سے ایک قوم ہو گئے ہیں عیسائیوں کو یہودیوں کی بھلائی کے کسی کام میں ان کا ساتھ دینے سے انکار نہیں ہوتا! درحقیقتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشل و پولیٹیکل معاملات میں کل برطانیہ کے باشندے ایک قوم ہیں مگر ہندوستان میں رہنے والے مذہبی سوشل و پولیٹیکل اختلافات کی وجہ سے مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔

"قوم و مذہب کے متحد ہونے سے انگریزی قوم ایک قوم ہو گئی ہے اور تعلیم کی ترقی

---

[1] ایضاً

سے خفیف اختلافات ان معاملات میں جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطلب کی حمایت کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل و پولیٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ بلاشبہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی نسبت ایسا نہیں کہا جاسکتا...... ان ملکوں میں جہاں کہ آبادی صرف ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوتی ہے یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جاسکتا ہے[1]

سادہ جمہوری اصول غلط ہے

ہندوستان میں رہنے والی قوموں میں تعلیمی و اقتصادی نابرابری کو دیکھتے ہوئے سر سید نے ریپریزنٹیشن کے سادے اصول کو جاری کئے جانے کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسا اگر کیا گیا تو ملک میں بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے اور قوم و مذہب کا اختلاف نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

"لیکن مائی لارڈ! ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں اور جہاں کہ مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں کے علم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی نسبت زیادہ تر بری خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل و پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا۔۔۔ اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا

---

[1] ایضاً صد ۱۴۱

جاسکتا ہے۔"

الیکشن کے خالص اور سادے اصول سے مراد وہ طریقہ ہے جو کہ آج بھارت میں رائج ہے یعنی بغیر مسلمانوں اور دوسرے طبقوں کو بسبب ان کی تعداد کی کمی اور تعلیمی پسماندگی کے برابری پر لانے کے لیے نمائندہ اداروں میں رزرویشن کا نہ دیا جانا اور ہر انسان کے ووٹ کی قیمت برابر ہونا۔ سرسید نے کہا کہ اگر سادہ اصول جاری ہوا تو بڑی قوم چھوٹی قوم پر حاوی آجائے گی اور مذہبی اختلافات پہلے کی نسبت اور بڑھ جائیں گے جس میں کہ تمام قوموں کا نقصان ہے۔

"بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجاوے گی۔ قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہو جاویں گے۔ مائی لارڈ! میں نے اس معاملے کی نسبت اس قدر تفصیل کے ساتھ اس امر کی تشریح کرنے کی غرض سے گفتگو کی ہے کہ میں نے ریپریزینٹیو طریقے کا سچا حامی ہو کر کس وجہ سے اس مسودہ کے ان احکام کی دلی تائید کی ہے جو الیکشن کے خالص طریقے کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں گورنمنٹ نے جو لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں کے ایک ثلث ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس سے گورنمنٹ نے یہ تدبیر اختیار کی ہے جو ہندوستانی رعایا کے مختلف فرقوں کی طرف سے ممبروں کے تقرر میں اس قسم کی مناسب اور واجبی مساوات قائم رکھے جو الیکشن کے خالص قاعدے کے ذریعہ سے حاصل نہ ہوگی۔"

سرسید نے سادہ اصول کے مقابلے میں رزرویشن کے اصول کو پسند کیا۔ ایک تہائی ممبروں کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہ ہی تھا کہ جو طبقات تعداد کی کمی کی وجہ سے نمائندہ انجمنوں میں اپنی پسند کے ریپریزینٹیو نہ بھیج سکیں ان کا نومنیشن حکومت اپنی طرف سے کر دے تاکہ کونسلوں میں ہندو مسلمانوں اور دیگر اقوام کی تعداد برابر برابر ہو سکے اور ملک میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔

سرسید کی یہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم خدمت ہے کہ انھوں نے ہی یہ ترمیم اس بل میں پیش کی تھی تاکہ مسلمانوں کی نمائندگی بڑھ سکے ورنہ حکومت خالص اور سادہ اصول کو ہی لاگو کرنا چاہتی تھی اور یہ فطری بھی تھا کیوں کہ برطانیہ میں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ تھا اور

۱۔ ایضاً ۲۔ ایضاً

وہیں کا یہ اصول ہندوستان میں رائج کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا سر سید اگر قومی اختلافات کی نشاندہی نہ کرتے تو سادہ اصول ہی جاری ہوتا اور مسلمانوں کی نمائندگی اپنی تعداد کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصد ہوتی جس میں آدھے سے زیادہ ایسے ہوتے جیسے کہ آج کل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اعتراف ہے کہ

"۱۸۸۲ء میں جبکہ لوکل سلف گورنمنٹ بل کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوں کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ پر کی جائیں اور یہ طے پایا کہ ایک تہائی نشستیں اس طریقے پر پُر کرنی چاہئیں تاکہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کر کے کمی پوری کر دے تاکہ جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخابات میں نہیں آئے ہیں"[1]

---

[1] راجندر پرشاد: ہندوستان کا مستقبل ص ۱۹۵

قیامِ کانگریس

ابھی سرسید کے مدرسہ کو بنے ہوئے صرف دس سال کا عرصہ گذرا تھا اور مسلمانوں کی ایک نسل بھی تعلیم یافتہ ہو کر نہ نکلی تھی کہ ملک میں ایک بہت اہم مجلس کا وجود عمل میں آیا۔ یہ مجلس انڈین نیشنل کانگریس تھی جو ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے مشورہ پر سر ہیوم نے قائم کی۔ سرسید کی زندگی میں غدر کے بعد یہ سب سے اہم واقعہ تھا کہ اس مجلس کے ذریعہ اگر مسلمان جوشیلی سیاست میں شامل ہو جاتے تو سرسید کی زندگی کے سارے منصوبے فیل ہو جاتے۔ بڑی مشکل سے ۱۸۵۷ء کی لٹی پٹی قوم کو سرسید نے کسی طرح اس قابل بنایا تھا کہ وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ پوری زندگی کی کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ کسی طرح لٹتے پٹتے علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ بڑی مشکلوں اور کاوشوں سے مسلمانوں کو نئی تعلیم حاصل کرنے پر رضامند کیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر ایک زبردست سیاسی بجنس قدمی کی کہ ملک کی پہلی سیاسی انجمن تشکیل دی۔ حالاں کہ اس انجمن کا مقصد محض حکومت کو رعایا کے مطالب سے آشنا کرانا تھا اور حکومت پر صحتمند نکتہ چینی کرنا تھا۔ مگر جیسا کہ ۱۸۸۲ء کے لوکل سلف گورنمنٹ بل سے ثابت ہے کہ حکومت ملک میں نیابتی ادارے قائم کرنا چاہتی تھی اور زیادہ سے زیادہ مراعتیں ہندوستانیوں کو دینا چاہتی تھی۔ جس طریقے الیکشن کے سادے اصول کو رائج کیا جا رہا تھا اور جو جو مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے، وہ سب کے سب مسلمانوں کے لیے شدید نقصان دہ تھے۔ سرسید چاہتے تھے کہ قوم پڑھ لکھ کر تیار ہو جائے بعد کو پھر کسی سیاسی عمل میں شریک ہو مگر کانگریس کا قیام ایک ایسا واقعہ تھا جس نے سرسید کی راہ بدل دی اور انھیں وقت سے پہلے ہی اپنے سیاسی نظریات کو مشتہر کرنا پڑا کہ مسلمان سیاست میں کیا کریں۔ اس وقت سوائے سرسید کے کوئی مسلمان اس

پائے گا نہ تھا جس کی بات مسلمان کان دھر کر سنتے۔ سر سید کی کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں اور مسلمانوں نے بالعموم سر سید کے مشورے کو مانا اور کانگریس کے شور و غوغا سے الگ رہے۔

بنگال، مدراس اور بمبئی میں انگریز زیادہ عرصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ لہٰذا انھیں علاقوں میں انگریزی تعلیم کا اثر پہلے ہوا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے برخلاف بڑے اشتیاق اور جوش سے نئی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کے ہندوؤں میں انگریزی داں بہت تھے اور بعض بعض تو لندن سے سند تکمیل کر کے واپس آ چکے تھے۔ انگریزی سیاست و نیابتی طرزِ حکومت کے فوائد ان کی سمجھ میں آنے لگے تھے۔ انھوں نے حکومت میں یہ درخواستیں گزارنی شروع کیں کہ ہندوستان میں بھی پارلیمانی طریقے رائج کیے جائیں۔ حکومت کو عام بے چینی کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں اور شکائتیں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔

"مسٹر ہیوم ایک برطانوی عہدیدار تھے۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہندوؤں کے مذہبی گرو اور چیلے ان سازشوں کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کے مدِ نظر یہ ہے کہ یکایک شورش پھیل جائے، قابلِ نفرت لوگ کم ہوں، ساہوکاروں کو لوٹا جائے اور پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ دکن میں واقعی کاشتکاروں نے بلوے کیے۔ اس پر ہیوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام چاہیے جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں کا بخار نکلتا رہے تاکہ وہ خفیہ سازشوں کی طرف مائل نہ ہوں"[۱]

ہندوؤں کے پاس پہلے سے بہت سی مقامی انجمنیں تھیں مثلاً انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن، ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن۔ مدراس میں مہاجن سبھا تھی اور پونا میں سروجنک سبھا اور ان میں ایسے تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو کہ یہ انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ مگر سب صوبائی انجمنیں تھیں اور پورے ہندوستان کی کوئی انجمن نہ تھی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ہندوؤں میں اس وقت تک پورے اور متحدہ ہندوستان کا تصور ہی نہ تھا۔ ہیوم نے وائسرائے سے مل کر ایسی آل انڈیا انجمن کا خاکہ مرتب کیا جس میں ہندوستانی اپنے معاشرتی مسائل پر گفتگو کریں اور

---

[۱] پٹابی سیتا رامیا "دی ہسٹری آف دی کانگریس" جلد اول ص۸

اس کے سالانہ جلسوں کی صدارت صوبائی گورنر کیا کریں۔

"مسٹر ہیوم شملہ گئے وہاں انھوں نے وائسرائے سے مشورہ کیا۔ کئی روز ہیوم کی اسکیم پر غور کرنے کے بعد لارڈ ڈفرن نے ہیوم کو طلب کیا اور کہا کہ یہ اسکیم کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگی۔ اس ملک میں کوئی ایسی جماعت موجود نہیں ہے جو اس قسم کی خدمات انجام دے جو انگلستان میں ہر مجسٹی کی حزبِ اختلاف کر رہی ہے۔ اخبارات اگر لوگوں کی ترجمانی کرتے بھی ہیں تو وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی اور انگریز اس سے بے خبر ہیں کہ ہندوستانی حلقوں کا ان کے اور ان کی پالیسی کے متعلق کیا خیال ہے۔ انگریزوں اور رعایا دونوں کے مفاد کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہندوستانی اہلِ سیاست سال میں ایک مرتبہ جمع ہوں اور گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ انتظامات میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی کیوں کر اصلاح ہوسکتی ہے اور یہ کہ ایسی انجمن کی صدارت لوکل گورنروں کو نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ ان کی موجودگی میں لوگ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکیں گے۔"[1]

مسٹر ہیوم لارڈ ڈفرن کے دلائل سے متاثر ہوئے انھوں نے اپنی اور لارڈ ڈفرن دونوں کی اسکیمیں کلکتہ بمبئی اور مدراس کے اہلِ سیاست کے سامنے پیش کر دیں۔ انھوں نے بھی لارڈ ڈفرن کا مشورہ متفقہ طور سے پسند کیا۔ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب تک وہ ہندوستان میں رہیں یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ ان کی اسکیم ہے۔ چنانچہ اہلِ سیاست کے علاوہ جن سے ہیوم نے مشورہ کیا تھا اور کسی پر یہ بات ظاہر نہیں کی گئی۔

اسی وقت سے کانگریس کے قیام کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ وائسرائے کی منظوری لینے کے بعد ہیوم انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے انگریز لیڈران اور عمائدین سے کانگریس قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا اور انگلستان میں انڈین پارلیمنٹری کمیٹی قائم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں جو انگریز امیدوار ہوں ان سے یہ حلف لیا جائے گا کہ وہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیں گے یہ بھی قابلِ توجہ بات ہے کہ انگریزوں نے کانگریس قائم کرنے کے لیے

---

[1] پٹابی رامیا۔ دی ہسٹری آف دی کانگریس جلد اول بحوالہ انڈر ڈکشن ٹو انڈین پالٹکس از سر مزمجی صلہ

مسلمانوں سے مشورہ تک نہیں کیا شامل کرنا تو دور کی بات ہے۔ کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں انگریزوں سے وفاداری کو ہندوستانی رعایا کے لیے ضروری قرار دیا گیا اور اس کے علاوہ جو اہم اغراض و مقاصد منظور ہوئے ان میں یہ ایک خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے۔

"اور قومی وحدت کے اس جذبے کی پوری پوری ترقی اور استحکام جس کی بنیاد ہمارے محبوب لارڈ رپن کے اس عہد میں پڑی دوامًا قابلِ یادگار ہے"[1]

کانگریس اور اس کے بانیوں کی طرف سے یہ اس حقیقت کا بالکل صحیح اعتراف ہے کہ اس سے قبل ہندوؤں میں نہ قومی وحدت کا کوئی تصور موجود تھا اور نہ یہ جذبہ ان میں موجود تھا۔ اس کے لیے وہ لارڈ رپن کے عہد حکومت کے مرہون منت ہیں۔ اس کو ترقی دینے کا سامان لارڈ ڈفرن اور ان سب انگریز ماہرینِ سیاست نے کیا جو اس مشورے میں شریک تھے۔ کانگریس انگریزوں نے پیدا کی۔ اس کی پرورش انگریزوں نے کی اور عرصۂ دراز تک اس کی قیادت بھی انگریز ہی کرتے رہے۔ سر ولیم ویڈربرن دو دفعہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے۔ کانگریس کے چوتھے اجلاس کی صدارت مسٹر ڈیوڈ ویل نے کی اس کے ساتھ ہی یہ ایک معمول تھا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے انگلستان سے بااثر انگریز آئے تھے جو عموماً پارلیمنٹ کے ممبر ہوا کرتے تھے۔

سرسید پر الزامِ وفاداری اور وفادار کانگریس

سرسید پر وفاداری کا الزام لگانے کا مقصد محض آج کی مسلمان نسلوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت اس تصویر کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جبکہ سرسید نے اپنی جان تک کی بازی لگا کر انگریز حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق ادا کیا اور ہندوستان کی تمام عوام کو راحت پہنچائی۔ مثال کے طور پر ہم صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ پہلا اسباب بغاوت ہند کی تصنیف اور دوسرا آگرہ دربار سے محض اس لیے اٹھ کر چلے جانا کہ انگریزوں کی کرسیاں ہندوستانیوں کی کرسیوں سے اوپر بچھائی گئیں تھیں۔ وہ تو مطلق العنان حکومت تھی اور گولی کے زور پر حاصل کی

---

[1] ایضاً

گئی تھی۔ آج کیا ہے؟ جمہوریت ہے سیکولرازم ہے اور برابر کے حقوق ہیں پھر بھی کلمۂ حق کہنا ایسا جہاد بن کر رہ گیا ہے جس کو عمل میں لانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

"آگرے کے دربار کے موقع پر وہ صرف اس وجہ سے اٹھ کر باہر چلے آئے تھے کہ وہاں یورپین لوگوں کے لیے ڈائس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور ہندوستانیوں کے لیے ڈائس کے نیچے"۱

اب ذرا کانگریس کی وفاداری پر نظر ڈالتے چلیں۔ کانگریس کے پہلے صدر مسٹر بنرجی نے خطبۂ صدارت ۱۸۸۵ء میں فرمایا۔

"برطانوی حکومت کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے"۲

دادا بھائی نوروجی دوسرے سال کے خطبۂ صدارت میں رقم طراز ہیں۔

"ہم کو مردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہیے کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک وفادار ہیں۔ ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں جو انگریزی حکومت نے ہم کو عنایت کیے ہیں ہم ان کی تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں جو ہم کو دی گئی ہے اور اس نئی روشنی کو جو ہم پر ڈالی گئی ہے۔ ہمارے اندھیرے کو اس نے اجالا کر دیا ہے اور ہم کو یہ نیا سبق دیا ہے کہ بادشاہ رعایا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ رعایا بادشاہ کے لیے نہیں بنی ہے اور یہ نیا سبق ہم نے آزاد انگریزی تمدن کی روشنی میں پڑھا ہے"۳

سر فیروز شاہ مہتہ نے ۱۸۹۰ء میں کہا!

"ہماری وفاداری کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہو گیا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز میں لارڈ کراس کے انڈیا ریفارمز بل پر بحث کے دوران میں ایک کے بعد ایک کئی وائسرائے تھے جنھوں نے ہمارے وفادارانہ اور پر امن مقاصد اور کوششوں کی پرزور شہادت دی۔ گذشتہ چند روز کے اندر ہمارے وزیر ہند نے

۱۔ راجندر پرشاد ہندوستان کا مستقبل ص ۱۹۶ ۲۔ دی ہسٹری آف کانگریس ص ۵۰ ۳۔ ایضاً

اس شہادت کی تصدیق کر دی۔[1]

اسی اجلاس میں مسٹر گوکھلے نے نمک کے محصول کی قرارداد پر اپنی تقریر میں کہا۔

"ہم حکومتِ برطانیہ کی صلاحیتِ انصاف سے اپیل کرتے ہیں۔ ہم ان کے تدبر اور پاک باطنی سے اپیل کرتے ہیں۔ نہیں میں اس سے بھی آگے بڑھتا ہوں ہم ان کے جذبۂ رحم سے اپیل کرتے ہیں۔"

کانگریس کی تاریخ لکھنے والے مصنف پٹیابی سیتارامیا کانگریس کی شروع سے چلی آرہی وفادارانہ روش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ابتدائی زمانہ میں کانگریس کو اپنی وفاداری کے مظاہرے کرنے سے عشق تھا جب ۱۹۱۴ء میں لارڈ پینٹ لینڈ گورنر مدراس کانگریس کے پنڈال میں آئے تو صرف یہی نہیں کہ ایوان کے تمام آدمی ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے تالیاں بجائیں بلکہ مسٹر اے بی پیڈرو کو جو مہم پر جانے والی ہندوستانی فوج کے بھیجنے پر تقریر کر رہے تھے روک کر سریندر ناتھ بنرجی سے کہا گیا کہ تاج سے وفاداری کے رزرولیشن کی تحریک کریں اور انھوں نے بڑی وضاحت و بلاغت کے ساتھ وفاداری کے جذبات کا اظہار کیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب سر جیمس مسٹن لکھنؤ کانگریس کے اجلاس ۱۹۱۶ء میں آئے۔ تمام حاضرینِ اجلاس ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔"[2]

سرسید اگر مسلمانوں کی وفاداری انگریزوں پر ثابت کرنا چاہتے تھے تو اس کی واضح وجہ موجود تھی کہ ۱۸۵۷ء کی ساری ذمہ داری انگریز مسلمانوں پر رکھتے تھے اور ہندو اس سے بری تھے بلکہ بنگالی اخباروں نے بڑھ چڑھ کر انگریزوں کا ساتھ اس مہم میں دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں پر سے یہ الزام ہٹانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسی روش اختیار کریں۔ لیکن کانگریس کیوں بیسویں صدی کی اول دہائی تک انگریزوں کی وفادار بنی ہوئی تھی اور اس کے ثبوت دیتی رہتی تھی؟ اس کی وجہ صاف ہے۔

---

[1] پٹابی سیتارامیا، دی ہسٹری آف دی کانگریس جلد اول ص۲۴

[2] ایضاً حاشیہ ص۱۲۱

سرسید کی کانگریس مخالفت

ہندو برطانوی پارلیمنٹری طرزِ حکومت کے فوائد بخوبی دیکھ رہے تھے اور انھیں اندازہ تھا کہ اگر یہ طریقۂ حکومت ہندوستان میں رائج ہو جائے تو وہ پورے ہندوستان کی قسمت کے بغیر شرکت غیرے مالک ہوں گے۔ ان کو ان مقاصد کے پورے کرنے میں انگریزوں کا پورا تعاون حاصل تھا۔ لہٰذا کانگریس انگریزوں سے وفاداری کو فرضِ اولین سمجھتی تھی جس کا اظہار ہر سالانہ جلسہ میں قرارداد پاس کر کے کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف ایک سرسید احمد خاں ایسے تھے جو ان کے مقاصد کو سمجھ رہے تھے۔ پوری کی پوری قوم انگریزی اور انگریزی علوم سے بہرہ ور نہ ہونے کے سبب ان کے طرزِ حکومت اور سیاسی تغیرات سے کلیتہً نابلد تھی۔ سرسید کے مدرسہ کو قائم ہوئے ابھی صرف دس سال ہوئے تھے کہ کانگریس کا قیام ہوا۔ مسلمانوں کی ایک نسل بھی ابھی پوری طرح تعلیم یافتہ ہو کر نہ نکلی تھی کہ ملک میں ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں آیا جو کہ آنے والی صدیوں تک ملک کے حالات کو کنٹرول کرنے والی تھی۔

ہندو ۱۸۱۷ء سے بھی پہلے سے تعلیم کی طرف ہمہ تن متوجہ تھے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی وغیرہ شہروں میں بڑی بڑی درس گاہیں چل رہی تھیں۔ دوسری طرف مسلمان تعلیم سے بے بہرہ انگریزوں سے متنفر عظمت رفتہ کے سوگوار، نان شبینہ کے لیے محتاج، قرضوں میں دبے ہوئے، حاکموں کی آنکھوں میں خار مقہور مرعوب اور معتوب کہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کی مصیبت زدہ قوم کو کانگریس پھر سے سیاست میں داخل کر کے اشتعال دلانا چاہتی تھی۔ سرسید کو خوف ہوا کہ بنگالیوں کی آزاد روش مسلمانوں کو پھر بغاوت پر آمادہ نہ کر دے جس طرح کہ ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا۔

> "وہ غدر میں یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھپ گئی۔ ان کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیز بنگالیوں کی ترقی سمجھی جاتی ہے وہ مسلمانوں میں آکر موتی نہ بن جائے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "عقاب چڑیوں کی جائیں جائیں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا لیکن باز جبرہ اس کے آگے

جو رہبری کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ دیتا ہے۔"[1]

لہٰذا سر سید نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ حالانکہ سر سید ملکی معاملات میں کبھی ہندو اور مسلمان کا سوال نہیں پیدا کرتے تھے مگر اردو کو ہٹانے کی تحریک اور بنگالی اخباروں کا مسلمانوں کے خلاف رویہ سر سید کے ذہن پر حقیقت کا انکشاف کرتا جارہا تھا۔

"بنگالی اخباروں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی ان جزوی رعائیتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ ان کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور ان کی وہ مخالفانہ اور دلشکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف ان میں چھپتی رہتی تھیں اور بھی مایوس کرنے والی تھیں۔"[2]

اپنے پہلے اجلاس میں کانگریس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر منتخب ہوا کریں اور صوبوں کی قانون ساز مجلسوں میں منتخب ممبران کی تعداد بڑھائی جائے۔ صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بھی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں۔ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہوا کرے اور تمام متعہد عہدوں کے لیے مقابلے کا امتحان کرایا جایا کرے۔ کیونکہ یہ سارے مطالبات ملکی انتظام میں دوررس تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ لہٰذا سر سید کو مجبوراً کانگریس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ کرنی پڑی اور لکھنؤ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو اور میرٹھ میں اسی کانفرنس کے جلسے میں بتاریخ ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو دو بہت طویل تقریریں کانگریس کے اغراض و مقاصد کے خلاف کیں اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ کانگریس سے اور کانگریس کے نظریہ نیشنل ازم سے دور رہیں کیوں کہ اس میں صرف ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ یوں تو سر سید کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلمانوں کے لیے اہم ہے لیکن ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء اور ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کی دو تاریخیں خصوصی طور پر اہمیت رکھتی ہیں کہ ان تقریروں نے جن کا کہ سر سید نے اظہار کیا ہندوستان کے مستقبل پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ سر سید نے اس خیال کو بیہودہ قرار دیا کہ کانگریس کے مطالبات مان لیے جانے پر مسلمانوں کا بھی فائدہ ہو گا لہٰذا مسلمانوں کو اپنی حالت اور فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۲۵۵ [2] حیات جاوید صفحہ ۲۵۵

کسی بھی سیاسی جال میں پھنسنے سے بچنا چاہئے۔ کانگریس کی حکومت سرسید کی نظر میں ہندوؤں کی حکومت کے مترادف ہوتی اور ان کے خیال میں یہ کسی بھی طرح مناسب نہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجاتے۔ علی گڑھ کی سرزمین پر ہی گوکھلے نے یہ اعتراف کیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ واقعی مشکل بات تھی کہ وہ انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت قبول کر لیتے۔

"چوں کہ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے لہٰذا ان کو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں۔ یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جائے جو حالت با لحاظ مردم شماری کے اس وقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی حالت ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض ہمارے دلوں میں بھی آتا اور ہم بھی اسی خیال کو پیش نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں"[۱]

جواہر لال نہرو بھی سرسید کی اس پالیسی کے حامی ہیں کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ کرنی چاہئے تھی جس کے بغیر مسلمان ہندوؤں کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر رہ جاتے۔

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان جدید طرز کی حکومت کی تعمیر میں کوئی قابلِ قدر حصّہ نہ لے سکتے تھے۔ بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جاتے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط"[۲]

حوالہ
۱۔ نورالحسن نقوی: سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص [illegible]   ۲۔ جواہر لال نہرو: میری کہانی جلد دوم ص [illegible]

لکھنؤ تقریر

مسلم سیاست کا سر چشمہ

۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے دوران ہی اعلان کیا گیا کہ آج شب سرسید اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کریں گے اور بتائیں گے کہ مسلمان کیا سیاسی مسلک اختیار کریں۔ لہٰذا مسلمان جوق در جوق اس جلسہ میں شریک ہوئے اور قیصر باغ بارہ دری میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید نے وہ تقریر کی جس کی صدائے بازگشت صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔

نیشنل کانگریس نے ۴۹ درخواستیں حکومت میں گذاری تھیں ان میں دو انتہائی اہم مطالبات شامل تھے ایک یہ کونسلوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ نمائندے بھیجے جائیں اور دوسرے تمام سرکاری نوکریوں کے لیے مقابلہ کے امتحان کا طریقہ رائج کیا جائے اور یہ امتحان ہندوستان میں ہی ہوں سرسید نے کہا کہ:

> "کانگریس نے ۴۹ درخواستیں گورنمنٹ میں گذاری ہیں۔ ان میں جو مقدم ہیں وہ یہ ہیں جو امتحان ولایت میں ہوتا ہے موقوف ہو اور ہندوستان میں اس کی جگہ امتحان ہو۔ علاوہ اس کے غیر معاہد عہدوں کی نسبت یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ کُل کمپیٹیشن یعنی مقابلے کے امتحان سے دیئے جاویں۔ اس درخواست کا نتیجہ یہ ہے کہ جو عہدے تحصیل داری سے اوپر ہیں اور سب آرڈینیٹ کہلاتے ہیں یعنی سب ججی اور منصفی ڈپٹی کلکٹری

اور اکسٹرا اسسٹنٹی وغیرہ وہ بھی بذریعہ امتحان مقابلہ کے ملیں اور جو امتحان میں غالب آوے اسی کو ملیں،،[۱]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کی ان تجاویز کی مخالفت پولیٹیکل ہونے کے علاوہ مسلمانوں کی اقتصادیات سے بلاواسطہ تعلق رکھتی تھی کہ زمینداری کے علاوہ مسلمانوں کا گذارہ صرف نوکریوں پر تھا۔

"ہر شخص اس اصول کو سمجھ سکتا ہے کہ سب سے اول وہ ملک کمپٹیشن کے امتحان کے لیے مناسب ہے جس ملک میں ایک قوم بستی ہے اور تمام لوگ موچی سے لے کر ڈیوک تک ایک قوم کے ہیں۔ ان میں کمپٹیشن کا امتحان جاری کرنا کچھ مشکلات پیدا نہیں کرتا کیونکہ کوئی متغیث بنے یا حاکم کسی شخص کو اس سے ناراضی نہیں ہو سکتی ...... مگر ہمارے ملک کی جس میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے ایک طرف ہندو دوسری طرف مسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ہمارے ملک کے ہندو اور مشرقی ملک کے بنگالی اور دکنی ملک کے مرہٹے ایک نہیں ہیں۔

.... ہمارا ملک کمپٹیشن کے امتحان کے قابل نہیں ہے"[۲]

ان کا خیال تھا چونکہ ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں اور انڈین سوسائٹی مساوی نہیں ہے۔ مسلمان ہیں، پارسی ہیں اور ہندوؤں میں بھی بہت سی قومیں ہیں لہٰذا مقابلہ کا امتحان اس لیے ٹھیک نہیں ہے کہ خاص قومیں دوسروں پر حاکم ہو جائیں گی آگے چل کر کہا کہ مختلف قومیں بھی اگر ایک سی تعلیمی لیاقت کی ہوتیں تو کچھ مضائقہ مقابلہ کے امتحان میں نہ تھا لیکن چونکہ مسلمان تعلیمی میدان میں انتہائی پسماندہ ہیں لہٰذا ان کے حاکم بننے کا کوئی موقع نہیں ہے:

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور انگلش

---

[۱] (مجموعۂ لیکچرز: مرتبہ امام الدین گجراتی لاہور ۱۹۰۰ء ص ۳۰۴) ([۲] ایضاً)

لٹریچر میں ان کا علم جو گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ضروری ہے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہندوؤں کے مساوی ہو؟ نہیں ہر گز نہیں اب میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اکٹھا کر کے پوچھتا ہوں کہ بنگالیوں سے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ جب یہ صورت ہے تو کیونکر اس ملک میں مقابلے کا امتحان جاری ہو سکتا ہے۔ اگر یہ امتحانِ مقابلہ جاری ہوا تو غور کرنا چاہیئے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا۔ تمام قومیں نہ صرف مسلمان بلکہ تمام ہندو اس ملک کے معزز راجہ اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلوار بھی یاد ہیں ایک بنگالی جو چھری کو دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑے گا اپنے پر حاکم دیکھیں گے؟ پس مقابلہ کا امتحان نہ صرف ملک کی کسی خاص قوم کے لیے مضر ہے بلکہ امن کے لیے بھی مضر ہے۔'' (ایضاً)

سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ بنگالی تعلیم میں سب سے زیادہ ہیں تمام دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں سے لہٰذا بنگالی جن کو سرسید بزدل خیال کرتے تھے تمام ملک پر حاکم ہو جائیں گے اور بہادر قومیں ان کی حکومت کسی طرح برداشت نہ کر سکیں گی اور ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔ اس زمانے میں مدراس میں کانگریس کا تیسرا جلسہ ہونے والا تھا اور بدرالدین طیب جی کو اس کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے سلسلہ میں کہا کہ

''پس اگر کسی شریف آدمی کو رئیس کو اوسط درجے کے آدمی کو اچھے خاندان والے آدمی کو...... اگر اس کو قبول کرے کہ بنگالیوں کی حکومت سہے جوتیاں کھائے تو بسم اللہ ریل پر سوار ہو اور چلے مدراس چلے مدراس'' (ایضاً)

لہٰذا سرسید نے مقابلہ کے امتحان کی مخالفت کر کے مسلمانوں کی ایک بہت اہم خدمت انجام دی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں پر دوسری قوموں کی حکمراں ہونا پورے ملک کے لیے نقصاندہ تھا۔

کانگریس کا دوسرا مطالبہ تھا کہ وائسرائے اور گورنروں کی کونسلوں میں توسیع ہو اور منتخب نمائندوں کا اضافہ کیا جائے۔ سرسید نے اپنی تقریر میں اس مطالبہ پر بہت مدلّل

بحث کی ہے اور ہر طریقۂ الیکشن پر روشنی ڈال کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی طرح کے الیکشن کا رواج دینا ازلبکہ مسلمانوں کے لیے نقصاندہ ہے کانگریس کی منتخب ممبروں کی تجویز نے سرسید کو بہت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حکومت کانگریس کے اس مطالبہ کو تسلیم کرتی سرسید نے ہر طرح کے الیکشن کے نتائج مسلمانوں اور حکومت پر واضح کر دیئے۔ ان کے نزدیک چار طریقوں سے نمائندوں کا انتخاب ممکن تھا۔

پہلا یہ کہ مخلوط ووٹ کے ذریعے نمائندے چنے جائیں اور اکثریت کی بنا پر نمائندے منتخب ہوں۔ اس طریقہ پر سرسید نے جو اپنی رائے پیش کی وہی آگے چل کر جداگانہ انتخاب کی اساس بن گئی اور مسلمانوں کا ایک بہت اہم مطالبہ بن کر حکومت کے سامنے آئی۔ انہوں نے فرمایا۔

"سب سے پہلے یہ فرض کیجئے کہ وائسرائے کی کونسل اس قاعدے سے ہو جس کی خواہش ہے یعنی رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں اور انتخاب کی صورت یہ فرض کیجئے کہ تمام مسلمان ایک مسلمان ممبر کے لیے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لیے کل ہندو ووٹ دیں اور گینئے کہ مسلمان کے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے کتنے ووٹ؟ یقینی ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہوں گے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لیے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لیے۔۔۔۔۔ جوئے کے اس کھیل کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لیے ایک پانسہ ہمارے لیے ہوگا۔"[1]

دوسرا طریقہ یہ کہ الیکٹر مقرر ہوں یعنی ووٹرز آمدنی کی بنیاد پر طے کئے جائیں اور وہ نمائندوں کا انتخاب کریں۔ ایسی صورت میں بھی چونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں انتہائی غریب ہیں اور اقتصادی پسماندگی اپنے عروج پر ہے بلکہ ہندوؤں میں بھی راجپوت بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ لہٰذا ایسی صورت میں بھی مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ جائینگے

---

[1] ایضاً ص ۳۰

فرمایا کہ :

"دوسری صورت انتخاب کی یہ فرض کیجیے کہ انتخاب کے الیکٹر مقرر ہوں۔ ان کے لیے تقرر میں یہ ضروری ہو گا کہ کوئی حد مقرر کی جائے کہ اس درجے کے آمدنی کے لوگ الیکٹر ہوں گے ...... اگر فرضاً یہ درجہ مقرر ہو کہ پانچ ہزار روپے کی آمدنی والے الیکٹر مقرر ہوں تو بتلاؤ کہ کتنے مسلمان نکلیں گے جن کی آمدنی اس قدر ہو اور کس کے حق میں ووٹ دینے والے زیادہ ہوں گے ؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم اپنی قسمت کو روؤ کہ تمہارے پاس ایسی جائداد اور دولت ہے جو ملک کے ہندوؤں کے پاس ہے؟ ہرگز نہیں ..... عقلی قاعدے کے کسی ایک مسلمان کو بھی موقع نہ ملے گا کہ وائسرائے کی کونسل کا ممبر ہو سکے۔ پس کل وائسرائے کی کونسل میں بابو فلاں گھوش اور فلاں چکرورتی کے سوا نہیں ہو گا۔ پھر کیا حال ہو گا ہمارے ملک کے ہندوؤں کا جن کی حالت گو مسلمانوں سے اچھی ہے لیکن عموماً ان کی حالت بھی ایک ہی جیسی ہے ؟ کیا حالت ہو گی ان راجپوتوں کی جن کے باپ دادا کی تلواروں سے ابھی خون نہیں دھویا گیا ہے ؟ ایسی حالت میں ملک کے امن کا کیا حال ہو گا ؟ کیا یہ توقع ہے کہ ہم اور ہمارے بہادر بھائی راجپوت خاموش بیٹھے رہیں گے ؟

تیسری صورت سرسید نے یہ بتلائی کہ مناسب تعداد ہندوؤں کی اور مناسب تعداد مسلمانوں کی لی جائے، اور اس کا پیمانہ سوائے آبادی کے کچھ اور نہیں ہو سکتا پس ایسی حالت میں بھی مسلمان بہت کم پہنچیں گے

"مناسب تعداد ہندوؤں کی مناسب تعداد مسلمانوں کی ہو۔ ہم حیران ہوں گے کہ کس مناسبت سے یہ تعداد ہو؟ لازماً مردم شماری کی مناسبت سے" (ایضاً)

چوتھی صورت انتخاب کی یہ بتائی کہ ہندو کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان کو مسلمان یعنی جداگانہ انتخاب کا اصول جاری ہو۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ شملہ ڈیپوٹیشن سے بہت پہلے ہی سرسید نے

اس نظریہ کو پیش کیا تھا در حقیقت شملہ ڈیپوٹیشن کا جداگانہ انتخاب کا مطالبہ سرسید کے ہی خیالات پر مبنی تھا۔ سرسید نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ جداگانہ انتخاب جاری ہو اور یہ بھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کی علمی لیاقت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں وائسرائے کی کونسل میں دانشمندی سے کام کر سکیں۔

"اب ہم چوتھی صورت انتخاب کی یہ فرض کرتے ہیں کہ ہندو ممبر کو ہندو اور مسلمان ممبر کو مسلمان منتخب کریں اور یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ دونوں کی تعداد مساوی ہو۔ مگر آپ مجھ کو معاف کریں اگر میں دلسوزی سے کچھ کہوں۔ تمام قوم میں ایک بھی مسلمان نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے لایق ہو۔ میں نے چار برس کونسل میں کام کیا ہے اور ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے زیادہ بدتر کوئی ممبر نہیں ہو سکتا۔"

اس کے علاوہ سرسید کے نزدیک مسلمانوں میں سیاسی جوش پیدا کرنے کا مطلب خطرناک ہو سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے یہ ملک اپنی تلوار سے فتح کیا ہے اور اگر سیاسی جوش بہادر راجپوتوں اور پٹھانوں میں پیدا کر دیا جائے تو وہ صرف قلم اور زبان سے ہی کام نہ لیں گے بلکہ تلوار اٹھائیں گے جس میں سب کا نقصان ہو گا۔

"ہماری قوم اس خون کی ہے کہ جس نے نہ صرف عرب بلکہ ایشیا اور یورپ کو لرزا دیا تھا۔ ہماری ہی قوم ہے جس نے تمام ہندوستان کو اپنی تلوار سے فتح کیا .... جو جوش بنگالہ میں پیدا ہوا ہے وہی جوش راجپوتوں یا پشاور کے پٹھانوں میں پیدا کر دو تو وہ لوگ کیا صرف قلم کی گھس گھس اور زبانی بک بک پر بس کریں گے۔"

مسلمانوں کو مخاطب ہو کر کہا کہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ علم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں اور تعداد میں کم ہیں تو یہ غلط خیال کر کے کہ کانگریس کے مطالبات سے سب کو فائدہ ہو گا اپنی حالت کو بھول کر نقصاندہ جماعت میں شرکت کریں ایسا کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

"...... جب یہ حال ہماری قوم کا ہے تو آیا یہ مناسب ہے کہ تم ایسے امور میں شامل ہو اور اس بے ہودہ خیال سے کہ اگر یہ درخواستیں منظور ہو جاویں گی تو ہندوستان کی تمام قومیں ان سے فائدہ اٹھاویں گی اپنی حالت کو نظر سے گرا دو اور آئندہ کے نتائج سوچے بغیر چلاتے پھرو کہ چلو مدراس! چلو مدراس ہرگز مناسب نہیں"

(ایضاً)

میرٹھ لیکچر:

کانگریس کو
مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں

سرسید نے لکھنؤ تقریر کے ایک سال بعد میرٹھ میں جلسۂ عام میں دوسری اہم سیاسی تقریر فرمائی۔ یہ دونوں تقاریر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کی اساس بن گئیں۔ صدیوں تک ان تقاریر کا اثر ہندوستان کی سیاست پر پڑتا رہے گا۔ وقتی طور سے کچھ سالوں کے لیے ضرور ان خیالات کو مسلمان بھول گئے جو سرسید نے اپنی ان دونوں تقاریر میں ظاہر کیے تھے لیکن یہ محض عارضی حادثہ ہے۔ مسلمان پھر سے پریشانیوں کے دور میں پھنس رہے ہیں لہٰذا صحیح نظریات اور راہِ عمل کی تلاش انہیں در سرسید تک لے جا رہی ہے۔

کانگریس کے بنتے وقت کوئی مسلمان اس میں شریک نہ تھا اور نہ کسی مسلمان سے اس کے اغراض و مقاصد کے بارے میں مشورہ کیا گیا تھا صرف انگریزوں اور ہندوؤں نے یہ مجلس قائم کی تھی اور دعویٰ یہ کیا تھا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے۔ سرسید نے اس خیال کی زبردست مخالفت کی اور کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت مانا اور اس کے مقاصد کو مسلمانوں کے لیے نقصاندہ ثابت کیا۔ لیکن کانگریسی اخبارات اور بنگالی ہندو ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ اس جماعت میں مسلمان بھی شریک ہیں اور یہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی علمبردار ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ یہ خام خیال دور کیا جائے۔ دراصل یہ پروپیگنڈہ ایک نہایت دانشمندانہ سیاسی چال تھی کہ ہندو اکثریت کے ساتھ مسلم اقلیت بھی ان مطالبات میں شامل ہو جائے جو

مسلمانوں کے بیحد درجہ متفر تھے۔ ۱۴ مارچ ۱۸۸۸ء کو سرسید نے جو تقریر میرٹھ میں مسلمانوں کے جلسۂ عام میں کی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس غلط خیال کو رفع کیا جائے۔ سرسید نے صاف الفاظ میں ظاہر کیا کہ اول تو کوئی مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہے اور جو چند لوگ اس میں شریک ہوئے ہیں وہ کسی لالچ یا انگریزوں اور ہندوؤں کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ سوائے طیّب جی کے اور تمام لوگ کرائے کے آدمی ہیں:

"آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ مدت سے ہمارے بنگالی دوست پولیٹکل معاملات میں نہایت گرمجوشی ظاہر کر رہے ہیں۔ تین برس ہوئے کہ انہوں نے بہت بڑی مجلس قائم کی ہے جس کا جا بجا اجلاس ہوتا ہے اور اس کا نام انہوں نے نیشنل کانگریس رکھا ہے۔ ہم نے کبھی کسی آرٹیکل میں یا کسی اسپیچ میں یا کسی مقام پر زبانی بات چیت میں ان کے کاروبار میں جو وہ کر رہے تھے ہرج نہیں ڈالا۔ لیکن ہمارے بنگالی دوستوں کی طرف سے ہماری قوم پر بے جا اور نا واجب دست اندازی ہوئی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس بے جا دست اندازی کو ظاہر کریں اور اپنی قوم کو اس کی مفرتوں سے محفوظ رکھیں۔ .... ہماری قوم اب تک چپ چاپ بیٹھی تھی اس کو غرض نہیں تھی کہ بنگال کے بابو اور شمال مغربی اضلاع کے ہندو کیا کر رہے ہیں۔ مگر انہوں نے بعض اضلاع میں مسلمانوں پر کانگریس میں شریک ہونے کے لیے دباؤ ڈالا ہے۔ کسی ضلع میں حکومت کے دباؤ سے وہ (مسلمان) مجبور ہوئے، کسی ضلع میں ان کو اس طرح دبایا گیا کہ بغیر ان کی (ہندوؤں کی) شرکت کے ان کا کام جو وہ چلانا چاہتے ہیں چل نہیں سکیگا یا ان لوگوں نے خود یہ سمجھا کہ بغیر ان کی شرکت کے روٹی ملنی مشکل ہے روپیے کا لالچ دینے سے بھی انہوں نے کوتاہی نہیں کی۔ .... کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا کہ دو چار مسلمان جو ممالک مغربی و شمالی

کے ان کے ساتھ ہوئے وہ کون ہیں... ان کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں کہ
وہ کرائے کے آدمی ہیں۔ سوائے بدرالدین طیب جی کے جو نہایت بزرگ
ہیں اور جن کا میں نہایت ادب کرتا ہوں کوئی سربرآوردہ رئیس اس
میں شریک نہیں ہوا۔" ¹

سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ نیشنل کانگریس کے لوگ آسمان کے تارے بن جائیں تو ہمیں کوئی غم نہیں ہے مگر شرم آمیز طریقوں سے مسلمانوں کو اس میں شامل کرنے کی کوشش کرنا نازیبا حرکت ہے اور ہندوؤں کو سمجھنا چاہئیے کہ وہ ضرور مسلمانوں سے اچھی حالت میں ہیں لیکن دوڑ کر مسلمانوں سے آگے نہیں نکل سکتے:

"نیشنل کانگریس کے ممبر آسمان کے تارے ہو جاویں یا وہ سورج بن جاویں ہم خوش ہیں لیکن ہماری قوم کے دو چار آدمیوں کو ناواجب طور سے اور شرم آمیز دباؤ اور لالچ سے اپنے ساتھ ملاکر یہ دکھلانا چاہیں کہ مسلمانوں کی قوم کی قوم ان کے ساتھ ہے تو اس کا دفع کرنا ہم پر ضرور واجب ہے ...... ہمارے ملک کے ہندوؤں کو سمجھنا چاہیئے کہ ان کی حالت گو مسلمانوں سے کسی قدر اچھی ہے لیکن ایسی اچھی نہیں ہے کہ وہ دوڑ کر ہم سے آگے نکل جاویں گے۔" (ایضاً)

سرسید یہ سمجھتے تھے کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو کیا ہونا ہے سوائے اس کے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں اور دونوں مل کر سکون سے حکومت نہیں کر سکتے:

"فرض کرو انگریز چلے گئے تو ہندوستان میں کون حاکم ہوگا؟ کیا ایسی حالت میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک گدی پر بیٹھ کر برابر درجہ پر رہ سکیں گی؟ ہرگز نہیں ضرور ہوگا کہ دونوں میں سے ایک دوسری کو مغلوب

---

¹ (مجموعۂ لیکچرز مرتبہ امام الدین گجراتی صفحہ ۲۱۲)

کر لے یاد بالے اور یا یہ ہو کہ دونوں برابر رہیں یہ امر ناممکن اور امر محال ہے ...... جب تک ایک قوم دوسری قوم کو زیر نہ کر لے گی اور تابعدار نہ بنا لے گی ملک میں امن نہ ہو گا ...... اے میرے دوستو! مسلمان بھائیو! تمہارے بزرگوں نے ملک فتح کئے ہیں غیر قوموں پر حکومت کی ہے یورپ پر حکومت کی ہے تم جان سکتے ہو کہ حکومت کیوں کر قائم رہ سکتی ہے۔" (ایضاً)

آگے چل کر سرسید نے بیان کیا کہ شمالی ہند کے ہندو ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور بنگالی ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں ہمیں انگریزوں کا ساتھ مذہب کی رو سے دینا چاہیئے۔ سرسید نے شاید پہلی مرتبہ قرآنی آیت کا حکم بیان کر کے مسلمانوں پر یہ فرض بتایا کہ بمقابلہ ہندوؤں کے ان کو عیسائیوں کا ساتھ دینا چاہیئے کہ قرآن فرماتا ہے کہ مسلمان پائیں گے عیسائیوں کو زیادہ دوست اور ہمارد مشرکوں اور یہودیوں کے مقابلے میں اور کوئی مسلمان قرآن کے حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتا:

"بنگالیوں کی کارروائیوں کو ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے ہمارے ملک کے ہندو بھائی ہم کو چھوڑتے اور بنگالیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں پس ہم کو اس قوم کے ساتھ شریک ہونا چاہئے جس کے ساتھ ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریز اہل کتاب نہیں ہیں کوئی مسلمان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اگر ہو سکتے ہیں تو عیسائی ہیں (قرآن کی آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے،" تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کی دشمنی میں یہود اور مشرکوں کو اور تو پاوے گا سب سے نزدیک مسلمانوں کی محبت میں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم لوگ نصاریٰ ہیں یہ اس واسطے کہ وہ عالم اور درویش ہیں اور یہ کہ متکبر نہیں ہیں"")

آگے خیال ظاہر کیا کہ جو لوگ قرآن پر یقین رکھتے ہیں وہ تو ایمانی اور قرآنی

احکام کی روشنی میں انگریزوں سے دوستی رکھیں گے اور ان کی حکومت کو استحکام دینے کی کوشش کرتے رہیں گے:

"جس شخص نے قرآن شریف پڑھا ہوگا اور جس کو اس پر یقین ہوگا ڈ جاسکتا ہے کہ ہماری دوستی ہماری محبت کسی دوسرے مذہب والی قوم سے اس قدر نہیں ہوسکتی جتنی کہ عیسائیوں سے۔ اس وقت ہماری قوم خراب حالت میں ہے دولت کے لحاظ سے اور علم کے لحاظ سے لیکن خدا نے اپنی مہربانی سے نور ایمان ہم کو دیا ہے قرآن ہماری ہدایت کے لیے موجود ہے جس نے ہم کو ان کا اور ان کو ہمارا دوست بنایا ہے۔ اب خدا نے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے پس ہم ان سے دوستی کریں اور وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو ہندوستان میں استقلال اور استحکام رہے اور بنگالیوں کے ہاتھ میں نہ جاوے۔ یہی ہماری دوستی ہمارے عیسائی حاکموں کے ساتھ ہے"

فرمایا کہ جو لوگ ہم کو پسماندگی کے گڑھے میں ڈالنا چاہتے ہیں ان کا ساتھ نہ دیں کہ بنگالیوں کی کارروائیوں سے ہماری قوم کو شدید نقصان پہنچنے والا ہے۔ ہم کو ہندوؤں کا تابع ہونے کی بجائے عیسائیوں کا تابع ہونا چاہیے:

"اور جو لوگ ہم کو گڑھے میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ شریک ہوں ایسی حالت میں کہ بنگالیوں کی کارروائیوں سے ہماری قوم کو نقصان پہنچنے والا ہے ہم مطیع الہنود ہونا بجائے مطیع اہل کتاب ہونے کے پسند نہ کریں اور جہاں تک ہم سے ہوسکے ہم انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں" (ایضاً)

سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ شمالی جنوبی اور مغربی ہند کے ہندو تمام کے تمام مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر بنگالی ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں لہٰذا ہمیں بھی صرف ایک جماعت جو بچتی ہے یعنی انگریزان کا ساتھ دینا چاہیے کہ قرآن بھی انہیں سے دوستی کرنے کی ہدایت کرتا ہے:

"ہمارے ملک کے ہندو بھائی اور بنگال کے بنگالی اور بمبئی کے برہمن اور

مدراس کے ہندو مدراسی اگر ہم سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں ان کو علیحدہ ہونے دو اور کچھ پرواہ مت کرو ...... ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی کی توقع ہے وہ انگریزوں سے ہے بنگالی ہماری قوم کی کچھ بھلائی نہیں کر سکتے قرآن مجید بھی انہیں سے دوستی کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے دوست نہ ہوں بلکہ ہم پر لازم ہے کہ جو کچھ خدا نے کہا ہے ہم اس کی تعمیل کریں،،

حکومت سے شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ گورنمنٹ سے شکایت تو ہوتی ہی ہے اور ان شکایتوں کے دور کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں کی جائیں بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ تعلیم کی طرف توجہ رکھیں:۔

،، پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں پس ہم کو اپنی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیے،،

علمی طور سے پسماندہ ہونے کے علاوہ مسلمان تجارت میں بھی ہندوؤں اور انگریزوں سے بہت پیچھے تھے لہٰذا سرسید نے اس سلسلہ میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کو تجارت میں بھی آگے آنا چاہیئے۔ ان کی رائے میں دوکانداری سے بہتر مسلمانوں کے لیے بڑی تجارت ہے اور ان کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہے لہٰذا انگریزوں سے تجارت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے:

،، اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے جو تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے وہ انہیں کے پاس رہنے دو کیونکہ نہ ہم سے دوکان پر بیٹھ کر آٹا دال بیچا جاویگا۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کو ان کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرو۔ ان سے

کہدو کہ اب آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا چمڑا انگلستان لے جائینگے اور وہاں بیچینگے۔ ہمارے ملک کے جانوروں کی ہڈیاں تم مت چنو ہم خود چنینگے اور امریکہ لے جاوینگے،،[۱]

اتنے واضح اور صاف خیالات کے باوجود ہندوستان میں بہت سے مسلم دانشوروں نے سرسید کے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید اسی نظریۂ قومیت کے ماننے والے تھے جس پر کہ کانگریس کی بنیاد ہے اور جس پر بعد کو بعض علماء دیوبند نے سندوی۔ ان علماء میں مولانا حسین احمد مدنی کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے کہ انہوں نے قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیا۔ جو نظریہ مغرب میں پروان چڑھا اور ترکوں و عرب مسلمانوں میں جنگوں کی بنیاد بنا۔

ہندوستان میں یہ نظریہ ہیوم وغیرہ کی وجہ سے مقبولِ عام ہوا پروفیسر خلیق احمد نظامی سرسید کو اسی نظریۂ وطنیت کا ماننے والا بتلاتے ہیں جو ہمارے خیال میں بالکل الٹی تفسیر سرسید کے خیالات کی ہے اتنے سے فرق کے ساتھ کہ سرسید نے کبھی فلسفیانہ بحث اس نظریہ پر نہیں کی بلکہ وہ ہر نظریہ کو مسلمانوں کیلیے فائدہ و نقصان کی کسوٹی پر پرکھتے تھے اور اسی بنیاد پر کسی خیال کو تسلیم یا مسترد کرتے تھے۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں :

،، سرسید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلو اُن کا تصور قومیت ہے۔ انہوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلہ میں بار بار دہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ پہلے نظریہ کی پر زور تائید ان کے انتقال کے ۳۷ سال بعد دیوبند سے ہوئی۔ جب مولانا سید حسین احمد مدنی نے نہایت شد ومد کے ساتھ اعلان کیا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اور علامہ اقبال نے اس پر بڑی حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا،،[۲]

مندرجہ بالا بیان علمی کذب اور ابن الوقتی کی نایاب و نادر مثال ہے

---

[۱] (ایضاً صفحہ ۳۲۴) [۲] (سرسید اور علی گڑھ تحریک صفحہ ۶۹)

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا قیام

سرسید نے کانگریس کے مضرت رساں عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک سیاسی انجمن مثل کانگریس کے تشکیل دی تھی۔ اس جماعت کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن تھا اور اگست ۱۸۸۸ء میں بمقام علیگڑھ اس کا قیام ہوا جو سرسید اس کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس ایسوسی ایشن میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک میں شامل تھے۔ جس میں راجہ شیو پرشاد مہاراجہ بنارس اور منشی نول کشور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک بہت زیادہ کامیاب رہی۔ اسلامی انجمنوں کے مراسلے کے جواب میں جس میں سرسید نے کانگریس کے مطالبات کے خلاف تحریک چلانے اور عوامی جلسوں کا اہتمام کرنے کی درخواست کی تھی، ملک کے کونے کونے میں جلسوں کا انعقاد کیا گیا اور کُل مسلمانوں نے کانگریس کے ان مطالبات کی ضرر رسانی کا بخوبی اظہار کیا اور سرسید کو ان جلسوں کی اطلاعات بھیجیں۔ ۱۸۸۷ء کے بعد کے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان بے شمار جلسوں کی تفصیلی رپورٹیں کثرت سے ملتی ہیں۔ سب کا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا بغرضِ مثال چند جلسوں کی کارروائی کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ سرسید کی یہ تحریک کس قدر کامیاب رہی۔

جونپور کا جلسہ جونپور میں ایک جلسہ ہندو اور مسلمانوں کا ہوا۔ جس میں راجہ شنکر دت، مولوی محمد ابراہیم اور بابو دامودر داس وغیرہ نے شرکت کی۔ صدر جہ ذیل رزولوشن پاس کیا گیا

"جونپور کے مسلمان اور ہندو نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی نہیں کرتے"۔ اس کی تحریک مولوی محمد ابراہیم اور تائید بابو دامودر داس نے کی۔[1]

لاہور کا جلسہ اگست ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس کی رپورٹ کرتے ہوئے گزٹ میں سید نے لکھا۔

---

[1] گزٹ مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۸۸ء۔

"ہم کو اس بات کی نہایت خوشی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے قدیم اور سب سے اول انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک عام جلسہ میں ایسوسی ایشن کے ساتھ نہایت جوش اور قوت سے اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے۔ ہم انجمن اسلامیہ لاہور کو اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ متفق رہنے پر مبارکباد دیتے ہیں"

بمبئی کا جلسہ بمبئی میں بھی کانگریس کے خلاف بہت جوش پایا جاتا تھا اور وہاں کے مسلمانوں نے بالاتفاق سرسید کی آواز پر لبیک کہا۔ طیب جی وغیرہ کی ایک نہ چلی بلکہ کانگریس کے خلاف رزولوشن پاس کیا گیا۔ سرسید اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بمبئی کے مسلمانوں نے کانگریس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے دو مسلمان ایسوسی ایشنوں کے جلسے اس امر پر غور کرنے کے لیے منعقد کئے گئے کہ آیا ان کو کانگریس میں نمائندے بھیجنے چاہئیں کہ نہیں۔ ان میں سے ایک جلسہ میں بدرالدین طیب جی نے اس امر کی تائید میں کہ مسلمان نیشنل کانگریس میں شریک ہوں ایک طویل گفتگو کی مگر اس پر بھی جلسہ نے ایک رزولوشن برخلاف ان کی صلاح کے پاس کیا۔ یہ نتیجہ نہایت مسرت بخش ہے اور اب اس بات کا دعوی کرنا ناممکن ہوگا کہ ہندوستان کے کسی حصہ کے مسلمان کانگریس میں شریک ہیں"[1]

جونپور کا جلسہ اخبار مارننگ پوسٹ الہ آباد نے ایک خبر شائع کی کہ وہاں پر پانچ ہزار مسلمانوں کا جلسہ ہوا اور انھوں نے کانگریس میں شرکت منظور کی اور کانگریس کی حمایت میں رزولوشن پاس ہوا۔ لیکن اگلے دن پائنیر میں اس خبر کو غلط قرار دیا گیا کہ جونپور میں ایسا کوئی جلسہ منعقد ہوا ہے۔ سرسید نے اس پر لکھا۔

"یہ خبر ایک بہت بڑا مذاق ہے۔ خود نیشنل کانگریس ایک بڑا مذاق ہے اس نے بلاشبہ مذاق کی بہت سی باتوں سے ہمیں خوش کیا ہے اور غالب ہے کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ خوش کریگی اور اس بات کے دیکھنے سے کہ محمد علی بھیم جی ان اضلاع میں ایک دورے میں مصروف ہوں اور مسلمانوں کو اپنے خیالات کی طرف مائل کرتے ہوں نہایت لطف معلوم ہوتا ہو

---

[1] گزٹ ۱۰ اگست ۱۸۸۸ء ص

اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ جن لوگوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے جیسی کہ چار کو ایک کے ساتھ نسبت ہے ان کو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ سے فائدہ حاصل ہوگا ایک دوسرا بڑا امر واقعی ہے کہ جن شخصوں یعنی ہندوؤں کی تعداد کثیر ہے وہ اکثر ان سادہ مزاج آدمیوں پر خوب ہنستے ہیں جو اس پر یقین کر لیتے ہیں کہ کانگریس کی کامیابی سے مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔"

کانگریس لیڈران کا تمسخر اڑاتے ہوئے سرسید نے ازراہ طنز لکھا کہ!

"کسی دن پنڈت صاحب موصوف ہندوستان کے شہنشاہ اور مسٹر ہیوم ان کے وزیر اعظم اور مسٹر سریندر ناتھ بنرجی بنگالہ کے گورنر ہوں گے ہندوستان کے پولیٹکل معاملات اب تک نہایت سست اور بے رونق رہے ہیں اور ہم کانگریس والے دوستوں کے اس لحاظ سے کسی قدر شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس بے رونقی کو کسی قدر رفع کیا ہے۔"[1]

ناگپور کا جلسہ

انجمن ناصر الاسلام ناگپور کی طرف سے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا اور اس میں پاس شدہ حسب ذیل رزولوشن بخدمت سرسید احمد خاں ارسال کیا گیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ کانگریس ملک کے تمام طبقات کی نمائندہ نہیں ہے اس لیے اسے سب کی طرف سے بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

"اس انجمن کی رائے یہ ہے کہ فرضی نیشنل کانگریس کے مقاصد اور کارروائی کے باعث سے بدخواہی اور ناراضی کا ایک عام جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ اول تو عام ہندوستانیوں کے حق میں اور دوم خاص مسلمانوں کے حق میں مضر ہے۔ کانگریس کی خواہش بیس کروڑ انگریزی رعایا کی خواہش نہیں ہے اس کا یہ عام دعویٰ ہے کہ اس کو ہندوستان کے باشندوں کی میجارٹی کی طرف سے گفتگو کرنے کا حق حاصل ہے۔ باطل ہے۔ پس یہ جلسہ اس کی تمام کارروائیوں کی نسبت اعتراض کرتا ہے اور اس کے کسی کام میں کسی طور پر شریک ہونے سے انکار کرتا ہے۔۔۔ یہ انجمن اپنے تئیں انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ساتھ شامل کرتی ہے اور اس کے مقاصد و اغراض کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔۔۔ اس رزولوشن کی نقل آنریبل سرسید احمد خاں کی خدمت میں بھیجی جاوے۔"[2]

۱؎ گزٹ جولائی ۱۸۸۸ء ص ۶۹۰ ۔ ۲؎ گزٹ دسمبر ۱۸۸۸ء ص ۱۳۰۲

لدھیانہ کا جلسہ

لدھیانہ میں دس دسمبر ۱۸۹۳ء کو ایک جلسہ انجمن اسلامیہ پنجاب کی جانب سے منعقد کیا گیا اور کانگریس کے مقاصد و مسلمانوں کے مفادات میں تضاد کا اظہار کیا گیا۔

رزولوشن ۔ مسلمانانِ پنجاب خیال کرتے ہیں کہ نیشنل کانگریس ان کی پولٹیکل اغراض کے بالکل برخلاف ہے اور نیز مجموعی طور سے پورے ملک کے لیے فائدہ بخش نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس صوبے کے مسلمانوں کو کانگریس کے اجلاس سے جو لاہور میں منعقد ہوگا کوئی تعلق نہیں ہے۔؎۱

مدراس کا جلسہ

مدراس میں ایک عظیم الشان عوامی جلسہ ۲۶ اگست ۱۸۹۳ء کو زیر صدارت سید نظام الدین منعقد ہوا۔ اس میں خاص طور سے اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلمان کسی پولٹیکل ایجیٹیشن میں ہندوؤں کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے اس لیے کہ دونوں کے مفاد متضاد ہیں اور دونوں میں شدید پولٹیکل اختلاف بسبب کانگریس کے مطالبات کے موجود ہے اور جو بھولے بھالے مسلمانوں کو پکڑ کر کانگریس کے جلسوں میں شریک کیا جاتا ہے غلط ہے اور تمام مسلمانوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہو سکتے۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ باشندے دو فرقوں میں منقسم ہیں یعنی ایک فرقہ معتدل رائے رکھنے والے مسلمانوں کا جو یہ بات چاہتے ہیں کہ ملک کی ترقی اس کے حاکموں کے اختیار میں چھوڑ دی جائے اور دوسرا فرقہ پرجوش ریڈیکلوں کا ہے جو نہایت وسیع حقوق چاہتے ہیں فرقہ آخر الذکر میں بابو اور برہمن شامل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کے نیک و بد کے انتظام کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ کانگریس کی تحریک کے جاری ہونے کے بعد دنیا کو اس بات کا یقین دلانے کے واسطے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی پولٹیکل اختلاف موجود نہیں ہے بڑی سرگرمی اور استقلال کے ساتھ کوشش کی گئی ہے بھولے بھالے مسلمان شارع عام اور گلی کوچوں سے پکڑ کر ہندوؤں کے مجمعوں میں شامل کیے گئے ہیں چنانچہ حال کے ایجیٹیشن کی نسبت بھی اسی قسم کی کارروائی کی جاتی ہے

؎۱ گزٹ دسمبر ۱۸۹۳ء ص ۲۰۸ ؎۲ گزٹ ستمبر ۱۸۹۳ء ص ۱۹۵

لیکن تمام مسلمان ایسوسی ایشنوں نے بغیر شک و شبہ کے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مسلمان پولیٹیکل مقاصد کو ایجیٹیشن کے ذریعہ سے پورا کرنے کی غرض سے ہرگز ہندوؤں کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے۔"

مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ

قصہ مختصر سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک کے زیر اثر ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں نے جلسے منعقد کئے اور متفقہ طور پر کانگریس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سرسید نے ان فیصلوں پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ سب نے متفقہ طور سے ہمارے فیصلہ کا ساتھ دیا۔

"نیشنل کانگریس پر جس کو بنگالیوں نے اور اور لوگوں نے قائم کیا ہے تمام ہندوستان میں بخوبی بحث ہو چکی ہے۔ بنگالہ، بہار، اضلاع شمال و مغرب، اودھ، پنجاب، مدراس اور بمبئی کے گروہ کثیر اور ذی وقعت و ذی وجاہت مسلمانوں نے نہایت سختی سے اس کی مخالفت ظاہر کی ہے۔ اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس اور اس کے مقاصد ملک کے لیے اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے نہایت خطرناک ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس ملک کے ذی وجاہت اور ذی وقعت ہندو صاحب بھی اس امر میں مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں۔ اودھ کے ذی رعب ہندو مسلمان تعلقداروں نے بالاتفاق کانگریس کے مقاصد سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ ہز ہائی نس مہاراجہ بنارس جو ہندوؤں کے بہت بڑے مقدس شہر کے مہاراجہ ہیں ایک بہت بڑی میٹنگ میں جس میں اس شہر کے تمام معززین جمع تھے کانگریس سے ناراضی اور اختلاف ظاہر کیا ہے۔ بالفعل بمبئی میں مسلمانوں کے دو بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے ہیں جن میں سے ایک میں ہز ہائی نس آغا اکبر خاں شاہ صدر تھے ۔ اور ایک مجلس ناخدا محمد علی کے مکان پر ہوئی اور سب نے کانگریس سے اختلاف کیا اور اپنی شرکت سے انکار کر دیا۔"[1]

سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ بالفرض کانگریس کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ایسے حالات پیدا ہوں گے جو کہ خیال میں بھی نہیں آ سکتے اور ہو سکتا ہے کہ حکومت کو سول کی بجائے فوجی حکمرانی

۱۔ گزٹ ۸ ستمبر ۱۸۸۸ء ص ۹۰۵

قائم کرنی پڑے۔ کانگریس انگلستان اور ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ کرتی ہے کہ تمام مسلمان اور ہندو اس میں شریک ہیں اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو کہ انگلینڈ اور ہندوستان کی عوام کو یہ بتائے کہ یہ دعویٰ غلط ہے

"علاوہ ان تمام وجوہات کے خاص مسلمانوں کی قوم کے ذی وجاہت اور ذی رائے اشخاص نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کانگریس کے مقاصد خاص مسلمانوں کے لیے ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی کہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہو جاوے نہایت درجہ مضر ہوں گے۔ بالفرض اگر کانگریس کے مقاصد پورے ہو جاویں تو ملک کے امن میں کس قدر خلل واقع ہوگا بیان کرنا نہایت مشکل ہے کچھ عجب نہیں کہ ایسے واقعات پیش آویں جو اس وقت خیال میں بھی نہیں آسکتے"[1]

درحقیقت ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ چالیس سالہ دورِ اقتدار میں جس قدر بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا جو فرقہ وارانہ فسادات اور دوسرے قسم کے ذات پات کے فسادات ہوئے وہ تاریخ کے تاریک ترین دور سے بھی زیادہ بھیانک ہیں۔ خاص طور سے ہندوستان کی تاریخ میں کسی ایسے زمانہ کی مثال نہیں ملتی جب کہ امن وامان میں فرقہ وارانہ بنیاد دل پر اس قدر خلل واقع ہوا ہو۔ بادشاہوں اور لڑاکوں کے درمیان جنگیں اور جھڑپیں ان میں ہوا قتل عام بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔

"جو اختلاف کہ ہندو مسلمان نے کانگریس سے کیا ہے اس سے اس ملک کے لوگ اور حکام بخوبی واقف ہیں مگر کانگریس والے غلط طور سے انگلستان میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ کل ہندو مسلمان ہندوستان کے رہنے والے کانگریس کے مؤید ہیں۔ بس ہم کو ضرورت ہے کہ ہم انگلستان کے لوگوں کو مطلع کریں کہ بہت سے مسلمان اور بہت سے ذی رعب و ذی وجاہت ہندو کانگریس کے برخلاف ہیں"[2]

انگلینڈ کی عوام کو مطلع کرنا

سرسید کا یہ نہایت دانشمندانہ اقدام تھا کہ ہندوستان کی عوام کے جائے سے ملک کے انتظام پر کوئی اثر پڑنے والا نہ تھا جبکہ خود برطانیہ کی عوام کی رائے کو نہ بدلا جائے کیونکہ وہی دراصل برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

ہندوستان کے اصل حکمراں تھے۔ اسی مقصد کے پیش نظر سر سید نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں نے بھی سر سید کا ساتھ دیا۔

"اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اور ہندو جو کانگریس کو ناپسند کرتے ہیں ایک ایسوسی ایشن بنام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کریں اور ہر شخص جو اس کا ممبر ہو پانچ روپیہ ماہواری چندہ دے اور نیز عالی ہمت لوگوں سے ڈونیشن کی درخواست کی جاوے۔۔۔ اس ایسوسی ایشن میں سوائے ہندو اور مسلمان کے اگر یورپین بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے تو نہایت احسان مندی سے ہم ان کی شرکت قبول کریں گے۔۔۔ لیکن کوئی شخص جو گورنمنٹ کا ملازم ہو اس میں شریک نہیں ہو سکتا پس جن بزرگوں کو اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونا منظور ہو لکھنؤ میں جناب منشی محمد امتیاز علی صاحب اور بنارس میں جناب راجہ شیو پرشاد صاحب سے اور علیگڑھ میں مسٹر بیک یا راقم سے خط و کتابت فرمائیں ہر ایک ممبر کا نام اور اس کا چندہ مشتہر ہوتا رہے گا۔"[1]

سر سید احمد خاں اس ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور آنریری ٹریژرار بنے۔ دراصل یہ انھیں کے ذہن کی پیداوار تھی لہٰذا انھیں کو اس کا کام بھی کرنا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں بھی جب کہ کالج ابھی بن ہی رہا تھا سر سید پر کتنا کام رہا ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس معمارِ قوم نے ان خطرات سے بھی مقابلہ کیا جو کانگریس کی وجہ سے مسلمانوں کو مستقبل میں درپیش ہونے والے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابھی ان نقصانات کا کوئی تجربہ بھی نہ ہوا تھا اور سب مستقبل کی باتیں تھیں لیکن پھر بھی سر سید نے پیش بندی کے طور پر مسلمانوں کو ان سیاسی خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا جو ان کو درپیش تھے۔ اس کے برخلاف آج مسلمان قوم میں ایک بھی شخص یا تنظیم ایسی نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کو پے در پے ہونے والے نقصانات اور عزتِ نفس پر حملہ کی شکایت ہی صحیح طریقہ سے حکومت میں پیش کر سکے۔ اس حالت کی وجوہات بہت تفصیل طلب ہیں لیکن مسلمانوں میں کوئی طاقتور تنظیم اس لیے ابھر کر نہیں آسکی ہے کیونکہ انھوں نے سر سید کی دانشمندانہ راہ کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کا ساتھ دینا پسند کر لیا جن سے سر سید اپنی زندگی کے آخری تیرہ سالوں میں جب سے کانگریس بنی: ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۸ء تک زندگی کی آخری سانس تک

---

[1] گزٹ ۱۸۸۸ء ۱۱، اگست ص ۹۹۵

لڑتے رہے اور اسی نظریۂ قومیت کو تسلیم کر لیا ہیں سے کہ سرسید نے اختلاف کیا تھا۔

ایسوسی ایشن کے قواعد

اس تنظیم کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہوگا اور مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ بذریعہ چھاپنے اور تقسیم کرنے پمفلٹوں اور دیگر قسم کے کاغذات کے ممبرانِ پارلیمنٹ اور انگریزی اخبارات اور گریٹ برٹن کے لوگوں میں ان غلط بیانیوں کی اصلاح کرنا جن کے ذریعہ کانگریس نے غلط طور پر انگلستان کے لوگوں کو اس بات پر یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ کل قومیں ہندوستان کی مقاصدِ کانگریس پر متفق ہیں۔

۲۔ مسلمانوں اور انجمن ہائے اسلامی اور ان ہندوؤں اور ہندو انجمنوں کے خیالات سے جو کانگریس کے مقاصد کے برخلاف ہیں اسی ذریعہ سے ممبرانِ پارلیمنٹ اور گریٹ برٹن کے اخبارات اور وہاں کے لوگوں کو اطلاع دینا۔

۳۔ ہندوستان کے امن و امان اور برٹش گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں سے ان برے خیالات کا دور کرنا جو حامیانِ کانگریس ہندوستان میں پھیلاتے ہیں۔

۴۔ ہندوستان کے والیانِ ملک جو اس ایسوسی ایشن کی تجاویز کو پسند فرماویں گے ان سے درخواست کی جاوے گی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کا پیٹرن ہونا منظور فرماویں۔

۵۔ کوئی شخص جو گورنمنٹ کا ملازم ہو اس ایسوسی ایشن کا ممبر نہ ہو سکے گا۔

۶۔ انجمن ہائے اسلامی اور ہندو انجمنوں کے نام جو ایسوسی ایشن کے ساتھ متفق ہوں گے ایک جداگانہ فہرست میں مندرج ہوں گے۔

۷۔ ہر ایک پمفلٹ کے ساتھ ایسوسی ایشن کے ممبروں اور ڈونیشن دینے والوں اور انجمن ہائے مذکورہ بالا کی فہرستیں چھاپ کر انگلستان کے لیے مرسل ہوں گی۔

کل چودہ قواعد قرار پائے تھے آخری قانون سرسید کی سکریٹری اور ٹریژرارشپ سے متعلق تھا۔

۱؎ جب تک کہ کوئی دوسری تجویز ہو آنریبل سرسید احمد خاں بہادر کے سی، ایس آئی، ساکن علیگڑھ ایسوسی ایشن کے آنریری سکریٹری اور ٹریزرار رہیں گے اور تمام خط کتابت متعلق ایسوسی ایشن ان سے ہوگی۔۱؎

اس ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد سرسید نے بہت تندہی سے اس کے کام کو آگے بڑھایا اور کوئی اسلامی انجمن ایسی نہ رہی جو اس ایسوسی ایشن کی ممبر نہ بنی ہو اور بالعموم اس کا خیر مقدم جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ اس کامیابی پر سرسید نے جا بجا اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ سرسید کے انہماک اور جانفشانی کا اندازہ اُس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اردو اخبارات کے ایڈیٹرز کو لکھا تھا۔ اس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ جو مضمون یا خبر ایسی چھاپیں جو ایسوسی ایشن کے مقاصد سے مماثل ہو از راہ امداد اور ہمدردیٔ قوم ان کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کا ترجمہ کرا کے انگلینڈ بھیجا جا سکے۔

"بخدمت ایڈیٹران اردو اخبارات!

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قواعد میں جو انگلستان کو بغرضِ اشاعت بھیجے جاویں گے یہ قاعدہ بھی قرار پایا ہے کہ جس اردو اخبار میں کوئی مضمون یا آرٹیکل ایسا چھپے جو ایسوسی ایشن کے مقاصد کا حامی ہو یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی مجلسوں کی ایسی خبریں یا اجلاسوں کی روداد چھپیں تو ان کا انگریزی ترجمہ بھی بطورِ مناسب اس رسالہ میں مندرج ہوا کرے۔ پس میں ایڈیٹرانِ اردو اخبارات سے درخواست کرتا ہوں کہ جس اخبار میں اس قسم کا مضمون چھپے وہ بطور عنایت اور بہ نظرِ امداد ایسوسی ایشن سے بندہ کے پاس بھیج دیا کریں۔"۲؎

اپنے قریبی دوستوں کو خطوط کے ذریعہ ایسوسی ایشن کا ممبر بننے کی ترغیب دی، دلی جامع مسجد کے امام سید محمد بخاری کو خط میں لکھتے ہیں۔

"برادر صاحب عزیز و شفیق من ۔۔۔!

"جو ایسوسی ایشن برخلاف ہندوؤں کے ہم نے قائم کی ہے اس میں تمہارا شریک ہونا نہایت ضرور اور مناسب ہے۔ مقدار چندہ کتنا دینے کی ہے صرف بارہ روپے سال دینے ہوں گے پس منظوری سے اطلاع دو کہ تمہارا نام ممبروں میں درج ہو اور بارہ روپیہ بھیج دو۔"۳؎

۱؎ گزٹ اگست ۱۸۸۸ء ص ۹۶۰ ۲؎ گزٹ اگست ۱۸۸۸ء ص ۹۶۰ ۳؎ مکتوبات سرسید ص ۲۲۸

اس ایسوسی ایشن نے ایک تحریک یہ چلائی کہ مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک درخواست برطانوی پارلیمنٹ بھیجی جائے جس میں جتایا جائے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں اور ان کے الگ مطالبات ہیں۔ مسلمان کانگریس کو اپنے حقوق کی علمبردار نہیں سمجھتے۔ لاکھوں مسلمانوں نے اس پر دستخط کر دیئے اور مسلمانوں کا اجماع سرسید کی اس اپیل پر ہو گیا تمام فرقے سنی وہابی، غیر وہابی، شیعہ وغیرہ سب کے سب سرسید کی اپیل پر متفق ہو کر کانگریس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سرسید احمد کے نزدیک اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا۔ لکھوکھا مسلمانوں نے ان کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں"[1]

مہاراجہ بنارس کی تقریر

شروع ہی میں سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک میں مہاراجہ بنارس اور ان کے منیجر راجہ شیو پرشاد نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ ایسوسی ایشن کے ممبر بھی رہے اسی سلسلہ میں بنارس میں ایک جلسہ شہر کے معززین کا منعقد کیا گیا جس میں مہاراجہ بنارس کرسیٔ صدارت پر رونق افروز رہے اور راجہ شیو پرشاد نے ان کی طرف سے تقریر پڑھ کر سنائی۔

"بھائیو ...! میری عادت اسپیچ کرنے کی نہیں ہے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں خاموش نہیں رہ سکتا ہیں دیکھتا ہوں کہ چند آدمی متفق ہو کر ہمارے عزیز ملک ہندوستان کے سر پر بربادی ذلت اور بے عزتی لانا چاہتے ہیں چونکہ میں اس ملک کا ایک ناچیز باشندہ ہوں لہٰذا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں اس خطرے سے جو ہم پر نازل ہونے والا ہے خبردار کروں کہ تم اپنے تئیں کنوئیں میں گرانا چاہتے ہو؟ ... میں کہتا ہوں کہ تم اپنے تئیں بچاؤ میں نے سنا ہے کہ چند شخصوں نے نیشنل کانگریس قائم کی ہے اور وہ ریپریزنٹیشن اور ڈیلیگیٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ خود میں ان لفظوں کے معنی نہیں سمجھتا ہوں تو میں کیونکر تمہیں سمجھا سکتا ہوں ... اگر تم یہ بات کہو کہ اس میں بہت سے ایم۔ اے اور بی۔ اے شریک ہیں تو وہ بے پر کے پرند ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ

---

[1] حیات جاوید ص ... ماخوذ مارننگ پوسٹ، اگست ۱۸۸۸ء و جولائی ۱۸۸۸ء

شاید شل اس کے چاہتے ہیں جیسی کہ امریکہ میں قائم ہے گو وہ بالفعل ایسا نہیں کہتے لیکن جس حالت میں وہ ہماری ملکہ معظمہ کی تعریف گاتے ہیں تو وہ اندر سے حضور ممدوحہ کی برائی کے خواہاں ہیں کوئی شخص جس میں ذرا سی بھی عقل ہے لاحاصل اور بے فائدہ کام میں مصروف نہ ہوگا۔[۳۲]

سرسید نے راجہ صاحب بنارس کی ایسوسی ایشن میں شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہندوؤں میں قابل و معزز آدمی ہمارے ساتھ ہوگیا ہے۔

شمالی اضلاع کے ہندوؤں کا ایک ایسا سرگروہ مل گیا ہے جس پر ہر ایک قوم فخر کرسکتی ہے مہاراجہ ممدوح پیچ دار فقرات کا استعمال کرنا پسند نہیں کرتے اور اپنے مسائل کو مثل ایک سپاہی کے صاف صاف ظاہر کرتے ہیں۔ کانگریس والے بڑے بڑے جملے اور بڑے بڑے فقرے استعمال میں لاتے ہیں جن کے معنی ان میں بیس میں سے ایک شخص بھی نہیں سمجھتا۔[۳۳]

راجہ بھنگا کی حمایت

راجہ بھنگا بھی مہاراجہ بنارس کی طرح ذی وجاہت اور ہندوؤں میں معزز تھے اور ایک انگریزی کتاب "جمہوریت ہندوستان کے لیے موزوں نہیں" کے مصنف کی حیثیت سے انھیں شہرت حاصل تھی اس کتاب میں سرسید کی بیشتر تقریر اور ان کے خیالات سے اتفاق کیا گیا تھا۔ وہ بھی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ممبر تھے اور ان کی کانگریس تحریک میں حصہ لیتے تھے۔ انگلستان کی عوام کو کانگریس کے غلط پروپیگنڈہ سے باخبر کرنے کے لیے راجہ بھنگا نے اپنی کتاب کے ۹۰۰ نسخے سرسید کی خدمت میں ارسال کئے کہ ان کو مفت انگلستان میں تقسیم کردیں سرسید اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے گزٹ میں رقم طراز ہیں۔

"انھوں نے ازراہ عنایت اپنی مشہور اور بے نظیر کتاب کے ۹۰۰ نسخے بطور ڈونیشن ہماری ایسوسی ایشن کو اس غرض سے عنایت کئے ہیں کہ ہم ان کو بذریعہ اس ایسوسی ایشن کی ایجنسی کے جو انگلینڈ میں ہے انگلینڈ کے لوگوں میں تقسیم کریں۔ ہم اس عنایت کا جو انھوں نے ایسوسی ایشن پر فرمائی ہے شکریہ ادا کرتے ہیں۔"[۳۴]

---

۳۲ گزٹ جولائی ۱۸۸۸ء ص ... ۳۳ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۸ء ص ۳۲۰
۳۴ ایضاً

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں اختلاف

بائیس ۲۲ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو مہاراجہ بنارس نے ایک جلسہ تعلقدارانِ اودھ کا برخلاف کانگریس منعقد کیا۔ سرسید کو بھی اس جلسہ میں مدعو کیا گیا۔ سرسید اس میں شریک ہوئے لیکن مہاراجہ بنارس اور راجہ شیو پرشاد نے اس جلسہ میں ایسی تجاویز کیں جن سے ایسوسی ایشن کی بیخ کنی ہو گئی۔ انھوں نے بغیر کسی مشورہ کے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ایک نئی ایسوسی ایشن کا علاقائی ممبر قرار دیا۔ اس نئی ایسوسی ایشن کا نام انڈین لائلز ایسوسی ایشن تجویز کیا گیا۔ تجویز ہوا کہ انجمن خیر خواہانِ ہند زیر نگرانی مہاراجہ بنارس قائم ہو اور علی گڑھ کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اس کی ایک شاخ بنے لیکن سرسید نے جیسا کہ متوقع تھا اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنی ایسوسی ایشن کو قائم رکھا۔ دراصل یہ مہاراجہ بنارس کی چال تھی جس کے ذریعہ وہ سرسید کی کوششوں پر پانی پھیرنا چاہتے تھے۔ مگر سرسید پر چند آدمیوں کی مخالفت کا کیا اثر پڑ سکتا تھا جبکہ تمام ہندوستان کے مسلمان ان کے ہمنوا تھے۔ اس زمانے کے کچھ ہی دنوں کے بعد راجہ شیو پرشاد وغیرہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس جلسہ میں راجہ شیو پرشاد نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلمانوں کی دو الگ الگ انجمنیں بنائی جائیں اور مہاراجہ بنارس اس کے سرپرست قرار دیئے جائیں۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور لکھنؤ کی اینٹی کانگریس کمیٹی کو ختم کر کے انجمن خیر خواہانِ ہند بنائی جائے۔ سرسید اور مہاراجہ بھنگا اس کے دو جوائنٹ سکریٹری مقرر کئے جائیں۔ سرسید نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اخبار پانیر میں یہ خبر چھپی کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ختم کر دی گئی ہے اور گورنمنٹ کو درخواست گذارنے کا اختیار نئی انجمن کو سونپ دیا گیا ہے۔ اس خبر کی تردید کرتے ہوئے سرسید نے پورے جلسہ کی کارروائی اور اس میں پاس ہوئی تجویزوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

"یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن جو میں نے بصلاح دیگر بہی خواہانِ ملک کے قائم کی ہے اور جس کے ممبروں کی فہرست عنقریب میں آپ کے پاس بھیجونگا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں مگر بعض ہندو دوستوں نے مجھ سے شکایت کی کہ تم نے اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے اور قواعد بنانے میں عموماً ہندو صاحبوں سے جو نیشنل کانگریس کے مخالف ہیں صلاح مشورہ نہیں کیا جس سے وہ ناراض ہیں۔ میں نے کہا کہ جس طرح ان کی

ناراضی مٹ سکے میں تیار ہوں۔ اس پر ایک تحریری یادداشت جس پر منشی نول کشور صاحب کے دستخط میں مجھے پیش کی گئی"[۱]

اس درخواست میں دو تجویزیں تھیں کہ ایسوسی ایشن کے قواعد میں ترمیم اور از سر نو تشکیل کے لئے گفتگو ہونی چاہئے۔ اور یہ طے کیا جانا چاہئے کہ یہ انجمن کیا کیا کام کرے اور ہر کام کے لیے جداگانہ کمیٹیاں اور اس کے سکریٹری مقرر کئے جائیں۔ سر سید نے ان دونوں تجویزوں پر بحث کی اجازت دے دی۔

"میں نے اس تجویز کو منظور کیا اور جو جلسہ کہ بیس ۲۰ نومبر کو لکھنؤ میں ہوا اس میں حاضر ہوا لیکن برخلاف یادداشت کے راجہ شیو پرشاد نے یہ قرار دیا کہ لکھنؤ میں ایک مستقل سینٹرل ایسوسی ایشن بطور اینٹی کانگریس کے بذیر سرپرستی ہز ہائی نس مہاراجہ بنارس قائم ہو اور اس کا نام انڈین لایل ایسوسی ایشن رکھا جائے"[۲]

یعنی جو تجاویز سر سید کے سامنے رکھی گئی تھیں اس سے الگ ایک نئی تجویز منظور کرائی گئی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو کلیتہً ختم کرنا تجویز کیا گیا۔ سر سید کا خیال تھا کہ جتنی بھی انجمنیں کانگریس کے خلاف بنائی جائیں اس سے ان کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو فائدہ ہی ہوگا۔ انھوں نے نئی انجمن کی تشکیل کی مخالفت نہیں کی اور نئی انجمن کا سکریٹری بننا منظور کر لیا۔ لیکن اس تجویز کے بعد نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ ان میں پہلی یہ تھی کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ختم کر دیا جائے اور ایک برانچ نئی انجمن کی مانا جائے دوسری یہ کہ ایک درخواست حکومت کو بھیجی جائے جس میں کہا جائے کہ کانگریس کے لیڈران چونکہ ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں لہٰذا انھیں گرفتار کیا جائے۔ سر سید نے ان دونوں تجویزوں سے اختلاف کیا۔

"راجہ صاحب نے دو تجویزیں پیش کیں اور چاہا کہ ان پر سب متفق ہوں اور اجلاس سے منظور کی جاویں۔ اول یہ کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن انجمن خیر خواہانِ ہند کی جو اس وقت قائم ہوئی ہے بطور ایک برانچ کے قرار دی جائے اور اس کا نام تبدیل کر کے برانچ انجمن خیر خواہانِ ہند قرار دیا جائے۔ یہ امر بالکل برخلاف اس یادداشت کے تھا جو میرے سامنے پیش ہوئی تھی میں نے اس کو منظور نہیں کیا اور نہ اس کا منظور کرنا بلا اجازت ممبران پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میرے اختیار میں تھا۔ دوم یہ کہ راجہ شیو پرشاد بہادر ستارۂ

۱: مراسلہ پائنیر گزٹ نومبر ۱۸۸۸ صفحہ ۱۳۴۳ ۲: ایضاً

ہنداس بات کی تحریک کریں گے کہ بغرضِ اضافہ بعض دفعات قوانینِ مروجہ میں انسدادِ تحریر تقریر فساد انگیز و بغاوت خیز بدیسی زبان میں گورنمنٹ سے درخواست کی جاوے جس طرح پرکہ بھیم جی وغیرہ اکثر آدمی فساد انگیز اور بغاوت خیز دیسی زبان میں تحریر و تقریر برملا کرتے ہیں اس جلسہ کے نزدیک اس کا انسداد قانوناً کیا جاوے۔" ؎۱

ان دونوں تجویزوں سے سرسید متفق نہیں ہوئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کانگریس کی کارروائیوں سے ملک میں بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے وہ کانگریس والوں کو حکومت کا غیر وفادار نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ کام حکومت کا تھا کہ وہ جو چاہے کرے ہمیں اس کے لیے درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

"کانگریس والوں سے ہم کو کچھ عداوت نہیں ہے کہ ان کو فوجداری میں ماخوذ کرانے کی تدبیریں کریں۔ ہم میں اور ان میں رائے کا اختلاف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے اور راجپوتوں کے لیے بالتخصیص ملک کے امن کے لیے اور بھلے ملک کی دیگر اقوام کے بندوں کے لیے اور ملک کے امن کے لیے نہایت مضر ہیں اس لیے ہم اس کے برخلاف ہیں اگر ان کی کارروائی سے ملک میں فساد ہونے کا اندیشہ ہے اور میری رائے میں یہ بھی بلاشبہ اندیشہ ہے تو یہ گورنمنٹ کا کام ہے جو کچھ چاہے وہ کرے ہم کچھ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ تجویزیں میٹنگ میں پیش ہوں گی یا تو میں میٹنگ میں نہ جاؤں گا اور نہ شریک ہوں گا۔ اور اگر شریک ہوں گا تو ان تجاویز کی سخت مخالفت کروں گا۔" ؎۲

سرسید نے اس نئی انجمن کی سیکریٹری شپ سے اسی وقت اپنا استعفا پیش کر دیا اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو اسی طرح چلاتے رہے جیسا کہ پہلے چلاتے تھے۔ اتنا سا فرق اس میں آ گیا کہ پہلے کچھ ہندو حضرات اودھ کے راجہ وغیرہ اس میں شامل تھے اور اب یہ صرف عملاً مسلمانوں کی جماعت رہ گئی جو تعاون کچھ ہندوؤں سے سرسید کو ملتا تھا وہ ختم ہو گیا۔

؎۱ ایضاً ؎۲ ایضاً

سرسیّد پر تنقیدیں اور جوابات

سرسیّد کا سیاسی مخالف: ھیوم

مسٹر ہیوم نے قیام کانگریس سے قبل سرسیّد سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا تھا کہ آیا ایک ایسی جماعت بنانے کے لیے آپ رضامند ہیں۔ سرسیّد نے صاف الفاظ میں اس خیال کی سخت مخالفت کی تھی:

"مسٹر ہیوم نے قیام کانگریس کے وقت مجھ سے استصواب رائے کیا تھا اور میں نے جواب میں واضح طور سے لکھ دیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں"۔ [1]

کانگریس کے مطالبات سامنے آنے سے پہلے ہی سرسیّد کسی نیشنل جماعت کے حامی نہیں تھے اور اس کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اس کا ثبوت فوراً ہی ان کے سامنے پیش ہو گیا جب کانگریس نے اپنے پہلے ہی جلسے میں ایسے مطالبات پیش کئے جو کہ مسلمانوں کے لیے سراسر نقصان دہ تھے اور تماشہ یہ کہ ان مطالبات کو ہندوستان کے تمام باشندوں کی خواہشات کا آئینہ دار بتایا گیا۔

ہیوم سرسیّد کے دیرینہ شناسا تھے اور ان کے ذہن میں کانگریس بنانے کا خیال سرسیّد کی انقلاب آفریں تصنیف اسباب بغاوت ہند پڑھ کر ہی آیا تھا جس میں انگریز حکمرانوں اور ہندوستانیوں کے بیچ کی دوری اور ایک دوسرے کے خیالات سے ناواقفیت کو

---

[1] (پانیر ۱۰ نومبر ۱۸۸۷)

اس بغاوت کی بڑی وجہ قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہیوم اور دوسرے انگریزوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی جماعت بنائی جس کے ذریعہ حکمرانوں کو ہندوستانیوں کے خیالات کا علم ہو سکے اور کاروبارِ حکومت میں آسانی ہو۔ لیکن سرسید ہندوستان میں ریپریزنیٹو اصول کے جاری ہونے کی وجہ سے ایسے کسی خیال کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ اگر ایسی کوئی جماعت سادے جمہوری ادارے قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ہیوم اور سرسید کی یہ دیرینہ شناسائی کانگریس کی حمایت اور مخالفت کے مسئلہ پر باہمی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ ہیوم اس درجہ سرسیدؒ سے خفا رہنے لگے کہ ایک موقع پر جب سرسید ان سے ہاتھ ملانے آگے بڑھے تو انہوں نے ہاتھ تک ملانے سے انکار کر دیا۔ اس پر بھی سرسید نے کہا کہ سیاسی اختلافات کو نجی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے:

"پبلک سروس کمیشن کے سامنے جب مسٹر ہیوم اپنا بیان دے چکے تو ان سے ہاتھ ملانے کے لیے میں ان کی طرف بڑھا وہ جھجک کر کچھ پیچھے ہٹے تو میں نے کہا کہ پبلک معاملات میں اختلاف رائے کو نجی تعلقات میں حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔" [1]

قیامِ کانگریس کے بعد ہیوم سرسید کے خیالات کی کھل کر مخالفت کرنے لگے۔ اس مخالفت میں انہیں اور دوسرے بہت سے انگریز آفیسروں کے علاوہ خود وائسرائے لارڈ ڈفرن کی حمایت حاصل تھی۔ سرسید کی کانگریس مخالفت کو ہیوم نے ذاتی مخالفت کا سوال بنا لیا تھا اور اسی وجہ سے کانگریس کی کامیابی انگریز آفیسروں کی عزت کا سوال بن گئی تھی۔ اخبار پائنیر میں جگہ جگہ ہیوم کی تحریریں سرسید کے خلاف ملتی ہیں۔ سرسید کی لکھنؤ اور میرٹھ تقاریر پر بنگالی ہندو اخباروں کے علاوہ ہیوم اور ان کے انگریز حواریوں نے بھی بہت سخت تنقیدیں کی تھیں۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ناکام بنانے کے لیے ہیوم نے بڑے

---

[1] (پائنیر نومبر ۱۸۸۸ء)

بڑے انگریز افسروں کو خطوط لکھے۔ سر آکلینڈ کالون صوبہ شمال مغرب کے لیفٹنٹ گورنر تھے، ہیوم نے ان کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ سرسید پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی کاروائیاں نینی تال میں بیٹھ کر کر رہے ہیں لہٰذا یہ غلط خیال پیدا ہو رہا ہے کہ گورنر کی مرضی سے اور وائسرائے کی ایما پر ایسا کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ سرسید کو نینی تال سے یہ کاروائیاں مت کرنے دو:

"...... پانیر اور اس کے حواریوں کے جھوٹے اور مسلسل پروپیگنڈے کے باوجود سلطنت کی آبادی کے فی دس لاکھ پانچ ہندوستانیوں کی بھی سچی اور دلی ہمدردی اسے حاصل نہیں ہے (پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو) ..... رجواڑوں کے عطیات کا سبب یہ ہے کہ سرسید چونکہ انہیں نینی تال سے خط لکھتے ہیں اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ سرسید تمہاری ترجمانی کر رہے ہیں اور تم وائسرائے کی مرضی سے ایسا کرا رہے ہو"۔ [۱]

ہیوم بجائے اس کے کہ سرسید کے خیالات اور اشکلات کو بغور سنتے اور کانگریس کی پالیسی میں حسب مرضی مسلمانانِ ہند کچھ تبدیلی لانے کی کوشش کرتے الٹا انہوں نے سرسید کی مخالفت میں ایک زبردست مہم جاری کر دی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات کا کچھ بھی خیال شروع کانگریس کے زمانے میں ہی کر لیا گیا ہوتا تو شاید بہت سے تاریخی واقعات اس طرح پیش نہ آتے جیسے کہ آئے اور آج تک آ رہے ہیں کہ بغیر مسلمانوں کے سچے خیالات اور مطالبات کو مانے ہوئے بلکہ جان بوجھ کر نظر انداز کر کے بھی ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ مسٹر ہیوم نے بھی سرسید کے خیالات پر بالکل کان نہ دھرا بلکہ الٹا ان کی مخالفت میں کمر باندھ لی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی مخالفت میں جگہ جگہ خطوط لکھے میٹنگیں کیں اور اخبارات پر دباؤ ڈالا۔ اپنے ایک طویل مراسلے میں سر آکلینڈ کالون سے ایسوسی ایشن میں شامل افراد کا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کرتے ہیں۔ سرسید کی ایسوسی ایشن کے خاص ممبران جیسے مہاراجہ بنارس

---

[۱] (پانیر ۱۷ نومبر ۱۸۸۸)

، راجہ شیو پرشاد، منشی نول کشور کا خاص طور سے فرداً فرداً ذکر اپنے مراسلہ میں ہیوم نے کیا۔
اس مراسلہ سے انگریزوں کی کانگریس کو کامیاب بنانے میں گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ کانگریس کو کامیاب بنانے میں انگریزوں کا خاص ہاتھ تھا۔ مہاراجہ بنارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مہاراجہ بنارس کو لیجیے۔ حال ہی میں اس غریب بوڑھے مہاراجہ کو کانگریس کی مخالفت کے لیے میدان میں اتارا گیا ہے...... نہ تو تم اور نہ کوئی دوسرا ایماندار انگریز جو اُن سے واقف بھی ہو دعویٰ کر سکتا ہے کہ خود اپنے کسی ادنیٰ معاملہ پر غور کرنے کی بھی ان میں دماغی صلاحیت ہے۔ ذہنی اعتبار سے بالکل صفر......"

راجہ شیو پرشاد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اور یہ راجہ شیو پرشاد کون ہیں؟ قدیم برطانوی عملے کے ایک فرد برسوں نچلے درجے کے سرکاری ملازم رہے..... کلکتے سے لے کر پشاور تک ان کی کیا حیثیت ہے؟ کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی عزت ہے؟..."

راجہ بھنگا کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نام نہاد راجہ بھنگا کو لیجیے...... پورے ملک میں کون ان کی حقیقت سے واقف نہیں....... اچھی انگریزی کا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتے مگر کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے ٹائمز میں مراسلے چھپواتے ہیں"

منشی نول کشور کے بارے میں لکھتے ہیں

"منشی نول کشور کو لیجیے...... ان کے بارے میں کوئی سخت بات نہ کہوں گا اپنی معذوریاں انہوں نے مجھ سے بیان کی ہیں ان کی کچھ عجیب سی پوزیشن ہے لیکن کانگریس کے وجود میں آنے سے قبل دیسی سوسائٹی میں ان کی کیا پوزیشن تھی کسی کو ان پر بھروسہ تھا؟ کوئی ان کی عزت کرتا تھا؟...... میں چاہوں تو کانگریس کے مخالف تمام نام نہاد لیڈروں

کا ایک ایک کر کے اسی طرح کچا چٹھا کھولتا چلا جاؤں. لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں علاوہ سرسید کے (جن کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ کانگریس کے معاملہ میں وہ بہک گئے ہیں) ایک بھی شاید ایسا نہیں ہے جسے کانگریس کا سوال اٹھنے سے پہلے اپنے اہلِ ملک کا احترام یا اعتماد حاصل رہا ہو"[1]

خط کے لہجے اور زبان کے استعمال سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہیوم کس طرح اور کس حد تک کانگریس کی حمایت میں اس سے اتفاق نہ کرنے والوں کی مخالفت کر سکتے تھے. خیال رہے کہ یہ خط ایک انگریز دوسرے انگریز کو لکھ رہا ہے

بنگالی اخبارات کی بہتان تراشیاں

جنم بھومی سے بے وفائی

بنگال کے انگریزی اور بنگالی اخبارات سرسید کے کانگریس کے بارے میں راست نظریات سے بہت خفا ہو گئے اور انہوں نے سرسید کی کردارکشی کی مہم شروع کر دی. یہ اخبارات سرسیدؔ مخالف مضامین سے بھرے رہتے تھے اور اس حد تک سرسید کے دشمن ہو گئے تھے کہ سرسید کی مخالفت میں تہذیب سے نیچے گر گئے اور شرافت کا دامن چھوڑ دیا. بنگال کے انڈین مرر نے یہاں تک لکھ دیا کہ سرسید کا نام ہندوستانیوں کے لیے نشانِ ملامت بن گیا ہے اور انہوں نے اپنی جنم بھومی سے بے وفائی کی ہے. کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید جنم بھومی سے بے وفائی اور وفا کا نظریہ نیا ہے. نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جب بھی ان کے کسی خیال کی مخالفت یا اپنے فائدے کی بات کوئی اقلیتی طبقہ کرتا ہے تو ہمیشہ یہی الزام لگا دیا جاتا ہے کہ یہ جنم بھومی کی مخالفت ہے یعنی جنم بھومی اکثریت کو فائدہ پہنچانے کا نام ہے اور اقلیتیں اپنے

---

[1] (پاینیر ۱۷ نومبر ۱۸۸۸ء بحوالہ عتیق صدیقی "سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ")

تحفظات کی بات کرتی ہیں تو گویا جنم بھومی سے بے وفائی کرتی ہیں۔ سید نے جب کانگریس کے مطالبات کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہونا ثابت کر دیا تو ان پر بھی جنم بھومی سے بیوفائی کا الزام لگایا گیا:

"سر سید ہمارے دشمنوں کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ جن خیالات کا انہوں نے اظہار کیا ہے وہ یکسر ہندوستانی نوکر شاہی کے خیالات ہیں۔ ان کی لکھنؤ تقریر نے ان کی نیک نامی پر سرے سے پانی پھیر دیا ہے۔۔۔۔۔ ان کا نام آج تمام ہندوستانیوں میں نشانِ ملامت بن گیا ہے۔ اپنے دوست بنارس والے راجہ شیو پرشاد کی طرح وہ بھی اپنی جنم بھومی کے غیر وفادار ثابت ہوئے ہیں۔"[۱]

یہی وہ خیالات ہیں جن کی بازگشت آج تک ہندوستان کے کانگریسی وجمعیۃ العلمائی مسلمانوں کے بیانات و اخبارات میں سنائی دیتی ہے اور جس کی شروعات مولانا آزاد نے الہلال میں ان بنگالی اخباروں کے خیالات کی نقل کر کے کانٹنے سے فرق کے ساتھ کہ الہلال میں قرآنی آیات کا اضافہ کر دیا ورنہ مولانا آزاد اور ان کے ہمنوا جمعیۃ العلماء کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں دہراتے رہے ہیں بلکہ یہ انہیں خیالات کی بازگشت ہے جو اس وقت بنگالی ہندوؤں کے اخباروں میں بیان کیے جاتے تھے۔ الہلال بھی چونکہ کلکتہ سے نکلا اور جیساکہ آگے آئے گا بنگالی کانگریسیوں کی سرپرستی میں یہ اخبار نکلتا تھا لہٰذا اغلب گمان یہ ہے کہ بنگالیوں نے مولانا آزاد کو اس کام کے لیے بہت زیادہ مالی اور دوسرے طرح کی مدد دی ہو۔ کلکتہ کا ہندو پیٹریٹ اپنی ۲۳ جنوری ۱۸۸۸ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے:

"لکھنؤ میں سید احمد خاں نے جو تقریر اردو میں کی تھی اس کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ہمیں انتہائی تکلیف و حیرانی ہوئی ہے۔ تقریر کانگریس پر تھی

۱؎ (پانیر ۲ر فروری ۱۸۸۸ء)

لیکن..... سرسید احمد خاں نے بنگالیوں پر بلاوجہ اور بے محل حملے کرنا ضروری سمجھا..... ہم بھی اس کا جواب دے سکتے ہیں اور سرسید احمد خاں ہی جیسی سخت کلامی بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ روش اختیار کر کے ہم ان کی سطح پر نہیں اترنا چاہیے اس تلخ کلامی اور بے جا حملوں کے باوجود نہ تو ہم سید احمد خاں کی خدمات کو فراموش کر سکتے ہیں جو مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے انجام دی ہیں اور نہ ان کی اس حمایت کو بھول سکتے ہیں جو ماضی میں کھلے مقابلے کے امتحان کی انہوں نے کی تھی جس کی اب وہ خود مذمت کر رہے ہیں"

بنگال کے ایک اور اخبار نیشنل گارجین نے سرسید کی تقریر کے سلسلہ میں لکھا کہ یہ احمقانہ و جاہلانہ خیالات کا پلندہ تھی۔ یعنی مسلمانوں کو بر وقت آنے والے خطرات سے مطلع کرنا ان اخبارات کے نزدیک ایک جاہلانہ کام تھا:

"ایک ایسی تقریر کر کے اپنے کو ہلکا کیا ہے جسے حماقت، جہالت اور تعصب کے مجموعے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ان کی نیک نامی کو سراب میں تبدیل کر کے ایک بار پھر یہ ثابت کیا ہے کہ قد و قامت میں بڑھنے کے باوجود انسان اپنے ہم جنسوں کی نظروں میں گھٹ بھی سکتا ہے" [1]

اس وقت کے تمام مسلم اخبارات نے سرسید کی حمایت اور توصیف میں مضامین لکھے اور عام طور سے سرسید کا مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے بروقت باخبر کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا گیا۔ اکثریت کی حکومت میں کیا خرابیاں مسلمانوں کے لیے پوشیدہ ہیں ان کا احساس عام طور سے مسلمانوں کو ہونے لگا تھا۔ پانیر نے لکھا کہ:

"جن لوگوں نے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا اب وہ واضح طور پر سمجھنے لگے ہیں کہ اکثریت کی حکومت کا اصول اسلام کی قطعی تباہی کا باعث ہوگا ہندوؤں کی بھی ایک چھوٹی سی اقلیت یہ محسوس کر رہی ہے کہ ان کا مفاد

---

[1] بحوالہ پانیر ۲؍ فروری ۱۸۸۸ء)

بھی ان مسلمانوں کے مفاد سے مطابقت رکھتا ہے جو انتہا پسند سیاسی تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں"[1]

بنگال کے ایک اور اخبار ہند پیٹریاٹ نے نسبتاً شریفانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے سرسید پر سخت تنقید کی:

"کرسمس کے گذشتہ ہفتہ میں سرسید احمد خاں نے لکھنؤ کی محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے ممبروں کے سامنے جو تقریر کی تھی اسے پڑھ کر ہمیں انتہائی دکھ ہوا معزز سرسید کا احترام ہم نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور ان کی ان کوششوں کی تعریف کی ہے جو اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے باب میں وہ کر رہے ہیں..... اپنی تقریر میں گرچہ وہ نیشنل کانگریس کا مضحکہ اڑانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے سارا زہر اپنے مخلص غریب بنگالیوں پر انڈیل دیا بلکہ اس میدان میں تو انہوں نے سرلیپل گریفن کو بھی مات کر دیا"[2]

کلکتے کے ہی ایک دوسرے اخبار بنگالی نے سرسید کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے ان کے اس خیال کو غلط قرار دیا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے خلاف ہے اور لکھا کہ سرسید مسلمانوں کے لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں وہ خود غرضانہ مقاصد کیا تھے اس کا اخبار بالکل ذکر نہیں کرتا اور کانگریس کے مطالبات کی مخالفت کو وہ ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے مترادف بتاتا ہے۔ مسلم فرقہ کے مفادات کی حفاظت کرنے کا مطلب اس اخبار کی نظر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنا تھا یعنی یا تو ہندوؤں کے مطالبات کو مسلمان بھی تسلیم کریں یا پھر مخالفت کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں:

"ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے ہم مذہبوں کی اکثریت کے خیالات ہیں اس کا ایک

---

[1] (پانیر ۳ فروری ۱۸۸۸) [2] (ہندو پیٹریاٹ ۲۳ جنوری ۱۸۸۸)

نہایت نمایاں ثبوت مدراس کے اس حالیہ جلسہ میں پیش کیا گیا تھا جس میں مدراس کے مسلمانوں کی آبادی کے معزز نمائندوں نے سرسید کی تقریر کی کڑی تنقید کی تھی۔ .... جلسے میں کہا گیا تھا کہ سرسید مسلمانوں کے لیڈر نہیں ہیں ...... مسٹر امیر علی اور نواب عبداللطیف بہادر کے اس گٹ کی وہ نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے خود غرضانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا ہے۔"[1]

بنگالی اخبارات کے حملہ کا جواب

سرسید کی میرٹھ اور لکھنؤ تقاریر نے ملک میں بہت تہلکہ مچایا اس لیے کہ یہ تقاریر ہندوستانی مسلمانوں کے پولیٹیکل مینفسٹو کا درجہ رکھتی تھیں اور کارل مارکس کے کمیونسٹ مینفسٹو کا جو اثر یورپی اقوام پر ہوا وہی اثر سرسید کی ان تقاریر کا ہندوستانی مسلمانوں پر ہوا۔ بہت زوردار اور واضح الفاظ میں سرسید جیسی عظیم ہستی نے کانگریس کے مطالبات کو مسلمانوں کے لیے مضر بتائے ہوئے مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا لہٰذا اس کا اثر لازمی تھا۔ سرسید اس وقت تقریباً ستر سال کے ضعیف اور تجربہ کار بزرگ تھے۔ ان کا مدرسہ قائم ہو چکا تھا اور اپنی مختلف تصانیف کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور تھے۔ دینی علماء کی مخالفت دم توڑ چکی تھی اور کفر و ارتداد کے فتوؤں کو ملت اسلامیہ نے کلیۃً مسترد کر دیا تھا اور عام مسلمان سرسید کو بلا شرکت غیرے واحد قائد اور ہمدرد تسلیم کر چکے تھے۔ ایسے وقت میں کانگریس کی مخالفت میں جو آواز سرسید نے بلند کی وہ پورے ہندوستان اور انگلستان تک میں سنی گئی اور اس پر غور کیا گیا خود سرسید نے اسلامی انجمنوں کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی اور تمام ہی انجمنوں نے بلا استثنا سرسید کے خیالات کی حمایت میں رزولوشن پاس کیے۔

---

[1] (دی بنگال ۱۴ جنوری ۱۸۸۸)

سب سے زیادہ مخالفت جیسے کہ پہلے ذکر آچکا بنگالی اخباروں نے کی اور نازیبا و ناشائستہ الفاظ سرسید کی مخالفت میں استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان تمام مختلف تحریروں کا جواب سرسید نے اپنے ایک مراسلہ میں دیا جو "سرسید اور ہندو" کے عنوان سے پائنیر میں شائع ہوا۔ اس خط میں انہوں نے اپنے اس نظریہ کو دہرایا کہ میں ہندو اور مسلمانوں کو مثل بھائی اور دلہن کی دو آنکھوں کی مانند سمجھتا ہوں اور ہرگز ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے سب ہندوستانی ہیں لیکن چونکہ یہ مطالبات ایسے ہیں جو ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کا سبب بنیں گے اس لیے ان مطالبات کی مخالفت کرتا ہوں:

"میرے لکھنؤ کے لیکچر پر میرے بنگالی بھائیوں اور ہندو ہم وطنوں کا غم و غصہ قدرتی تھا اور ناگزیر بھی، لیکن اس لیکچر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد و دوستی کے باب میں میری جو سابقہ رائے اور خواہش تھی وہ میں نے بدل دی ہے۔ مجھ سے زیادہ اور کوئی اس بات کا خواہش مند نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں قوموں میں دوستی ہو اور دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ میں نے اکثر کہا ہے کہ ہندوستان ایک دلہن ہے، ہندو مسلمان جس کی دو آنکھیں ہیں اور اس کا حسن اسی میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں برابر رہیں" [1]

یہاں یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سرسید کے اس جملہ کو کہ ہندو اور مسلمان خوب صورت دلہن کی دو آنکھیں ہیں اکثر قوم پرست دانشور اور کانگریس کے ہمنوا اپنی تقاریر اور کتابوں میں یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ آج کا نیشنل ازم سرسید کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں "خلافِ حقیقت ہے اور سرسید پر ایک بہتان ہے۔ اکثر مصنفین نے جس میں خود مسلم یونیورسٹی کے دانشور اور تاریخ داں (مثلاً پروفیسر خلیق احمد نظامی) شامل ہیں سرسید کے خیالات کو اپنے اور حکومت وقت کے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ان کے اقتباسات کو غلط طریقے سے استعمال کر کے محققانہ غلط بیانی سے

[1] (پائنیر ۸ فروری ۱۸۸۸ء بحوالہ عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ صفحہ ۲۶۷)

کام لیا ہے۔ اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ سرسید سے زیادہ کوئی ہندو و مسلمانوں کے درمیان اتفاق نہیں چاہتا تھا اور وہ یہاں تک مسلمانوں کو مشورہ دیتے تھے کہ ہندوؤں کی دوستی کی خاطر انہیں گاؤکشی بند کر دینی چاہیئے:

"اس امر کا مجھ سے زیادہ کوئی خواہاں نہ ہوگا کہ مذہبی معاملات میں بھی اتفاق اور دوستی پیدا ہونا چاہیئے۔ اپنی قوم کو میں نے اکثر سمجھایا ہے کہ ہندوؤں کی دل آزاری کی نیت سے گائے کی قربانی کرنا ایک غیر مہذب حماقت ہے۔ ہم میں اور ان میں دوستی پیدا ہو سکے تو گائے کی قربانی سے وہ کہیں زیادہ قابلِ ترجیح ہے" (ایضاً)

دلہن کی دو آنکھیں لیکن......

لیکن ان خیالات کا سیاسی وملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور سرسید کا نظریہ تھا کہ ان تصورات کی بنا پر اگر ہندو یہ چاہیں کہ مسلمان اس راہ کو اپنالیں گے جو کہ ان کے لیے سراسر نقصان دہ اور ذلت میں مبتلا کر دینے والی ہے تو ہندوؤں کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے اور کانگریس کی پالیسی کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی قائم نہیں رہ سکتی:

"مگر میرے ہندو بھائی اور بنگالی دوست اگر ایسی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیں جو ہمارے لیے مضرت رساں اور ہماری قوم کے لیے باعث ذلت ثابت ہو سکے تو پھر ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی اور اس صورت میں بلاشبہ ہندوؤں اور بنگالیوں کے ان حملوں سے اپنی قوم کو بچانا یقیناً ہمارا فرض ہے جن کے متعلق ہمارا خیال ہو کہ ان سے وہ مجروح ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں ان خرابیوں سے بحث نہیں کروں گا جو کہ کانگریس کی تجاویز کے کامیاب ہونے سے ملک میں پیدا ہوں گی لیکن اس سے

کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی کامیابی سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچے گا" (ایضاً)

آگے چل کر سرسید کا لہجہ کافی تلخ ہو جاتا ہے کہ ان کے خیال میں کانگریس کے مطالبات مسلمانوں کو اپنے پاؤں تلے روندنے کی خواہش کے مترادف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوؤں کی یہ خواہش بیجا ہے اور اس کا پورا ہونا ناممکن ہے اور مسلمان مزور دب گئے ہیں لیکن ایسے بھی نہیں کہ بنگالی ان کو اپنے مقاصد کے لیے بے دریغ استعمال کر سکیں :

"یہ حقیقت ہے کہ ہماری قوم آج قعر مذلت میں گر چکی ہے۔ ہمارے بنگالی دوست اس افتادہ قوم کو اپنے پیروں تلے روندنے کے آرزو مند ہوں تو یہ توقع انہیں نہ رکھنی چاہیئے کہ ہم اسے برداشت کریں گے انہیں یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم ایک ایسی رسّی کی مانند ہیں جو حقیقتاً جل چکی ہے مگر اس کے بل نہیں گئے ہیں اور جو ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی ہے۔ کچھ گرمی اس میں اب بھی باقی ہے خبردار! سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا مبادا کہ جل نہ جاؤ" (ایضاً)

انہوں نے مثال دے کر کہا کہ بالفرض اگر انگریز چھوڑ کر جانا چاہیں تو ہم ان سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ تلوار کے مقابلے کا امتحان کرائیں اور جو اس میں کامیاب ہو اسی کو ہندوستان کی حکومت سونپ کر جائیں دراصل سرسید ہندوستان پر انگریزوں کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ حکمران دیکھنا چاہتے تھے :

"خانہ جنگی ہم بھی پسند کرتے ہیں لیکن وہ خانہ جنگی نہیں جس میں اسلحہ استعمال نہ کیے جائیں بلکہ ہمیں وہ خانہ جنگی پسند ہے جو اسلحہ کے ساتھ ہو۔ اگر سرکار ملک کی داخلی حکومت سے دست بردار ہو کر اسے ہندوستانیوں کو سونپنا چاہے گی تو ہم یہ درخواست پیش کریں گے کہ ایسا کرنے سے پہلے مقابلے کا ایک قانون پاس کیا جائے اور جو قوم اوّل آئے اسے کو حکومت سونپ دی جائے لیکن اس کے مقابلے کے لیے ہمیں اپنے اجداد کا

وہ قلم استعمال کرنے کی اجازت ہو جو فرمانروائی کی سندوں کے لکھنے کا حقیقی قلم ہے۔ اس امتحان میں اوّل آنے والا ہی ملک پر فرمانروائی کرے گا۔ ہمارے بنگالی دوست اگر اوّل آئے تو یقیناً ان کی جوتیوں کو اٹھا کر ہم اپنے سروں پر رکھیں گے۔ لیکن بلا اس خانہ جنگی کے اپنی قوم کو روندنے کی ہم انہیں اجازت نہیں دے سکتے۔" (ایضاً)

ان خیالات کے باوجود کہ ملک میں خانہ جنگی بھی منظور تھی اگر حکمرانی کا سوال پیدا ہو۔ سرسید نے کہا کہ ہم اب بھی ہندوؤں سے دوستی کے خواہش مند ہیں لیکن یہ دوستی مسلمانوں کو محکوم بنانے کے لیے استعمال نہیں کی جانی چاہیئے۔ اور ہندو اس کھیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت لطیف نکتہ ہے۔ جو لوگ سرسید شناسی کی کوششیں کرتے رہتے ہیں انہیں سرسید کا ہندوؤں سے دوستی کا نظریہ جس کا آئے دن ہمارے دانشور آج کے نظام کو درست ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں سمجھنے میں مدد ملے گی۔ سرسید نے ہندو اور مسلمانوں سب کو بسبب ہندوستان میں رہنے کے ہندو تک لکھا ہے لیکن ان خیالات کو مضامین سے نکال کر نہیں پڑھنا چاہیئے۔ ورنہ کوئی بھی شخص سرسید کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم سرسید کے خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اپنے خیالات کو سرسید کے خیالات بتانا یا ان کے اصلی خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا دانشورانہ منافقت ہے:

"تاہم میرے ہندو ہم وطنوں اور بنگالی بھائیوں کو یہ بھی بخوبی سمجھنا چاہیے کہ میری حقیقی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں ایک دوسرے کے ساتھ امن دوستی کی زندگی بسر کریں لیکن یہ دوستی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے کہ جب تک وہ ایک دوسرے کو محکوم بنانے کی کوشش نہ کریں۔ بنگالیوں نے اور اس صوبے (شمال مغربی) کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی یہی کھیل کھیلنا چاہا ہے اور وہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمان ان کے ساتھ

ہو جائیں گے۔ ایں خیال است و محال و جنوں"[1]

سرسید کی ہندو دوستی کی بنیاد برابری کی سمتی جیسی کہ وہ انگریزوں سے رکھتے تھے یعنی ہندو مسلمانوں کو محکوم بنانے کی کوشش نہ کریں تو وہ ہمارے دوست ہیں لیکن اگر انہوں نے ایسی کوشش کیں تو ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی لہٰذا کانگریس کے مطالبات جو مسلمانوں کو محکوم بنانے کی سازش تھے ان کے سامنے آتے ہی سرسید نے ان کی شدید مخالفت کی اور ہندوؤں کی مسلمانوں کو محکوم بنانے کی خواہش سے تعبیر کیا۔ سرسید کے ان کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ تمام مسلمان بلا تفریق عقائد و فرقہ سرسید کے حامی ہو گئے اور متحد ہو کر کانگریس کی مخالفت کی۔ لندن کے اخبار ٹائمز نے لکھا کہ:

"ہندوستان میں جن نسلوں کو قرونِ وسطیٰ سے سیاسی ظفر مندی حاصل رہی ہے وہ عیار منشیوں اور تیز قلم صحافیوں کو جنہوں نے کانگریس تخلیق کی ہے انتہائی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی ہیں"[2]

سرسید کی تقریر پر بہت عمدہ ریمارک لندن کے اخبار سینٹ جیمز گزٹ نے کیا کہ جو کچھ سرسید نے کہا ہے انگریز قوم کو اس پر دھیان دینا پڑے گا کیوں کہ وہ مسلم قوم کے نمائندے ہیں جس کو نظر انداز کر دینا انتہائی خطرناک ہو سکتا ہے:

"سرسید احمد خاں نے جو کچھ کہا ہے انگریز قوم اس پر کان دھرے گی کیوں کہ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کے وہ نمائندے ہیں جسے نظر انداز کر دینا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"[3]

طیب جی کو استعمال کیا گیا

بدر الدین طیب جی بمبئی کے ایک رئیس تھے اور وہاں کے مسلمانوں میں بوجہ اپنی عرب قومیت کے معزز سمجھے جاتے تھے کانگریس کو یہ ثابت

---

[1] (پائنیر ۱۳ فروری ۱۸۸۸ء) بحوالہ عتیق صدیقی سرسید ایک سیاسی مطالعہ صفحہ ۲۶،

[2] (بحوالہ پائنیر ۲۳ جنوری ۱۸۸۸) [3] (بحوالہ پائنیر ۲۳ جنوری ۱۸۸۸)

کرنے کے لیے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے ایک ایسے سربرآوردہ شخص کی تلاش تھی جو کہ معزز بھی ہو لہذا طیب جی کو شروع سے ہی کانگریس تحریک سے وابستہ رکھا گیا اور مدراس میں تیسرے اجلاس کا صدر بھی ان کو بنایا گیا۔ لیکن سرسید جیسی قد آور شخصیت کی مخالفت کی وجہ سے مسلمان کانگریس میں شریک ہونے سے باز رہے اور کانگریس کے پہلے اجلاس میں صرف دو مسلمان شریک ہوئے دوسرے اجلاس میں ستائیس اور پھر تیسرے اجلاس میں ان کی تعداد بہتر ہو گئی۔ جن کے بارے میں سرسید نے کہا کہ یہ سب کرائے کے مسلمان ہیں اور ان کو اس لیے مزید اگیا ہے تاکہ کانگریس کو مشترکہ جماعت ثابت کیا جا سکے گو کہ اس کے مقاصد مسلمانوں کے حق میں انتہائی درجہ مضر ہیں۔ طیب جی سرسید کو بھی کانگریس میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ سر ہیوم اپنے اس مشن میں ناکام ہو چکے تھے لہٰذا انہوں نے ایک مسلمان ہی کو سرسید کو راضی کرنے کا کام سونپا۔ طیب جی نے سرسید کو لکھا کہ:

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے مدراس کانگریس میں کچھ حد تک نمایاں حصہ لیا تھا یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا کہ آپ نے نیز سید امیر علی اور نواب عبداللطیف جیسے دوستوں نے کانگریس میں عدم شرکت کو ہی اپنا فرض سمجھا اس عدم شرکت کی وجہ کو اگرچہ میں کلی طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں تاہم یہ بات مجھے افسوس ناک معلوم ہوئی ہے کہ ایسے معاملات جس کا تعلق پورے ہندوستان سے ہو مسلمانوں کا کوئی طبقہ ہندؤں سے الگ رہ کر ہندوستان کے قومی ترقی میں سد راہ ہو"

"آپ کا یہ اندیشہ تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ حکومت تعلیم یافتہ دیسیوں کو جو مراعات دے گی ہندو ان سے زیادہ مستفید ہوں گے۔ لیکن وہ لوگ جو ان مراعتوں کے مستحق ہیں ان کی ترقی کی راہ روکنے سے کہیں زیادہ ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم خود ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی ایسی تجویز پیش کی گئی جس سے مسلمان

ہندوؤں کے محکوم ہو سکتے ہیں یا ہندوؤں کو ایسے انتظامی اختیارات حاصل ہو سکیں جو مسلمانوں کے لیے ضرر رسانی ہو سکتے ہیں تو میں خود ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کی مخالفت کروں گا"

"لیکن کانگریس کے پیش نظر اس طرح کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو تمام فرقوں کو یکساں فائدہ پہنچانا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ جو تجویز بھی مسلمانوں کو من حیث الجماعت ناپسند ہوگی کانگریس اسے قبول نہ کرے گی۔ چنانچہ کانگریس کے گذشتہ اجلاس میں اسی اصول پر میں سختی سے کاربند رہا اور ہر اس امر کو میں نے قطعیت سے مسترد کر دیا جن پر ہم جماعتی طور پر معترض ہو سکتے تھے۔ یہ کلیہ بھی میں وضع کر چکا ہوں کہ کوئی بھی تجویز جس پر عام مسلمان معترض ہوں کانگریس میں زیر بحث نہ آئے۔ یہ اصول کانگریس کے دستور میں بھی باضابطہ شامل کیا جائے گا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کے خدشات جہاں تک میں انہیں سمجھ سکا ہوں اس سے دور ہو جائیں گے۔ اس کے بارے میں براہِ نوازش اپنے تاثرات سے نیز اس امر سے بھی مطلع فرمایئے کہ آپ ہر کانگریس کے یکسر خلاف ہیں خواہ اس کی کچھ ہی شکل یا طرز ہو یا صرف اس کانگریس کے خلاف ہیں جس سے ہمارے فرقے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔۔۔۔ مؤخر الذکر صورت اگر ہو تو ہم ایسے قاعدے اور ایسی بندشیں وضع کر سکتے ہیں جن سے آپ کی دشواریوں پر قابو حاصل کیا جا سکے گا"[۵]

یہ کلیہ ضرور آج تک ہندوستان کی تمام جماعتوں میں چلا آتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی تحریک نہ کی جائے گی مگر ملک کا انتظام اکثریتی رائے پر منحصر ہے جس میں حالانکہ واضح طور سے کسی فرقہ کی حمایت نہیں ہو سکتی لیکن اس کا نتیجہ ایسا نکلتا ہے

---

۵ (بحوالہ عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ ص ۲۵۹)

جس سے کمسن ور اور کم تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے کوئی تحفظ نہیں رہ جاتا حالانکہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے کمزور فرقوں جیسے ہریجن اور قبائلی طبقات کے لیے بعض جگہ چالیس فیصدی تک نوکریوں، بینک کے قرضوں، یونیورسٹیوں کے داخلوں تک میں تحفظ رکھا گیا ہے۔

سرسید کا واضح جواب!

میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں

سرسید نے طیب جی کے تمام دلائل کا جواب فرداً فرداً اپنے طویل مراسلہ میں دیا۔ مراسلہ شروع کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ کانگریس میں شرکت کرنے کے بعد یہ بحث بے فائدہ ہے اگر طیب جی کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا چاہتے تھے تو ان کو کانگریس میں شرکت کرنے سے پہلے ہی یہ مشورہ کرنا چاہیے تھا اور ان کے مدراس کے جلسہ کی صدارت کرنے سے ہندو تو واقعی خوش ہوئے لیکن مسلمانوں کو بہت ملال ہوا:

"مدراس کانگریس میں آپ نے جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے ہمارے ہم ریاستی ہندؤں کا دل تو ضرور باغ باغ ہوا لیکن ہم لوگوں کو بلا شبہ اس سے حد درجہ ملال اور دکھ ہوا۔ کانگریس کے بارے میں ہمارے خیالات کے اظہار اور اس میں ہماری عدم شرکت کے اسباب بیان کرنے کا مناسب وقت تو کانگریس میں آپ کی شرکت سے پہلے تھا جب سب کچھ ہو چکا جسے ہونا تھا تو اب اس کا بیان لاحاصل ہے" [1]

سرکاری مراعتوں میں فائدہ اٹھانے والے مستحقین کی راہ روکنے کی نسبت بیان کیا کہ کوئی ایسا نہیں کرنا چاہتا اور چاہے بھی تو نہیں کر سکتا اور مقابلے کے امتحان میں شرکت کو سرسید نے ایسی دوڑ بتایا جس میں مسلمانوں کی شکست یقینی ہے:

"ہم ہندوستان کی قومی ترقی کی راہ میں سد راہ ہونا یا مراعتوں

[1]: بحوالہ: عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ (ص ۴۶)

سے فائدہ اٹھانے کے مستحقین کی ترقی کی راہ روکنا نہیں چاہتے اور اگر ہم ایسا کرنا بھی چاہیں تو اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ بایں ہمہ اس دور میں ہم کسی ایسے حریف سے مقابلہ کرنا بھی اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے جس میں ہمارے جیتنے کا امکان ہی نہ ہو آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ترقی کے میدان میں خود آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے لیکن پرانے عقلمندوں کا یہ کہنا بھی ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ تا تریاق از عراق آورده شود مارگزیده مرده شود" (ایضاً)

سرسید نے طیب جی سے سوال کیا کہ نیشنل کانگریس کے معنی اگر یہ سمجھے جائیں کہ ہندوستان میں بسنے والے ایک قوم ہیں یا آئندہ کبھی ایک قوم بن سکتے ہیں تو یہ خیال حقیقت سے بعید ہے:

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ نیشنل کانگریس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ مختلف ذاتوں اور ملکوں کے لوگ جو یہاں بستے ہیں ایک قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے مقاصد اور جذبات میں یکسانیت ہے؟ میرے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نہ تو نیشنل کانگریس قسم کی کوئی چیز ہی ہو سکتی ہے اور نہ اس سے سب کو یکساں فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے" (ایضاً)

سرسید نے واضح طور سے لکھا کہ میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں اور جو جماعت بھی اس غلط تصور کے تحت قائم کی جائے کہ ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے میں اس کے خلاف ہوں اور اسے نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے نقصاندہ سمجھتا ہوں:

"کانگریس جسے یہ غلط نام دیا گیا ہے اس کے کاموں کو ہندوستان کے حق میں آپ سودمند سمجھتے ہیں لیکن میں صرف اپنے ہی فرقے کے لیے نہیں پورے ہندوستان کے حق میں مضر سمجھتا ہوں۔ میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں اس کی شکل و صورت خواہ کچھ ہی کیوں

نہ ہو جو غلط تصورات پر مبنی ہو..... یعنی جو پورے ہندوستان کو ایک قوم (نشین) سمجھتی ہو۔ میرے خیالات کو شاید آپ پسند نہ کریں گے۔ اس لیے اتنا کچھ لکھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں" (ایضاً)

دوسرا خط

ان تمام واضح تصورات کے باوجود اور لکھنؤ میرٹھ کی تقاریر پڑھنے کے باوجود بھی کہ ان تقاریر میں سر سید نے تفصیل سے کانگریس کے مطالبات کو مسلمانوں اور پورے ملک کے لئے نقصان دہ ثابت کیا تھا، طیب جی کے خیالات نہ بدلے اور انہوں نے سر سید کے اس خط کا جواب دیتے ہوئے تسلیم کیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے تمام ہندوستان کے ہندو من حیث الجماعت کانگریس میں شامل ہیں اور سر سید کا لکھنؤ لیکچر میں یہ کہنا کہ بہت سے ہندو بھی اس کے خلاف ہیں غلط ہے

"اس تقریر کے وقت آپ کا خیال تھا کہ کانگریس صرف بنگالی بابوؤں ہی پر مشتمل ہے یہ بات کیوں کر آپ کے ذہن میں آئی میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ کیونکہ کانگریس کے بارے میں مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیوں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے جو خیالات ہیں ان کا آپ کو علم نہ بھی رہا ہو تو آپ نے یہ کیوں کر سوچ لیا کہ ان پریسیڈنسیوں کے ہندوؤں نے کانگریس میں سرگرم حصہ نہیں لیا ہے؟ بہر حال جو بھی صورت رہی ہو حقائق یہ ہیں کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے خواہ کسی صوبے کے بھی ہوں، من حیث الجماعت کانگریس کے حامی ہیں"

طیب جی نے یہ مسلمانوں کا فرض بتایا کہ وہ ان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کریں جو کانگریس سے ان کو ہے۔ یہ عجیب خیال ہے اگر وہ یہ بات ہندوؤں سے کہتے کہ وہ مسلمانوں پر یہ ثابت کریں کہ کانگریس کے مطالبات ان کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ جن کو ان مطالبات سے نقصان پہنچ رہا ہے انہیں کا یہ فرض

کیسے ہو گیا کہ وہ ان اختلافات کو دور کریں۔ یہ فرض تو کانگریس کا تھا کہ وہ ان مطالبات کو ترک کر دیتی جن کو سر سید نے مسلمانوں اور ملک کے حق میں مضر بتایا تھا۔ آگے بہت پتے کی بات طیب جی نے کہی کہ اندر رہ کر کام کرنا چاہیئے۔ سو الحمد للہ کہ مسلمان آج تک اندر رہ کر ہی کام کر رہا ہے اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے

"درین صورت کیا صاحبِ فکر مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں جن سے یہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں ہم جس طرح تعلیم کی ترقی کو نہیں روک سکتے اسی طرح کانگریس کو بھی بڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ لیکن کانگریس جو پالیسیاں اختیار کرے گی ان میں ہم اپنے قوی اور مستحکم عمل سے تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمان متحدہ ہو کر کانگریس کے مباحث کو ان ہی معاملات تک محدود کر سکتے ہیں جنھیں وہ اپنے حق میں مناسب یا بے ضرر سمجھیں، مثال کے لیے لجسلیٹو کونسل کو ہی لیجیے۔ مسلمان اگر انتخاب کے اصول کو ناپسند کریں تو اس میں تبدیلیاں لا کر اپنے مفاد کے مطابق اسے ڈھال سکتے ہیں۔

اس لیے میری پالیسی یہ ہے کہ باہر رہ کر نہیں بلکہ اندر رہ کر کام کیا جائے" ؎

ایسا لگتا ہے کہ طیب جی نے کانگریس کے مطالبات پر غور نہیں کیا تھا اور وہ ان مطالبات کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو خوش خبری اطلاع دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ کانگریس نے میرے اس کلیہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر وہ مطالبہ جسے مسلمان ڈیلیگیٹ متفق طور سے نامنظور کریں کانگریس اس کو ترک کر دیگی:

"کانگریس کی جملہ بارہ اسٹینڈنگ کمیٹیوں نے میرے وضع کردہ اس کلیے کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر وہ تجویز جس کی مسلمان ڈیلیگیٹ متفقہ طور پر یا تقریباً متفقہ طور سے مخالفت کریں اسے کانگریس میں زیر بحث آنے سے قطعاً خارج کر دیا جائے"

؎ (پانیر ۹ ر اپریل ۱۸۸۸ء)

درحقیقت اس وقت تک کانگریس جن مطالبات کو پیش کر چکی تھی ان میں کسی اور اضافہ کی گنجائش ہی نہ تھی اور ان کا مان لیا جانا ہی مسلمانوں کے لیے تباہی کا باعث ہوتا لہٰذا ان مطالبات کو منواتے ہوئے اگر یہ کلیّہ بنا بھی لیا جائے کہ مسلمان متفقہ طور سے جس تجویز کی مخالفت کریں گے اس کو نامنظور کر دیا جائے گا۔ ایک غیر مؤثر فعل تھا لہٰذا طیب جی کے اس اصول کو کانگریس نے خوشی خوشی تسلیم کر لیا۔ سرسید نے اس کلیّہ کو مسترد کرتے ہوئے جوابی مراسلہ میں لکھا:

"اور سب باتوں سے قطع نظر مسلمانوں کے لیے یہ قطعاً مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی کانگریس میں شریک ہوں ..... جس میں عام آدمیوں کے مجمع میں حکومت پر یہ الزام لگایا جاتا ہو کہ وہ اپنی رعایا کو ان کے حقوق سے محروم رکھ رہی ہے اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ جاہل اور کم عقل لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ حکومت ظالم یا کم از کم غیر منصف ہے اس سے مسلمانوں کو ہندوؤں اور بنگالیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا"

غدر کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ مسلمان اب اگر پھر کانگریس کے ایجیٹیشن میں شامل ہو کر اپنے جوشیلے پن کی وجہ سے تشدد پر آمادہ ہو گئے تو سارا الزام پھر انہیں پر آئے گا جس طرح کہ غدر میں ہندوؤں نے اپنے تئیں انگریزوں کا وفادار ہونا ثابت کر کے تمام الزام مسلمانوں پر لگایا اور نتیجتاً مسلمان برباد ہو گئے:

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان من چلے تھے بیچ میں کود پڑے ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے"

کانگریس کے ایجیٹیشن کی سخت مخالفت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"امریکہ میں اول اول اسی قسم کا ایجیٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہاں

تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منھ سے نکلا وہ یہ تھا "نو ٹیکیشن ودآؤٹ ریپریزنٹیشن"۔ پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت ہو وہ کانگریس اور پولیٹیکل ایجیٹیشن میں شریک ہوں ورنہ بغیر طاقت اس میں شریک ہونا ہیجڑوں کی طرح تالی بجانا ہے۔ بنگالی اور غیر معروف مسلمان جو مدراس کانگریس میں شریک ہوئے تھے ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ طاقت ہو اور ان کے لیے یہ رحمت ہو لیکن ہمارے لیے یہ لعنت ثابت ہو گی"[1]

......٭......

---

[1] (پانیر ۱۵ اپریل ۱۸۸۸ء)

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن

ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی جماعت دسمبر ۱۸۹۳ء کے آخری ہفتہ میں سرسید کے گھر میں اور انہیں کی زیر صدارت قائم ہوئی۔ یہ ہندوستان میں پارلیمنٹری ڈیموکریسی میں مسلمانوں کے حصہ لینے کی ابتدا تھی اور مسلمانوں میں ماڈرن سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا آغاز تھا۔ اس سے پہلے کسی بھی مسلم سیاسی انجمن کی مثال نہیں ملتی اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ بہرحال یہ کریڈٹ بھی سرسید ہی کو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فہم اور دوراندیشی سے ہندی مسلمانوں کو ایک ایسا سبق دیا جو آنے والی صدیوں تک جاری رہیگا

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن حالانکہ ان کی پہلی سیاسی جماعت قرار دی جاسکتی ہے لیکن یہ خالص مسلمانوں کی جماعت نہ تھی اس میں ہندوؤں کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی اور کچھ اودھ کے علاقے کے راجہ نوابین شامل تھے۔ سرسید اپنی شرافت اور نیک دلی کی بدولت ہمیشہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثل بھائیوں کے محبت و دوستی دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں سب قوموں کو دعوت دی یا کہ کانگریس ان مطالبات میں کچھ تبدیلی کرے جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھے۔ لیکن سرسید ان دونوں ہی مقاصد میں ناکام رہے اور غالباً اسی ناکامی نے سرسید کو خالص مسلمانوں کی جماعت قائم کرنے کی طرف متوجہ کردیا۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام کے چند ہی ماہ بعد مہاراجہ بنارس اور راجہ شیو پرشاد وغیرہ سرسید کا ساتھ چھوڑ گئے۔

انگلستان کے مشہور اخبار مورننگ پوسٹ نے ہندوؤں کی اس روش کے سلسلہ میں لکھا کہ!

"مسٹر سید احمد خاں نے کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دغا کے بعد (جو شیو پرشاد وغیرہ نے ان کے ساتھ کی ہے) آئندہ کبھی اور نے مسلمانوں کے علاوہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کی پیش کش کی ہو اور اسے

۱؎ انڈین مرر ۳۰ دسمبر ۱۸۸۸ء عتیق صدیقی سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ ص۲۹۱

قبول کرنے میں انھیں تامل ہوا تو ہمیں حیرت نہ ہوگی ۔"

سرسید کو جو تجربہ اپنی پہلی ہی سیاسی انجمن میں ہندوؤں کا ساتھ چھوڑنے سے حاصل ہوا اس نے سرسید کا ذہن بدل دیا اور اس طرح خالص مسلمانوں کی جماعت محمڈن ڈیفینس ایسوسی ایشن وجود میں آئی اس کی خبر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بہت واضح انداز میں ایک تحریک کی شروعات کے طور پر چھاپی گئی ۔

ایک جدید تحریک : محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفینس ایسوسی ایشن

"تیس دسمبر ۱۸۹۳ء روز شنبہ کو بوقت سہ پہر کے ذی رعب مسلمان شرفاء کا ایک جلسہ سرسید احمد خاں کے مکان پر مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کی نسبت بحث کرنے کے واسطے منعقد ہوا اور یہ تجویز قرار پائی کہ ایک ایسوسی ایشن مذکورہ بالا نام سے قائم کی جائے منجملہ ان صاحبوں کے جو اس جلسہ میں شریک تھے سرسید احمد، نواب محسن الملک، مسٹر سید محمود، خان بہادر برکت علی خاں، خاں بہادر شیخ علی بخش خاں، مولوی فریدالدین خاں، مولوی زین العابدین، شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ، حاجی محمد اسماعیل خاں، مسٹر بیک وغیرہ ہم شریک ہوئے ۔"[1]

اس جلسے میں اس زمانے کے تمام مسلم دانشور جو سرسید کی سحر خیز شخصیت کے طفیل علیگڑھ میں جمع ہو گئے تھے جن کی تربیت خاص سرسید کی نگرانی میں ہوئی اور جو آگے چل کر علیگڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اہم ستون بنے جس میں خاص طور پر محسن الملک کو جانشینِ سرسید کا خطاب قوم نے عطا کیا، سب شریک تھے ۔ ایک طرح سے یہ جلسہ ہندوستانی مسلمانوں کی بہترین نمائندگی کر رہا تھا اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ مسٹر بیک (جو اس وقت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے) بھی شریک ہوئے ۔ وہ بوجہ اپنی خدمات کے جو انھوں نے ملتِ اسلامیہ کی علیگڑھ کالج کو پروان چڑھا کر کیں مسلمانوں میں بہت مقبول تھے مسلمانوں کے اس نمائندہ جلسے میں یہ سوال حاضرین کے سامنے درپیش تھا کہ مسلمانوں کو پولیٹیکل معاملات میں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے ۔ خود سرسید جس جلسہ کی صدارت کر رہے ہوں اور علیگڑھ کالج سے متعلق تمام ہی حضرات مع پرنسپل اس میں شریک ہوں اور جو میٹنگ خاص سرسید کے مکان پر منعقد ہوئی اس کے بارے میں دانشور اکثر خاموشی اختیار کرتے ہیں ۔ حاضرین کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ۔!

"جو سوال میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پولیٹیکل معاملات میں

---

[1] گزٹ ۱۸۹۴ء ، ۳ جنوری ص ۱۰۹ [2] گزٹ ۳ جنوری ۱۸۹۴ء ص ۱۰۹

مسلمانوں کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟

یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سرسید کے زمانے میں تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم تر، آج کی صورتحال زیادہ مشکل اور سنگین ہے۔ ہمارے دانشوران اور اساتذۂ اس اہم موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے کہ سیاست جیسی گندی چیز کا ذکر ہم کیسے کریں۔ حالانکہ یہی سیاست جب حکمران وزراء اور گورنروں کی قربت کا سبب بنتی ہے تو اس سے زیادہ مباح اور خیر و برکت والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی اور ان کی راہوں میں پھول بچھانے کا کام وہی طبقہ کرتا ہے جس کے سامنے مسلمانوں کے پولیٹیکل مسائل کا ذکر ایک نادانی اور فرقہ پرستی کی بات ہے۔

مسلمانوں کا نقطۂ نظر انگریز حکمراں اور برطانوی عوام کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قواعد مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس میں پنجاب کے ذی وجاہت حضرات کے علاوہ خود سرسید، سید محمود، مسٹر بیک اور نواب اسماعیل وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ سرسید نے ان دونوں تجویزوں کی تحریک کی اور نواب محسن الملک نے انکی تائید کی۔

رزولوشن ۱؎ "یہ امر پسندیدہ ہے کہ ایک ایسوسی ایشن "محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کے نام سے قائم کی جاوے۔ سرسید احمد نے اس کی تحریک کی اور نواب محسن الملک نے اس کی تائید کی۔

رزولوشن ۲؎ یہ صاحبان مندرجہ ذیل ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کرنے کی غرض سے بطور کمیٹی کے مقرر کئے جاویں پنجاب سے خان بہادر برکت علی خاں، خواجہ یوسف شاہ مسٹر محمد شاہ دین، نیاز محمد خاں (وغیرہ) اضلاع شمال مغرب و اودھ سے سرسید احمد نواب محسن الملک، محمد میر مسٹر بیک، سید محمود اور آنریبل اسماعیل خاں "

نواب محسن الملک نے اس جلسہ میں یہ نظم سرسید سے مخاطب ہو کر پڑھی!

المدد المدد اے سید — قوم گمراہ کے رہبر سید
مجھ سے کیا پوچھتے ہو میرا حال — کب ہے معلوم مجھے اپنا حال
جو دوا چاہو پلاؤ مجھ کو — تا کسی طرح مرض اچھا ہو
تم طبیب دلِ بیماراں ہو — جو مناسب ہو وہی کر گزرو

۱؎ ایضاً

طبیبِ دلِ بیماراں حقیقتاً ہمارے حال کو جانتا تھا جس کو کہ ہم آج بھی ہزاروں فسادات اور ہر طرح کے استحصال کے باوجود نہیں جانتے اور دوا بھی اس نے وہ تجویز کی جو آج تک شافی وکافی ہے کہ قومی ہمدردی اور بہی خواہی میں اپنی زندگی بسر کرو اور جو کوئی بھی ملت کے مفاد پر ضرب لگانے کی کوشش کرے اس کے آگے لوہے کی دیوار بن جاؤ اور ہر طرح مقابلہ کرو، ہجرت کو موقوف کرو، قومی ہمدردی کو پسند کرو علم سے محبت کرو جہالت سے نفرت کرو، علم کو پھیلاؤ اور لاعلمی کے اندھیرے کو دور کرو، سب سے محبت کرو اور نفرت سے دور بھاگو، اپنی مال دولت سب کچھ قوم کی راہ میں خرچ کر دو حتیٰ کہ جب مرو تو کفن تک کے پیسے گھر میں نہ ہوں۔ کہ اس کا چندہ بھی محسن الملک نے اپنی جیب خاص سے عنایت کیا

ایک بہت دلچسپ مضمون سرسید کا یاد آرہا ہے انھوں نے حکایت بیان کرتے ہوئے بڑے ظریفانہ انداز میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی کی حکایت میں ایک حکایت ہے کہ ایک مسافر بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا تھا ایک شخص جب اس کے پاس سے گذرنے لگا تو اس نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو اس نے کہا کہ میرا یہ عزیز کتا جو کہ مر رہا ہے میرا بڑا دوست اور غمگسار تھا آج مر رہا ہے اس لیے میں روتا ہوں۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیوں مر رہا ہے؟ مسافر نے کہا کہ بھوک سے مر رہا ہے اس نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا وہ شخص بڑا حیران ہوا کیونکہ مسافر خاصا صحت مند اور امیر معلوم ہوتا تھا۔ اور دیکھنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس بہت سا کھانا اور پھل وغیرہ بھی تھے تو اس شخص نے پوچھا کہ اتنا کھانا ہوتے ہوئے تم اس کو کیوں نہیں دیتے اسی لیے یہ مر رہا ہے تو مسافر بہت خفا ہو کر کہنے لگا کہ میاں یہ میرے لیے ہے میں اسے کیوں دوں سرسید نے لکھا کہ ہماری قوم کے امیروں اور رئیسوں میں سب کا حال ایسا نہیں ہے مگر زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ قوم کے زوال پر روتے بھی ہیں مگر پیسہ صرف اپنے لیے ہے۔

آج ہماری قوم کا حال اس سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔ آنسو بہانے والوں کی کمی نہیں ہے حتیٰ کہ میرٹھ اور ملیانہ قتلِ عام کے بعد بہت سے مسلم وزراء اور کانگریسی مسلمانوں کو بھی آج جگہ جگہ مسلمانوں کے غم میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے حکایتِ شیخ سعدی کے مسافر کی طرح۔

بیک کی تقریر

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے افتتاحی جلسہ کے شرکا میں بیک واحد انگریز اور غیر مسلم تھے۔ بیک کی ملتِ اسلامیہ کے لیے خدمات شہرۂ آفاق ہیں۔ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو بیک نے بحیثیت پرنسپل محمڈن کالج کے باگ ڈور سنبھالی تھی۔ خاص کانگریسی ذہنیت کے پروردہ

مسلمان بنگالی کانگریسیوں کے اس بے بنیاد الزام کو دہراتے ہیں کہ سرسید کے سیاسی خیالات بیک کے رہینِ منت تھے اور بیک جو چلاتے تھے سرسید وہی کہتے تھے چنانچہ مولانا طفیل احمد منگلوری نے اپنی تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کی سیاست کو بیک کنٹرول کرتے تھے۔

ہم اس وقت اس بات کا ذکر نہیں کریں گے کہ کانگریس کی سیاست کو تو براہِ راست مسٹر ہیوم اور ان کے دوست چلاتے تھے۔ ہم صرف ایک ثبوت سرسید کے قومی خیالات کے سلسلہ میں دینا چاہیں گے کہ ان کا ہندوستان میں بسنے والی قوموں کو جدا جدا سمجھنا اور بہت سی تحریروں کے علاوہ ان کی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر تقریر سے ثابت ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں وائسرائے کی کونسل میں کی تھی اس وقت تک نہ کانگریس بنی تھی اور نہ بیک ہی ہندوستان آئے تھے بلکہ اس وقت وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں محض ایک طالب علم تھے اور کانگریس بنانے کا خیال تک ہیوم اور بنگالیوں کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کے سیاسی نظریات بیک کے اثرات کی وجہ سے بنے محض ایک تاریخی دروغ ہے جس کا مقصد سرسید کی شخصیت کو مسخ کرنا ہے ورنہ کہنے والے بھی ہمارا خیال ہے کہ حقائق سے واقف ہیں۔

بیک زندگی کی آخری سانس تک کالج کی ترقی اور طلبا کی بہبودی میں لگے رہے مرنے سے چند دن قبل بسترِ علالت پر جو آخری تحریر ان کے قلم سے نکلی تھی وہ کالج کے لیے سرسید میموریل فنڈ کی اپیل تھی۔ ابھی یہ تحریر مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پروانۂ اجل آپہنچا۔ بیک کی اس آخری تحریر کے بارے میں محسن الملک نے یوں اظہار کیا:

> "ہم بعینہٖ اس کا ترجمہ چھاپتے ہیں اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور اپنی قوم کی بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ ایسا ہمدرد اور غمخوار دوست ہمارا دنیا سے اٹھ گیا جس نے مرتے دم تک کالج کا ہی خیال رکھا اور ہماری قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچتا رہا۔"

مولانا حالی بیک کی طلباء سے محبت اور شفقت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں
> وہ بیک اور اس کے شاگردوں کو باہم ہم سخن دیکھیں

بیک کی کالج کے لیے خدمات حالی کی نظر میں سرسید کی طرح ہیں۔ حالی بیک اور ان کی بیگم کی کالج کے لیے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سرسید نے بیج
پر پھلا پھولا تمہاری سعی سے اس کا چمن
نیک دل بانو بھی کالج کی مربی تھی یوں ہی
جس طرح شوہر کے دل کو تھی اس کی لگن

محسن الملک اور مولانا حالی جب اس قدر بیک کے مداح ہیں تو اب کسی اور کے گمراہ خیالات کو نظر میں لانا ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

ذکر بیک کی تقریر کا ہو رہا تھا بیک نے نہایت مدلل اور عمدہ تقریر محمڈن ایسوی ایشن کے جلسہ میں کی، ان کی تقریر کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندؤں کے جائز حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ترقی کے راستے تلاش کرنا چاہئیں۔

"ہندوستان کی دوسری قوموں کے لحاظ سے میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ مسلمان کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ہندوؤں کے حق میں ناواجب برتاؤ ہو یا ان کے جائز حقوق میں کوئی دست اندازی ہو بلکہ مسلمانوں کا مقدم فرض یہ ہے کہ وہ خاص اپنی قوم کی امن اور ترقی کی خبر گیری کریں۔"[۱]

بیک کا خیال تھا کہ کانگریس کی تحریک ہندوؤں کو اقتدار منتقل کرنے کے واسطے جاری ہے اور مسلمان کسی بھی طرح ان مقاصد سے متفق نہیں ہو سکتے۔

"میں ہندوستان کی موجودہ پولیٹکل حالت پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں چند سال سے دو ایجیٹیشن تمام ملک میں زور و شور پر ہیں یعنی نیشنل کانگریس اور گاؤ کشی کی تحریک.... نیشنل کانگریس کے مقاصد یہ ہیں کہ پولیٹیکل حکومت گورنمنٹ انگریزی سے ہندو رعایا کے بعض فرقوں کو منتقل کر دی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو انتظام ملک میں انگریزوں کے بجائے ہندو مقرر کئے جائیں.... ان مقاصد کے ساتھ مسلمان کسی بھی طرح ہمدردی نہیں کر سکتے.... گاؤ کشی کی تحریک کے نتائج پیدا ہوئے ہیں کہ بمبئی اور اعظم گڑھ اور دوسرے مقامات میں خونریز بلوے ظہور میں آئے ہیں۔"[۲]

۱؎ گزٹ ۳۰ جنوری ۱۸۹۴ء ص ۱۰۴ ۲؎ ایضاً

بیک نے چار تجویزیں مسلمانوں کو سیاست میں عمل پیرا ہونے کی رکھیں پہلی یہ کہ مسلمان ہندوؤں کے ایجیٹیشن میں شامل ہو جائیں۔ دوسری یہ کہ ان کے خلاف کوئی ایجیٹیشن چلائیں۔ تیسری یہ کہ کچھ نہ کریں اور اپنی کوششیں صرف تعلیم کی حد تک محدود رہنے دیں، اور چوتھی صورت یہ کہ سیاسی معاملات میں نہ بالکل خاموش رہیں اور نہ کوئی ایجیٹیشن چلائیں کہ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کا نقصان ہے۔

"امرِ اوّل کی نسبت بہت کم کہنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں نے اس کو نامنظور کیا ہے اور اس کی نامنظوری کی وجوہات ان شخصوں پر بھی جو پولیٹیکل معاملات میں ادنیٰ تمیز کچھ رکھتے ہیں، صریح ظاہر ہوگی۔ مسلمانوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے جو نسبت ایک کو چار کے ساتھ ہے۔۔۔۔ پس ایسی صورت میں مسلمانوں کو ان تجاویز کی تائید کرنا جن سے خاص ان کی بربادی مراد ہے۔۔۔۔ ایک عہدہ کی خاطر جو اتفاقاً ان کو کہیں مل جائے اور صدہا عہدوں کا یقینی نقصان گوارا کرنا ہے جو سلطنت کی عنایت اور مہربانی سے ان کے رقیبوں کو ملیں۔ ان مصیبتوں کا اپنے اوپر لانا پولیٹیکل معاملات کے لحاظ سے پاگل پن ہوگا۔"

دوسرے طریقہ کو بیک نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اس طرح مسلمان تعلیمی میدان سے ہٹ جائیں گے اور ان کی کوشش کو تعلیم سے ہٹا کر سیاست کی طرف پھیرنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔ دوسری وجہ اس کے قبول نہ کرنے کی یہ ہے کہ پولیٹیکل ایجیٹیشن خونریزی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جس کا پھر نقصان مسلمانوں کو ہوگا۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس حالت میں پچھلے پچاس برس کے اندر ہندوؤں کے ان فرقوں نے جو ایجیٹیشن کرتے ہیں بلحاظ دولت اور سوشل رتبہ کے نہایت فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کے تعصب اور ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کو اسی کے مطابق بہ لحاظ منصب وعزت کے نقصان رہا ہے۔"

تیسرا طریقہ یعنی مسلمان کچھ نہ کریں بلکہ دوسری قوموں کے ایجیٹیشن کو جاری رہنے دیں۔ اس بنیاد پر رد کیا گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے جب ملک میں اس قدر شور وغوغا ہے۔ مسلمان بحیثیت ایک پرجوش قوم کے اس میں ضرور شریک ہوں گے اور مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مضامین اور اخبارات پڑھتا ہے۔ اس کو کس طرح اپنی رائے کا اظہار کرنے سے روکا جا سکتا ہے؟ لہٰذا خاموش رہنا اور کچھ نہ کرنا بھی

غلط ہے۔

"میں اس کو سب سے پہلے اس وجہ سے ناپسند کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اس کا عمل درآمد ناممکن ہے جس ملک میں کہ اخبارات صدہا پولٹیکل آرٹیکل لکھ رہے ہیں تو ممکن ہے کہ ہمارے مسلم تعلیم یافتہ نوجوان ان تجاویز کی تائید یا مخالفت کے واسطے جو تجویز کی گئی ہیں پھنس جاویں، وہ خاموش رہے اور اس پولٹیکل جوش میں کسی توجہ کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو بغیر رہنمائی کے چھوڑنا غلطی ہے۔ دوسری دلیل خاموشی کی اس پالیسی کے برخلاف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مخالفین کی مستعدی سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اس کی علامتیں اس قدر صاف ظاہر ہیں کہ ان کی جانب سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ سب سے پہلے یہ بات ہے کہ میونسپلٹیوں اور لیجسلیٹو کونسلوں میں الیکشن کا قاعدہ بغیر اس کے کہ مسلمانوں کے ریپرزنٹیشن کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے جاری کر دیا گیا ہے۔۔۔ مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ مسلمانوں کی وہ خاموشی ہے جو انھوں نے پولٹیکل معاملات میں ظاہر کی ہے۔"[۱]

بیک نے حکومت کے جاری کردہ الیکشن کے طریقہ پر تنقید کی کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے خیالات ایوانِ حکومت تک نہیں پہنچ جائیں گے۔ اور اگر کچھ مسلمان وہاں پہنچ بھی گئے تو وہ خودغرضی اور ناواقفیت کی بنا پر ہندوؤں کے خیالات کا اظہار کریں گے (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے)۔

"اس ملک میں لیجسلیٹو کونسل کے واسطے ڈبل الیکشن اور وائسرائے کی کونسل کے واسطے ٹریبل الیکشن کے ہونے سے مسلمانوں اور ہر ایک دوسری اقلیت کا ریپرزنٹیشن بالکل معدوم ہو جائیگا۔ بلاشبہ ایسے مسلمان جائیں گے جو ناواقفیت اور خودغرضی کے سبب ہندوؤں کے مطالب کا ریپرزنٹیٹو ہونا قبول کریں گے۔"[۲]

بیک کا خیال تھا کہ مسلمان اور ہندوؤں کی تعداد مساوی منتخب ہونی چاہئے اور یہ کہ مسلمان ممبر کو مسلمان منتخب کریں۔

"مسلمانوں کے اصلی ریپرزنٹیشن کے واسطے اصلی ووٹ دینے والے مسلمان ہونے چاہئیں

۱۔ ایضاً ۲۔ ایضاً

اور ان کو مسلمان ایکٹ کرنے چاہئیں۔ کوئی طریقہ با آسانی ایجاد ہو سکتا ہے.....

چنانچہ میں صرف ایک طریقہ کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی جو مصالحت کی کمیٹیاں گورنمنٹ نے اعظم گڑھ اور بمبئی کے بلووں کے بعد مقرر کی تھیں جن میں ہندو اور مسلمان ممبروں کی تعداد مساوی تھی وہ گویا صاف تسلیم کرنا اس اصول کا تھا کہ مخالف قوموں کے درمیان ووٹوں کی برابری کا قائم ہونا ضروری ہے۔" ۱

بیک سمجھتے تھے کہ سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی خاموشی کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں نوکریوں کے لیے مقابلے کا امتحان جاری ہو گیا اور اسی طرح سول سروس میں مقابلے کا امتحان جاری ہونے کا امکان ہے جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا سیاسی معاملات میں خاموش رہنا مسلمانوں کے لئے مضر ہے۔

"اور مثالیں اس قسم کی دی جا سکتی ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہو گی کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل معاملات میں خاموشی سے کسی قدر نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً ملازمت ماتحت (Sub ORDINATE SERVICES) کے واسطے بنگالہ اور پنجاب میں امتحانِ مقابلہ جاری کرنے سے ان کو نقصان پہنچا ہے اور جو رزولوشن ہاؤس آف کامنز میں سول سروس کے امتحانِ مقابلہ کی نسبت جاری کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں اس بات کی خبر کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو فرقہ انگلستان کا ہندوستان کے معاملات کی جانب دلچسپی رکھتا ہے وہ ان کے مطالب کی تائید کرے۔" ۲

ان تمام دلائل کے پیشِ نظر بیک نے آخری تجویز کو پسند کیا کہ مسلمان ایسا طریقۂ کار اختیار کریں کہ انگلستان کی عوام اور حکومتِ ہند کو ان کے مطالبات کا علم ہوتا رہے۔ اس مقصد کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو ایجیٹیشن کے راستے کو نہ اپنائے۔

"میری یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے سرگروہوں اور دانشمند اور بارعب شخصوں کو انگلستان کی پبلک اور حکومتِ ہند کے روبرو اپنے مطالب کو ظاہر کرنے کی غرض سے ایک ایسوسی ایشن بالاتفاق قائم کرنی چاہئے۔" ۳

---

۱ ایضاً ۔ ۲ ۔ ایضاً

جداگانہ انتخاب

سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف اقوام بستی ہیں جن کے مفاد جدا جدا ہیں اور ہندوستان ایک ملک نہ ہو کر برصغیر ہے جس میں کچھ چھوٹی اور کچھ بڑی قومیں بستی ہیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت اور خاص طور سے ملکہ برطانیہ کی حکومت جو ۱۸۵۸ء میں جاری ہوئی انے ملک کو پرانے دور سے نکال کر نئے ترقی یافتہ دور میں داخل کر دیا تھا۔ ریپریزنٹیشن کا نفع بخش اصول ہندوستان کو انگریزوں نے ہی سکھایا تھا۔ چونکہ یہی اصول برطانیہ میں جاری تھا لہذا انگریز اسی اصول کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا کرتے وقت انہوں نے ہمیشہ کی طرح مسلم مفاد کو نظر انداز کیا کہ حکومت انہوں نے مسلمانوں سے ہی چھینی تھی اور انہیں کو وہ اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ لیکن سرسید واحد شخص ہیں جنہوں نے انگریزوں پر مسلمانوں کے مفاد کا بخوبی اظہار کیا نہ صرف مسلمانوں کے مسائل ان تک پہنچائے بلکہ حکومت کے اصولوں میں مسلمانوں کے تحفظ کا عنصر بھی شامل کرایا۔ سرسید کی شخصیت انگریزوں کی مسلم دشمنی اور ہندو نوازی کے بیچ دیوار بن کر کھڑی ہو گئی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید نہ ہوتے تو انگریزوں کی ہندو نوازی کی پالیسی بلا روک ٹوک جاری رہتی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سادے نیابتی طریقے کا ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ وائسرائے کی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا

"ریپریزنٹیٹو اداروں کے ذریعے سے سیلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی نیابت سے ہندوستان

کو سکھا دے گی۔ ملہ

اور ظاہر ہے کہ انگلینڈ میں سادا نیابتی اصول جاری تھا کیونکہ وہاں مختلف طبقات میں مذہبی سیاسی و ثقافتی اختلافات نہیں پائے جاتے تھے جن کی بنا پر کسی دوسرے طریقہ کی وہاں ضرورت محسوس ہوتی۔ انہیں اصولوں کو جوں کا توں انگریز حکمراں ہندوستان میں لاگو کرنا چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک یہی ایک بہترین طریقہ حکمرانی کا تھا دوسری طرف ان کی مسلمانوں کے تئیں دشمنی کی ایک لمبی تاریخ تھی تاریخی وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی ہندو قوموں سے ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی اس کے برخلاف مسلمانوں اور عیسائیوں کا ٹکراؤ بہت پرانا تھا۔ صلیبی جنگیں ہندوستان میں داخل ہوتے وقت مسلمانوں سے لڑی گئی جنگیں وہ تمام وجوہات تھیں جن کی بنا پر انگریز مسلمانوں کی مخالفت میں عمل کرنے پر مجبور تھے لہذا ہندوستان میں مسلم مخالف پالیسی بلا روک ٹوک جاری تھی لیکن سرسید کی دانشمندی اور کوششوں کی وجہ سے اس پالیسی میں کچھ تبدیلی آئی اور اتنا فرق پڑ گیا کہ انگریزوں نے مسلم دشمنی ترک کر کے منصفانہ رویہ اپنانے کی کوشش شروع کر دی مگر خاص معاملات میں ان کو مسلسل یاد دہانی کرائے جانے کی ضرورت ہمیشہ رہی کہ ہندوستان میں ایسا نظام نہ جاری کیا جائے جو مسلمانوں کے لیے محض نقصاندہ ہو۔

سرسید کی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر تقریر اسی یاد دہانی کی ایک صورت تھی کہ سادہ جمہوری نظام چاہے جتنے چھوٹے پیمانے پر جاری کیا جائے مسلمانوں کے لیے نقصاندہ رہے گا سرسید نے یہ نکتہ اس خوبی سے انگریز حکمرانوں پر واضح کر دیا کہ انہیں اس بل میں ترمیم منظور کرنی پڑی کہ ایک تہائی ممبروں کا تقرر حکومت کے ہاتھ میں رہا تاکہ مسلمانوں کو نامزد کیا جا سکے۔ سرسید پہلے شخص تھے جنہوں نے کانگریس بننے سے بہت پہلے ہی سادے جمہوری نظام کے خلاف اپنی رائے دی تھی۔

وہ اس سے پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو جس نے اس

ملہ (مجموعہ لیکچرز) ص۱۱

مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپرزنیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے حسب حال ہے اور جان اسٹوارٹ مل کی آرار بتائید ریپرزنیٹو گورنمنٹ کے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لیے جس کا انتظام کثرت رائے پر چلتا ہو یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے یعنی یہ مسلم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقہ حکومت عمل میں آسکتا ہے یا مفید ہوسکتا ہے جہاں یہ امر موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنیت نہیں ہے سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا،، (مکاتیب سرسید مرتبہ مشتاق حسین ص ۲۱۳)

سرسید نے یہ بات برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچائی کہ ہندوستان میں فی الواقع بہت سی اقوام بستی ہیں۔ پارلیمنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

,, وہ اس امر کو بھلا نہ دیں گے کہ ہندستان براعظم ہے اور مثل انگلستان یا اسکاٹ لینڈ یا آئرلینڈ کے ایک چھوٹا ملک نہیں ہے اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کی تمدنی اور اخلاقی اور سوشل اور پولٹیکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا اور بجائے اس کے کوئی اور طریقہ حکومت اسلامی طریقے کے بدلے قائم کرتے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہے،، (ایضاً)

سرسید سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان میں جو حکومت کی تبدیلی الیسٹ انڈیا کمپنی سے اقتدار چھین کر ہوئی ہے معمولی تبدیلی نہیں ہے اور ان کے ذہن دور رس میں یہ اشکال ابھرنے

لگے تھے کہ ایک دن ہندوستان میں نیابتی حکومت قائم ہوگی

"میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو کہ ہندوستان کے طریقہ حکومت میں جو یہ تبدیلی واقع ہوئی اس کو یونہی برائے نام خیال کرتے ہیں...
... مالک تخت و تاج کے ہاتھ میں حکومت چلے جانے سے ایک حقیقی اور عظیم تبدیلی واقع ہوئی" (ایضاً)

۱۸۸۲ء میں جب نیابتی طرز حکومت کی سمت میں پہلا قدم اٹھایا گیا تو سرسید نے ہندوستانی سماج میں موجود اختلافات بہت دلنشیں اور عمدہ طریقے سے انگریز حکمرانوں پر واضح کر دیئے اور اسی تقریر سے یہ بات واضح کردی کہ حکومت جمہوری اداروں کی بحالی ضرور چاہیے مگر ہندوستان میں جمہوریت کا مطلب اکثریت کی حکومت ہے اور اکثریت و اقلیتی طبقات میں کسی بھی طرح کی مماثلت نہیں پائی جاتی نہ تاریخ میں نہ تمدن میں نہ مذہب میں نہ معاشرت میں اور نہ اخلاقی ضوابط میں۔ سارے جمہوری اداروں کی شروعات پر یہ مسلمانوں کا پہلا ریپریزنٹیشن تھا جس میں صاف الفاظ میں کہا گیا تھا کہ مسلمان اکثریت کی حکومت سے خوش نہیں ہے اور نیابتی طرز حکومت کی ابتدا کا مطلب یہ ہوگا انگریزوں کے بعد مسلمانوں کے بجائے ہندو حکمراں ہوں گے۔ بقول سرسید بڑی قوم چھوٹی قوم کو دبا لے گی"

سرسید جمہوریت کے خلاف نہیں تھے لیکن ہندوستان کی صورتحال میں وہ سادے جمہوری طریقوں کے رائج کرنے کے خلاف تھے کہ اس میں مسلمانوں کا بہت نقصان تھا اور مسلمانوں کے نفع نقصان کی سرسید سب سے زیادہ پرواہ کرتے تھے جہاں اپنی قوم کا فائدہ نقصان شامل ہوتا تھا وہاں وہ کسی کی دوستی کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے:

"لارڈ رپن کے زمانے میں ...... لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الیکشن سے ممبر مقرر ہوں۔ اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں میں بہت بڑا لبرل ہوں لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے جو شخص کہ اس طرح کے الیکشن کے خلاف تھا وہ میں تھا۔ اگر

میں غلطی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ رپن کی رائے صرف میری ہی اسپیچ کے زور سے پھری کہ ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث انتخاب سے۔" ۱؎

سرسید کی ہی رائے اور ان کے ہی توجہ دلانے پر وائسرائے لارڈ رپن کی رائے بدل گئی اور مسلمانوں کے لیے نومنیشن کا اصول تمام نیابتی اداروں میں جاری ہوا کہ الیکشن کے ذریعہ ان سب کا جیتنا ممکن نہ تھا اور جو نہیں جیت پاتے تھے ان کو نامزد کر دیا جاتا تھا:

"لارڈ رپن اضلاع متوسط کے سوا باقی صوبوں میں کل ممبر الیکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی رائے سرسید کی تھی وہی قاعدہ تمام صوبجات کے لیے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسط کے لیے قرار پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر ان کی شکل نظر نہ آتی۔" ۲؎

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے فائدے کے پیش نظر خاص طریقۂ انتخاب کے حامی تھے جس میں کہ مسلمان بھی منتخب ہو سکیں۔ ایک تقریر میں اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

"آپ خیال کریں کیا حال انتخاب کا ہے؟ کسی ضلع میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو دبا دیں گے اور سیلف گورنمنٹ کے مالک ہو جائیں گے۔ ابھی کلکتہ میں ایک بڑے بزرگ خاندانی داڑھی والے مسلمان مجھ سے ملے اور انہوں نے کہا کہ غضب ہو گیا ہمارے شہر میں میونسپل کونسل کے لیے اٹھارہ مسلمان ممبر منتخب ہونے

۱؎ (مجموعہ لیکچرز، صفحہ ۳۱۰) ۲؎ (حیات جاوید، ۵۹۰)

والے تھے کوئی منتخب نہیں ہوا سب ہندو منتخب ہو گئے اب گورنمنٹ سے کسی کا تقرر ہونا چاہیئے میں چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ گورنمنٹ مجھ کو منتخب کرے۔ یہی حال سب شہروں کا ہے۔ علی گڑھ میں اگر خاص قاعدہ مقرر نہ ہو جاتا تو کوئی مسلمان یہاں تک کہ ہمارے دوست مولوی خواجہ محمد یوسف بھی جو نہایت معزز ہیں بمشکل اپنے منتخب ہونے کے لیے ووٹ حاصل کر سکتے اور آخر کو گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع ہوتے،،[۱]

---

[۱] مجموعۂ لیکچرز صفحہ ۲۹۹)

ابوالکلام آزاد

پیدائش اور بچپن

محی الدین احمد آزاد اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے والد نے فیروز بخت تاریخی نام رکھا اور جواں بخت جواں طالع جواں باد کے مصرع سے ہجری سال کا استخراج کیا۔ مولانا کا شجرہ نسب یوں ہے۔

"مولانا آزاد بن مولانا خیرالدین بن مولانا محمد ہادی بن شاہ محمد افضل بن محمد حسین" یہ سب لوگ دلی کے رہنے والے تھے اس لیے مولانا اپنے آپ کو دہلوی بھی لکھتے تھے ان کے والد اپنے مریدوں کے حلقہ میں "حضرت" کے نام سے مشہور تھے اسی لیے بچپن میں مولانا آزاد کو مریدین "چھوٹے حضرت" کہا کرتے تھے۔ ملک کے حالات اور غدر کے واقعات سے بددل ہو کر مولانا خیرالدین نے حجاز کو ہجرت کی اور تقریباً بیس[۲] سال تک ہندوستان نہیں آئے پہلی بار ۱۸۸۷ء میں ان کے آنے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد آتے جاتے رہے اور بالآخر ۱۸۹۸ء کے آخر میں مستقلاً کلکتہ آ گئے مولانا آزاد کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی کہ ان کے والد نے ان کی شادی کر دی دلہن کی عمر اس وقت سات یا آٹھ سال تھی ان کا نام زلیخا بیگم تھا وہ اردو فارسی سے واقف تھیں

مولانا کی زندگی میں ان کے والد مولانا خیرالدین کا بہت اثر رہا۔ وہ روایتی طرز زندگی کو پسند کرتے تھے انھیں مغربی جدید تعلیم پر بالکل اعتقاد نہ تھا بلکہ وہ اس زمانے کے عام دینی علماء کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم عقیدے کو کمزور کر دیتی ہے لہٰذا انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا انتظام قدیم دستور کے مطابق کیا مولانا کو کسی اسکول کالج یا مدرسہ میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ ان کی تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر ہی مکمل ہوئی اور مولانا کسی مدرسے یا کالج کی سند حاصل نہ کر سکے۔

مولانا خیرالدین اپنے علاقہ کے ایک بڑے پیر تھے اور ہزاروں مریدین ان کو گھیرے رہتے تھے

"معتقدین اور مریدین کا یہ طرز عمل ہمارے خاندان میں رہتا تھا کہ ہر شخص جو والد مرحوم سے ملنے آتا تو پہلے سلام کے بعد کھڑے ہی کھڑے جھک کر ان کا ہاتھ چومتا اور آنکھوں پر لگاتا اس کے بعد بیٹھ جاتا اور دو زانو ہو کر ان کے قدم چومتا زیادہ

عقیدت مند تو جب تک دونوں پیر نہ چوم لیتے سیر نہ ہوتے"

(آزاد کی کہانی صفحہ ۳۱۲)

مولنا چونکہ پیرزادے سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کے ساتھ بھی ہر شخص وہی کرتا تھا۔ اگر والد کے ساتھ باہر جانا پڑتا تو قدم قدم پر رکنا پڑتا تھا۔

"لوگ دوکانوں سے اٹھ کر یا راستوں میں چلتے ہوئے گھیر لیتے اور ہاتھ پاؤں چومنے لگتے۔ عید کے دن یہ منظر سب سے زیادہ قابل دید ہوتا تھا ہزاروں آدمی عیدگاہ میں پاؤں پکڑتے تھے خاک ان کے چہروں پر لگ جاتی۔ مگر جوش عقیدت میں انھیں ان باتوں کی مطلق پرواہ نہ ہوتی تھی" (آزاد کی کہانی صفحہ ۳۴۴)

مولنا خیر الدین بہت کٹر وہابیت مخالف تھے اور ہر طرح کی برائیوں کا مجموعہ ان کے نزدیک وہابیت تھی۔

"وہابیت کے بارے میں میری خاندانی دنیا میں اصل اباحت نہ تھی بلکہ حذر یعنی نفرت تکفیر اور انسان میں جس قدر بھی مذہبی اور غیر مذہبی برائیوں کا تصور کیا جا سکتا ہے ان سب کا پیکر مجسمہ وہابیت تھی" (آزاد کی کہانی صـ ۳۳۷)

مولنا کا بیان ہے کہ "بچپن میں میرا خیال یہ تھا کہ وہابی کوئی خاص قسم کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت مخلوق ہے میں اپنے ذہن میں اس کا تصور یوں کرتا تھا کہ ایک قبیح صورت انسان جس کا آدھا چہرہ کالا ہے یہ اس لیے کہ دل کے کفر اور بغض رسول کی وجہ سے وہابیوں کا آدھا منہ کالا ہو جاتا ہے"، مولنا کے گھر میں دنیا کی ہر مکروہ چیز اسی لقب سے پکاری جاتی تھی مثلاً کسی نے کہا کہ رات میں اس قدر وہابی تھے کہ نیند نہ آئی یعنی مچھر بہت تھے صندوق کے نیچے وہابی چلے جاتے تھے یعنی چوہے۔

"ہم نے سینکڑوں مرتبہ والد مرحوم کو کہتے سنا کہ ان کا کفر یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہود و نصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں ہیں یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں" (آزاد کی کہانی صـ ۳۴۱)

ان کی یہ مخالفت صرف باتوں تک محدود نہ تھی بلکہ غدر کے بعد جو علماء حجاز کو ہجرت

کر گئے تھے ان کے عقائد کی تحقیقات کرا کے ان کو سزائیں بھی مولنا خیر الدین نے دلوائیں۔

"غدر کے دوران علماء وہابیہ کی جو جماعت گورنمنٹ کی سختیوں سے پریشان ہو کر مکہ چلی گئی تھی ان کے خلاف مولنا خیر الدین نے سلطان اور شریف مکہ دونوں کو سخت برانگیختہ کیا تھا اور ان کے عقائد کی تحقیقات کرا کے ان کو سزائیں دلوانے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا" (ملک زادہ منظور احمد: مولنا آزاد فکر و فن ص ۲۷)

انھوں نے وہابیت کے رد میں پمفلٹ و رسائل لکھے تھے ان کی مخالفت انتہا پسندانہ رویہ رکھتی تھی حد یہ کہ اس مخالفت میں ہر طرح کی رسومات و بدعات کو از روئے شرع و قرآن جائز قرار دیتے تھے۔

"ان کی طبیعت میں وہابیوں کے متعلق سخت تعصب قائم ہو گیا تھا ہر طرح کی رسوم ہر طرح کی بدعات جو سخت سے سخت آخری درجہ کی کہی جا سکتی تھیں ان سب کی وہ توجیہیں کرتے تھے ان کا یہ معیار اتنا سخت تھا کہ ۱۹۰۱ء میں جب مولوی احمد رضا خاں بریلوی ان سے ملنے گئے اور گفتگو ہوئی تو وہ بھی ان کے معیار پر پورے نہ اترے اور مولنا احمد رضا بریلوی کے جانے کے بعد انھوں نے کہا کہ اس کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔" (مولنا ابوالکلام آزاد فکر و فن ص ۲۸)

تقلید اور رسومات سے انکار

غور طلب امر یہ ہے کہ جس نے آنکھ کھولتے ہی اندھی پیر پرستی اور کورانہ تقلید و جاہلانہ ماحول اپنے چاروں طرف دیکھا ہو اس کے آگے طلب و جستجو آزادیٔ فکر و رائے کا دروازہ کیونکر کھل سکتا تھا اور وہ کون سی طاقت تھی جس نے تقلید کے اندھیرے سے نکال کر مولنا کو آزادیٔ فکر و رائے کے اجالے میں لا کھڑا کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے، مولنا نے خود اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ مولنا کا ذہن ان تمام رسومات اور بدعات کو ماننے سے انکار کرنا چاہتا تھا ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور ان کے دماغ میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے تھے اسی زمانے میں مولنا

کو سرسید اور محسن الملک وغیرہ کی روشن تحریریں پڑھنے کا موقع ملا اور اچانک ہی تقلید کی بندشوں سے ان کو آزادی مل گئی اور ایک نئی آزاد دنیا کا دروازہ ان کے سامنے کھل گیا۔ سرسید کی تصنیفات نے ان کے ذہن و دماغ میں ہل چل مچا دی اور ایک بالکل نئی دنیا سامنے آ گئی ان کی طبیعت چونکہ پرانے تصورات اور عقاید سے گھبرا چکی تھی لہٰذا یہ اثر اور بھی گہرا تھا۔

"قدرتی طور سے اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا جوں جوں پڑھتا گیا مسحوریت بھی بڑھتی گئی حتیٰ کہ اب ایک مسمیرزم کے معمول کی طرح میری دماغی حالت بالکل عامل کے قبضہ میں تھی۔" (آزاد کی کہانی ص ۳۶۱)

مولانا کے مطالعہ کرنے کی رفتار بہت تیز تھی تقریباً چھ ماہ میں انھوں نے سرسید کی تقریباً تمام تصنیفات کا مطالعہ کر لیا تھا ان کی دماغی حالت میں ایک زبردست تغیر آ گیا کل تک جن عقاید و رسومات پر ان کو غرور تھا اب وہ سب ہیچ معلوم ہونے لگیں "اس خیال سے شرم محسوس ہونے لگی کہ چھ ماہ پہلے میرے ایسے عقاید تھے" اور ایک حقارت آمیز رویہ اپنے سابق عقائد کی طرف پیدا ہو گیا اس زمانے کی قلبی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔

"میرے لیے بہت مشکل ہے کہ اس زمانے کی قلبی کیفیت کی پوری تصویر کھینچ سکوں میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا ان کی عزت میرے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا مکمل نمونہ تھا جس کی طرف ایک شائبہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بار بار حسرت ہوتی تھی کہ "یالیتنی کنت معہ" میں سوچتا کہ اگر وہ اس وقت موجود ہوتے تو کس طرح تمام علائق ترک کر کے ان کے پاس چلا جاتا اور کس طرح ان کی پرستش کرتا۔" (آزاد کی کہانی ص ۳۶۳)

یہ خود ایک انتہا پسندانہ رویہ ہے۔ سرسید کی تحریریں پڑھ کر مولانا کو سرسید کی پرستش کا خیال آیا کہ بچپن سے وہی دیکھتے آئے تھے۔ اپنے ان خیالات کی غلطی کا اندازہ مولانا کو جلدی ہو گیا وہ ان تصورات پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"میں ان خیالات کو روشن خیالی سے تعبیر کیا کرتا تھا کہ باب معرفت مجھ پر کھلا ہے اور میں خوش نصیب ہوں کہ سر سید سے ترک تقلید کا سبق سیکھا مفسرین کی فقہاء کی محدثین کی اور تمام علماء کی تاہم! میں خود سر سید کا نہ صرف مقلد اعلیٰ تھا بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کیا کرتا تھا اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ سر سید اس سے کیوں مستثنیٰ ہو جائیں گے"۔ (آزاد کی کہانی ص۳۶۸)

ایسی مثالیں دنیا میں کم ہی ملیں گی کہ جنھوں نے سر سید کی پرستش کی حد تک تعظیم کی ہو مولنا کیونکہ جذباتی اور انتہا پسندانہ رویہ رکھتے تھے لہٰذا یہ اثر ان پر ہوا مگر وہ بھی صرف مذہبی میدان میں سر سید کی سیاسی تعلیمی و تہذیبی تحریکات کے سلسلہ میں مولنا آزاد نے زیادہ مطالعہ نہیں کیا ان کو اپنے خاندانی ورثہ میں اندھی تقلید اور کورانہ خیالات کی تعلیم ملی تھی لہٰذا سر سید کی تعلیمات میں سے انھوں نے اسی میدان میں اثر قبول کیا لیکن وہ بھی سال بھر تک رہا اس ذہنی بندش کے کھلنے کے عمل کو وہ نشہ سے تعبیر کرتے ہیں "یہ نشہ سال بھر تک خوب زوروں پر رہا"۔ سر سید کی رہنمائی نے ان کو اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ اہلِ مذہب کے تمام عقائد اس رنگ و شکل میں جو عام طور سے تسلیم کیے جاتے ہیں محض وہم و خیال ہیں اور اصلیت کچھ دوسری ہے اس ذہنی دوڑ نے آخر کار مولنا کو ملحد بنا کر چھوڑا کیونکہ بے لگام خیالات اور انتہا پسندانہ رویہ کا اثر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ خدا پر یقین کر رہے تھے تو ہر پتھر تک کو خدا بنا دیا اور جب انکار پر آئے تو قرآن و حدیث رسولؐ اور خدا کی ذات سب سے منہ موڑ لیا۔

"لیکن اب جو دور شروع ہوا اس کی ضرب بیک وقت عقائد اور اعمال دونوں پر لگی۔۔ نہ مذہب پر اطمینان رہا تھا نہ مذہب کے مبادیات و اساسات پر جن کہ اس خلا کے وجود پر بھی جس کی عبادت کی جا سکتی ہے"۔ (آزاد کی کہانی ص۳۷۰)

لہٰذا جب خدا پر ہی اعتقاد نہ رہا تو کاہے کی نماز اور کیسا روزہ تمام عبادات اور اسلامی فرائض سے یکسر ہاتھ اٹھا لیا۔ مولنا کا ذہن بھی کیا عجب تھا کہ کہاں تو سر سید کبھی ان کے لیے قابلِ پرستش شخصیت تھے اور کوئی نقص کا شائبہ تک ان کی ذات سے منسوب نہ کیا جا سکتا

تھا اور کہاں اب یہ حالت ہو گئی کہ سر سید کے افکار کے سلسلہ میں اپنے والد صاحب کے خیالات کے پھر سے مداح ہو گئے کہ گمراہی کا سلسلہ وہابیت نیچریت سے شروع ہو کر الحاد تک جاتا ہے۔

"والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت پھر نیچریت اور نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو الحادِ قطعی کی ہے اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ نیچریت کو ہی الحادِ قطعی سمجھتے تھے۔ لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سر سید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت کی ہی پیش آئی تھی۔"

(آزاد کی کہانی ص۳۰۰)

یعنی جو مرحلہ مولانا کو پیش آجائے وہی قانون ہے اور یہ سلسلہ ایسا ہے جو ہر شخص کو پیش آتا ہے حتیٰ کہ سر سید بھی اس سلسلہ سے نہ بچ سکے اور ملحد ہو گئے۔ انکارِ باری تعالیٰ چونکہ مولانا نے کیا لہٰذا وہابیت کا نتیجہ یہ ہوتا ایک قانون ٹھہرا۔

الحاد اور شراب

مولانا آزاد کے الحاد کا زمانہ خاصہ طویل ہے پورے آٹھ سال وہ خدا کے منکر رہے قرآن رسولؐ اور حدیث کی کیا حیثیت جب خدا کے وجود سے ہی انکار کر بیٹھے۔ چودہ سال کی عمر سے لیکر ۲۲ سال کی عمر تک مولانا مکمل ملحد رہے اور خاص بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں مولانا "لسان الصدق" رسالہ نکالتے تھے اور مذہبی مضامین لکھتے تھے قرآن و حدیث کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کو قرآن کی زبان میں منافق کہا گیا ہے کہ دل میں یقین نہیں رکھتے اور زبان پر اقرار کرتے ہیں یہ خیال رہے کہ مولانا کی زندگی میں یہ خیالات عام نہ ہو سکے بلکہ ان کے انتقال کے بعد ان کے دستِ راست اور انتہائی قریبی دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف شدہ کتاب "آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی" کے ذریعہ عام ہوئے۔ مولانا نے اس الحادی دور کا اعتراف اپنی کتاب "تذکرہ" میں بھی کیا ہے۔

"۱۸ برس سے لیکر ۲۲ برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل و علم کے ساتھ چلانا چاہتا ہے لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق"[1]

اسی دوران جب عید آئی تو تمام لوگ عید کی نماز پڑھنے گئے، مولانا بھی مارے شرم کے نماز میں شریک تو ہو گئے لیکن ان کے دل نے انہیں بہت ملامت کی۔ اس کے بعد عیدین کی نماز بھی چھوڑ دی یعنی جو سماج سے پردہ تھا وہ بھی ختم کر دیا۔ سید سلیمان ندوی شروع میں الہلال سے وابستہ تھے لیکن مولانا کو قریب سے دیکھ کر انھوں نے الہلال سے اپنی وابستگی توڑ دی اور کلکتہ سے چلے آئے۔ مولانا آزاد نے ان کو منانے کے لیے خط لکھا اور اس میں اپنے الحاد کا اعتراف کھلے الفاظ میں کیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجب طرح کی ہے میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا"[2]

مولانا اس زمانے میں شراب سے بھی شوق فرمایا کرتے تھے مولانا سید سلیمان ندوی کے الہلال چھوڑ کر جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مولانا آزاد نے شراب پینے کا اعتراف کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی صاحب کو منانے کے لیے لکھا تھا کہ میں نے اب چھوڑ دی ہے پہلے پیتا تھا مگر اب نہیں اور خدا نے توبہ کی توفیق دے دی ہے۔

"حال ہی میں ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے میں نے جی میں کہا یہ سچ تو نہیں ہے معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان، سچ

---

[1] آزاد کی کہانی ص ۳۹۹ [2] عبدالماجد دریابادی "مکتوبات سلیمانی" اگست ۱۹۶۴ ص ۲۱

ہے یا غلط۔ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر ہی کیا موقوف ہے میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔[۱] یعنی مولانا آزاد شراب پی کر الہلال میں قرآن لکھتے تھے

سید سلیمان ندوی ایک مراسلے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھتے ہیں۔

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں سونگھنے کے نہیں مولوی آزاد وہی پھول ہیں افسوس ہے کہ میں بھی دور سے دیکھ کر سونگھنے کے قابل سمجھا آپ جانتے ہیں کہ میں علم سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں۔ اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا لیکن میری حالت اس شخص کی طرح ہوئی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے (اعمالهم کسراب بقیعة یحسبه الظمآن ماء)"[۲]

موسیقی سے لگاؤ

مولانا آزاد کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا اور اس فن میں ان کو خاصی جانکاری تھی، موسیقی ان کے لیے زندگی کا سہارا اور جسم و دل کی تمام بیماریوں کا علاج تھی، وہ موسیقی کو سنے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور ان کی خوشی اس کے بغیر نامکمل تھی۔

"میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[۳]

مولانا آزاد صنف نازک کے تئیں ہر شرعی پابندی سے آزاد تھے انکا موسیقی کا شغف ان کی مصری مغنیہ طاہرہ سے شناسائی کا سبب بنا وہ لکھتے ہیں۔

"وہ خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفت ہوش و ایمان تھی میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے

۱۔ مکتوبات سلیمانی ص۱۳۰ ۲۔ مکتوبات سلیمانی ص۱۳۲ ۳۔ غبار خاطر ص۲۰۷

کمالات دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی۔۱؎

مولانا مغنیہ ام کلثوم کے بہت بڑے شیدائی تھے اور اس کے تمام ریکارڈ مولانا نے جمع کر رکھے تھے۔

"میں نے اس کے بے شمار رکارڈ سنے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا"۲؎

موسیقی کو وہ خلافِ شرع نہیں سمجھتے تھے انکا خیال تھا کہ مفتیانِ کرام نے اس معاملہ میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا۔

"اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ فقہار نے اس بارے میں تشدد کیا"

۱۳ر نومبر ۱۹۱۳ کی الہلال کی اشاعت میں مولانا نے لکھا کہ!

"میں یہ کہنے میں نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں اس لیے اس شئے سے قطع تعلق نہیں کر سکتا جس کا تعلق دل کے ساتھ جسم و روح کا تعلق ہے"۳؎

۱؎ غبارِ خاطر ص ۲۴۵ ۲؎ غبار خاطر ص ۲۴۳ ۳؎ ایضاً

مسلم مفاد کی مخالفت

مولانا آزاد کی سیاست میں آمد

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں حکومتِ ہند نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک مغربی بنگال دوسرا مشرقی بنگال اور آسام۔ اس دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کانگریس تقسیمِ بنگال کی مخالفت میں ایجیٹیشن چلا رہی تھی پورے ملک میں بندے ماترم کا نعرہ لگایا جا رہا تھا اور حکومت پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ اس نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے بنگال کی تقسیم کی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے لیے پورے متحد بنگال کا انتظام کرنا زیادہ مشکل تھا۔ انتظامی مشکلات کو دور کرنے کے لیے بنگال تقسیم کیا گیا تھا۔ اس تقسیم سے لامحالہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا تھا کیوں کہ اس طرح بنگال کے مسلم علاقوں میں تعلیم اور ترقی کا دور شروع ہو سکتا تھا۔ مگر کانگریس نے اس تقسیم کے خلاف زبردست مہم چلائی اور آخرکار حکومت کو دباؤ میں آکر تقسیم کے فیصلہ کو واپس لینا پڑا۔ عرش ملسیانی اعتراف کرتے ہیں کہ اس تقسیم سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

"۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال کی تجویز کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو خوش کیا جائے اور انھیں ایک ایسا صوبہ دیا جائے جس میں ان کی اکثریت ہو۔"[1]

لارڈ کرزن نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ!

"بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے جہاں یہ مقصود تھا کہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر پر کام کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے جنھیں پورے صوبۂ بنگال کا تقسیم سے پہلے انتظام کرنا پڑتا تھا وہاں دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا صوبہ پیدا کر دیا جائے جس میں ان کی آواز سب پر غالب ہو۔"[2]

اخبار اسٹیٹسمین نے اس مقصد کو یوں ظاہر کیا تھا کہ!

"مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی ایک ایسی طاقت کی پرورش کی جائے جو امید ہے کہ ہندو فرقہ کی

۱۔ عرش ملسیانی: ابوالکلام آزاد ص ۲۷ ۲۔ راجندر پرشاد: ہندوستان کا مستقبل ص ۲۹۰

تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکے گی۔"[۳۶]

چونکہ اس فیصلہ کا مقصد مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا تھا لہٰذا پورے ملک کے ہندو اس فیصلہ کے خلاف ہوگئے۔ مولانا آزاد کی سیاست کی شروعات اسی زمانے میں ہوئی اور انھوں نے سیاست میں پہلا قدم تقسیمِ بنگال کی مخالفت میں ہندوؤں کا ساتھ دے کر رکھا۔ سیاسی کارروائیوں کی شروعات ہی مولانا نے عام مسلمانوں کے مفاد کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کی حمایت سے کی۔ اروند گھوش اور شیام سندر چکرورتی اس تحریک کے روحِ رواں تھے اور تقسیمِ بنگال کے خلاف ہندوؤں کی قیادت کر رہے تھے۔ مولانا نے سیاست کا پہلا سبق انہیں لوگوں سے سیکھا۔

اروند گھوش کلکتہ آگئے اور وہ تقسیم کے خلاف تحریک کا مرکز بن گئے۔ مولانا ایک دو بار ان سے ملے۔ ان کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی اور وہ انقلاب پسندوں میں شامل ہونے کے لیے کمر کسنے لگے۔ اس زمانے میں زیادہ تر ہندو ہی اس تحریک میں شامل تھے اسی زمانے میں مولانا کی ملاقات مشہور انقلاب پسند شیام سندر چکرورتی سے ہوئی۔"[۳۷]

اس تحریک سے چونکہ مسلمانوں کا نقصان ہونا تھا لہٰذا زیادہ تر ہندو ہی اس تحریک میں شریک تھے اور کوئی مسلمان اس میں شریک نہ تھا لہٰذا جب مولانا کی ملاقات انتہا پسندوں سے ہوئی جو یہ تحریک چلا رہے تھے تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ ایک مسلمان وہ بھی مولوی ہمارا حامی کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک زمانے تک ان لوگوں نے مولانا کی نیت پر شک کیا اور ان پر اعتماد نہ کیا گیا۔

انھوں نے (شیام سندر چکرورتی نے) مولانا کو دوسرے انقلاب پسندوں سے متعارف کیا۔ پہلے تو وہ مولانا پر کامل اعتماد نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں مولانا ان کے خاص ممبروں میں گنے جانے لگے۔"[۳۸]

مولانا آزاد نے الہلال میں مسلمانوں کو خوب خوب لتاڑ پلائی کہ مسلمان تقسیمِ بنگال کے حامی کیوں تھے انھیں تو اس ایجیٹیشن میں شامل ہونا چاہیے تھا جو کانگریس اس تقسیم کو ختم کرنے کے لیے چلا رہی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کی "مسلمہ قومی پالیسی" کے نام سے ایگزیکٹو لوشن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے پاس

---

[۳۶] عرش ملسیانی: ابوالکلام آزاد ص ۳۸ [۳۷] ایضاً ص ۳۸ [۳۸] ایضاً ص ۲۲

کرایا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں اور کسی بھی پولیٹیکل ایجیٹیشن میں شامل نہ ہوں یہ پالیسی مسلمانوں نے پسند کی تھی اور مسلمان سیدھے ترقی کے راستے پر بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ مولانا آزاد نے بنگالی ہندوؤں کی شہہ پر مسلمانوں کو اس متفقہ پالیسی سے ہٹنے کی تلقین قرآن وحدیث کو استعمال کر کے کی۔

"مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیمِ بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی "باغی" "بے وفائے قوم" مفسد اور اسی طرح کی بعض اصطلاحاتِ خاص سے یاد کیا جاتا تھا مگر قوم کی قوم صرف اس شریعت پر عامل تھی کہ لیڈروں کی گاڑی کھینچے ...... یہاں اس پر اجماع ہو گیا تھا مسلمانوں کی "مسلمہ قومی پالیسی" پر میجارٹی کا سوادِ اعظم تھا من شذ شذ فی النار"

مسلمانوں کے سوادِ اعظم پر مولانا آزاد نے زبردست چوٹ لگائی اور بنگالی کانگریسیوں کی اینٹی مسلم تحریک میں شمولیت اختیار کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست میں منافقانہ سیاست کی داغ بیل ڈالی جس پر دیوبندی علما کے ایک گروپ نے لبیک کہا پروفیسر مشیر الحق مولانا کی اینٹی مسلم تحریک میں شمولیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

THUS AZAD, A PRODUCT OF A FAMILY IN WHICH EVERY TRADITION WAS TO BE ACCEPTED WITHOUT QUESTION, BECAME SO RADICAL IN POLITICS AS TO ASSOCIATE HIMSELF WITH ONE OF THE IMPORTANT REVOLUTIONARY (HINDU) LEADERS OF BENGAL. GRADUALLY AZAD BECAME SO MUCH IMPRESSED BY THE ACTIVITIES OF REVOLUTIONARIES THAT HE ACTUALLY JOINED THE PARTY. IT WAS A DIFFICULT TASK FOR HIM BECAUSE THE REVOLUTIONARIES WERE EXCLUSIVELY HINDUS AND ACTIVELY ANTI-MUSLIM.

(MUSHIRUL HAQUE: MUSLIM POLITICS IN MODERN INDIA, P.69)

ملہ الہلال ۲۶ فروری ۱۹۱۳ء ص ۱۳۹۔

مسلم یونیورسٹی تحریک سے دشمنی

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں جتنا اہم کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام کر کے کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مغلوں کی سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ درپیش تھا۔ انگریزوں کی مخالفت میں مسلم علماء اور دیگر قائدین محض جذباتی اور مستقبل سے بے پرواہ ہوگئے تھے۔ انہیں قطعاً بھی علم نہیں تھا کہ دنیا کس راستہ پر چل رہی ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات نے مغرب کے انسان کے ہاتھ میں کیسے کیسے خطرناک ہتھیار اور اقتصادی طاقت دیدی ہے۔ ان سب کا مقابلہ مسلمان نعروں اور فتووں سے کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کی واضح علم دوستی کے باوجود مسلمانوں نے اپنے اوپر تمام علوم کے دروازے بند کر لیے تھے اور جو کچھ ان کے بزرگوں نے اپنے دور میں نصابِ تعلیم بنا دیا تھا اسی کو حرف آخر سمجھ کر اپنی دانست میں دنیاوی ترقیات کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ حالانکہ سب سے پہلے مسلمانوں نے چھاپہ خانے کی شروعات کی، لیکن یہ فن مسلم ممالک میں ختم ہو گیا۔ اور یورپ میں اس کی ترقی ہوئی۔ الجبرہ علم فلکیات، کیمسٹری اور راناٹمی و سرجری میں مسلم عالموں کی فتوحات اظہر من الشمس ہیں لیکن ابتدائی دور کے بعد ملت کا رجحان ان مفید علوم سے ہٹ کر فقہی و فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔ یہ علوم یوروپ میں پہنچ کر مغربی اقوام کی اقبال مندی کا سبب بن گئے۔ مسلمانانِ عالم اپنے بزرگوں کی سائنسی فتوحات سے بے خبر ایسے مسائل میں پھنس کر رہ گئے کہ آج تک ان کا ذہن مجموعی طور سے مفید علوم کی طرف متوجہ ہونے پر تیار نہیں ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ صرف اسرائیل میں جتنے سائنسٹ اور انجینیر ہیں پورے عالم اسلام میں اتنے ٹیکنوکریٹ اور سائنٹسٹ نہیں ہیں۔

ہندوستان کے پورے مسلم دور میں کسی علمی اور تحقیقی مرکز یا یونیورسٹی کے قیام کا پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ اکبرِ اعظم کو جب انگریزوں نے چھپی ہوئی بائبل کا تحفہ دیا تب بھی کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ چھاپہ خانہ ہندوستان میں بھی رائج ہو۔ اکبر کے بعد بھی ایک زمانے تک ہندوستانی مسلمان چھپائی جیسے بنیادی اور اہم فن

سے نا آشنا رہے۔ تقریباً تمام ہی مسلمان بادشاہوں کی خدمت میں یورپین مصنوعات جیسے گھڑیاں، کپڑا وغیرہ پیش کئے جانے کے واقعات ملتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود کبھی کسی دانشور کو ان چیزوں کو ہندوستان میں بنانے کا خیال تک نہ آیا۔ انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کی سب سے بڑی وجہ انکا اسلحہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انکا رسل و رسائل کا انتظام بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ مسلم دور میں خبریں گھوڑسوار ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے اور انگریزوں نے برقی تار کے ذریعہ خبریں پہنچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ ہندوستان کی حکمرانی سے مسلمانوں کی بے دخلی کی سب سے اہم وجہ ان کی تحقیق اور سائنس سے ناواقفیت تھی۔ انگریزوں کی حکمرانی قائم ہو جانے کے باوجود مسلمان اس راز سے ناواقف رہے اور پہلے کی ہی طرح مفید علوم سے بیزار رہے بلکہ اب اس بیزاری نے نفرت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اس کے برخلاف زمانہ ساز ہندوؤں نے اس تبدیلی کو خوش آمدید کہا اور انگریزوں کے علوم سیکھنے میں بہت تیزی دکھائی۔ بربادی مسلمانوں کی قسمت بن گئی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اور برباد کر دئیے گئے۔ مگر ان تباہیوں کی اصل وجوہات کو سمجھنے والا اور سمجھ کر اس کا علاج کرنے والا پوری قوم میں کوئی نہ تھا۔ سرسید کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مسلم قوم کی بربادیوں کی اصل وجوہات کا پتہ لگایا۔ نہ صرف پتہ لگایا بلکہ ان وجوہات کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ شروع میں بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر رفتہ رفتہ مخالفت کم ہوتی گئی اور سرسید کی فہم و فراست کا زمانہ قائل ہوتا گیا۔ سرسید کی کوششیں رنگ لائیں اور ہندوستانی مسلمان ایک بار پھر زندہ و تابندہ قوم بن گئے۔ مگر یہ کوششیں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کا سبب دینی علماء کا مخالفت ہونا تھا۔ اسی طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے سرسید کے انتقال کے بعد جبکہ پوری مسلم قوم علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک چلا رہی تھی ایک بار پھر اسلام کا نام لیکر اس تحریک کو ختم کر دینا چاہا۔ اس قافلے کے روحِ رواں مولانا آزاد تھے بلکہ یہ قافلہ دوبارہ سے مولانا آزاد نے ترتیب دیا اور انھیں کی کوششوں سے قوم پرور مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا جو یونیورسٹی بننے کے خلاف تھا۔ اب کی بار اس گروہ کی حمایت میں کانگریس کی پوری طاقت تھی۔ یہ ذکر پہلے ہی آ چکا ہے کہ مولانا آزاد نے سیاست میں پہلا قدم مسلم مفاد کے خلاف تنسیخِ تقسیم بنگال کی تحریک کی پرزور حمایت کر کے رکھا۔ اسی سبب سے تنسیخِ تقسیمِ بنگال کے بعد بنگالی کانگریسیو

نے مولانا کے الہلال کے اجرا ؤمیں ہر طرح مدد بہم پہنچائی۔ اس کا دوسرا سبب بنگالی کانگریسیوں کے سرسید مخالف جذبات تھے جو قیامِ کانگریس کی شروعات میں سرسید کی مخالفت اور خاص طور پر بنگالی کانگریسیوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مثال کے طور پر ہم یہ اقتباس پیش کر رہے ہیں جو سرسید کی کانگریس مخالف لکھنؤ کی مشہور تقریر سے لیا گیا ہے۔

"اگر مقابلہ کا امتحان جاری ہو تو غور کرنا چاہیے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تمام قومیں نہ صرف مسلمان بلکہ تمام ہندو اس ملک کے معزز راجہ اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلواریں یاد ہیں ایک بنگالی کو جو چھری کو دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑیگا اپنے اوپر حاکم دیکھینگے۔ ملک کے انتظام کا کیا حال ہوگا؟ کیا آپ کے نزدیک راجپوت اور پرجوش پٹھان جو پھانسی یا پولیس کی تلوار یا فوج کی سنگین سے ڈرتے نہیں وہ بنگالیوں کے نیچے امن سے رہ سکتے ہیں؟"[۱]

یہ ذکر تفصیل سے پہلے ہی آچکا ہے کہ سرسید کی کانگریس مخالفت کی وجہ سے بنگالی سرسید سے بہت زیادہ ناراض تھے اور ان کے اخبارات و رسائل سرسید کے لیے مخالفانہ مضامین سے بھرے رہتے تھے۔ مولانا آزاد کا خود کانگریسیوں سے رابطہ قائم کرکے ان کے لیے کام کرنا دراصل ایک ایسا عظیم تحفہ تھا جو بنا مانگے مل گیا تھا۔ اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ آزاد ایک مولوی بھی تھے اور قرآن و احادیث کا علم بھی رکھتے تھے۔ یہ علم ایک بہت بڑا ذریعہ مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے بن سکتا تھا سو مولانا آزاد نے اس علم کو اپنے مقاصد کے لیے جو درحقیقت کانگریس کے مقاصد تھے بے دریغ استعمال کیا۔ مولانا تو ذاتی طور سے ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے اصل فائدہ تو کانگریس کو ہونا تھا۔ یہ سودا اس قیمت پر کچھ مہنگا نہ تھا مولانا پر قرآن و حدیث کو بے دریغ استعمال کرنے کا الزام ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف آنکھیں اور دماغ کھول کر الہلال کے مضامین پڑھنے کی ضرورت ہے باقی تمام معاملات خود بخود صاف ہو جاتے ہیں

۱؎ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ ص ۲۳۱

خدا کو بھی ہار ماننی پڑے؟

مارچ ۱۹۱۶ء کے البلاغ کی اشاعت میں مولانا آزاد نے ایک مضمون "افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی" کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ مضمون مولانا کی یونیورسٹی کے تئیں نفرت اور خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے غلط اور بے جا استعمال کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے کہ اس مضمون کی زبان اور دلیلوں کا جواب دے سکیں۔ قارئین خود فیصلہ کریں کہ آیا کوئی انسان جو ذرا بھی شرافت اور مسلمانوں کیلئے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے ایسا مضمون سپرد قلم کر سکتا ہے؟

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے حکومت کا مطلوبہ روپیہ جمع کر لیا تھا اور یونیورسٹی کے معاملات پر اس کی قانونی پیچیدگیوں اور دوسری تفصیلات پر بحث وتمحیص کرنے اور یونیورسٹی چارٹر کو زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنانے کے لیے کمیٹی کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا اس مضمون میں اپنی رائے کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ملاحظہ کریں کہ خدا اور کمیٹی کو مولانا نے کس طرح برابری عطا فرمائی ہے۔

"اس سلسلہ میں سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب پہلے پہل مسلم یونیورسٹی کے متعلق دنیا نے معلوم کیا کہ جن امیدوں اور ولولوں میں ان کو مبتلا کیا گیا تھا ضروری نہیں کہ اصلیت ویسی ہی ہو۔ اسی زمانے میں الہلال نیا نیا شائع ہوا تھا۔ اس نے مسلسل چار اشاعتوں میں تعلیمی خبر کے اولین مراسلہ پر بحث کی اور مسلم یونیورسٹی تحریک اور اس کے دعاۃ وواعظین کے متعلق خصوصاً اور تمام قومی تحریکوں اور جماعتی کاموں کے متعلق عموماً ان افکارِ اسلامیہ اور عقائدِ صحیحہ کا اعلان کیا جنکی صداؤں سے سرزمینِ ہند کی اسلامی آبادی اب تک آشنا نہ ہوئی تھی۔"

البلاغ میں مسلم یونیورسٹی اور اسلامی عقائد کا مقابلہ مولانا نے جا بجا کیا ہے۔ یہ عجیب وغریب منطق ناقابلِ فہم ہے۔

"فاؤنڈیشن کمیٹی کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں یہ رزولوشن پاس ہوا کہ ایک کمیٹی ۲۶ چھبیس اشخاص کی بنائی گئی اور اس کو پورا اختیار اس کے رد وقبول کا دے دیا گیا۔۔۔ دوسرا اجلاس علی گڑھ میں کیا گیا۔ خاص علی گڑھ میں جلسہ کر کے یقین کر لیا گیا کہ ہمارے دارالخلافہ کے اندر آکر باہر کی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے گمان کیا کہ ہمارے قلعہ کی عمارتیں اللہ کی طاقت کو آنے سے روک دیں گی۔

فَاَتَاھمُ اللّٰہُ مِن حیثُ لم یحتسبُو" پس خدا ایسے راستہ سے آیا جہاں سے ظہور طاقت کا انھیں گمان بھی نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے حصار و لشکر کے اندر جلسہ کر کے بھی وہ ناکام رہے اور کلمہ حق کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر چھا گئی کہ باوجود کمال جد و جہد کے کچھ بھی نہ کر سکے"۔[1] قرآن کی آیت شاید اسی جلسہ کے لیے نازل ہوئی تھی اور کمیٹی کے ممبران بقول آزاد یہ سمجھ رہے تھے کہ اللہ کی طاقت علیگڑھ نہیں آسکتی۔ مولانا فاؤنڈیشن کمیٹی کی سرگرمیوں اور کاوشوں کو خدا کی طاقت کے خلاف چیلنج بتاتے تھے کہ یونیورسٹی بنانا اللہ کی طاقت سے جنگ کرنی ہے۔ اور اللہ سے کوئی کیسے جیت سکتا ہے۔ کمیٹی مولانا کے نزدیک خدائی کے خلاف سازشوں کا مرکز تھی۔ اور یہ گروہ خدا کے خلاف محاذ آرائی کر رہا تھا۔ فرمایا

"اب دس اپریل کو پھر فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا گیا ہے اور یہ لوگ تین (۳) سال کے متواتر اور مسلسل تجربہ کے بعد اب پھر اٹھے ہیں کہ خدا کو اور اس کے کلمہ حق کی قوت کو ایک بار اور آزمالیں۔ یہ محض فاؤنڈیشن کمیٹی کا مجمع ہی نہیں ہے بلکہ ان کوششوں اور تدبیروں کی انتہا ہے جو مشیت الٰہی کے مقابلہ میں انسانوں کا کوئی گروہ کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہے کہ اگر ہم ایک مرتبہ آخری جانبازانہ کوششوں کا سامان اور کرلیں گے تو خدا کو شکست دے دیں گے۔ کیونکہ انسانوں کی طرح وہ بھی لڑتے لڑتے تھک جا سکتا ہے۔ اور اگر بہت زیادہ روپیہ بہت زیادہ سازشیں بہت زیادہ انسان اور بہت زیادہ انسانی تدبیروں کا مواد جمع کر لیا جائے تو کیوں نہ خدا کو بھی ہار ماننی پڑے؟ چنانچہ مہینوں سے طرح طرح کے سامان کئے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے دعوے اور بڑے بڑے اعلانات سننے میں آرہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آخری معرکہ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے"۔[2]

مولانا آزاد اگر خدا کی جگہ اپنا نام لکھ دیتے تو شاید بات میں کچھ جان پڑ جاتی اور محض دیوانے کی بڑ نہ معلوم ہوتی ہو سکتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں اپنا ہی نام رہا ہو اور خود کو خدا سمجھ لیا ہو۔ قرآن کی آیت کا استعمال ملاحظہ کریں۔

"یہ وہی حق اور باطل کی معرکہ آرائی ہے جو برسوں سے ہو رہا ہے۔ یہ وہی انتخاص

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

اور جماعت کے فوائد کی معرکہ آرائی ہے جس کا میدان عرصے سے گرم ہے پس قریب ہے کہ حق ظاہر ہو اور کچھ دیر نہیں کہ جس کلمہ کے ساتھ اللہ کی مشیّت و حکمت شامل ہے وہ اپنی آخری فتح مندی کا اعلان عام کر دے ...... (قرآن: ۱۱: ۱۲۲)

ترجمہ: اے لوگو تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کر رہے ہیں اور پھر نتیجہ کا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اور تمہارا پروردگار ان کاموں سے غافل نہیں ہے جن میں تم لگے ہوئے[1]

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی: حق سے ٹکراؤ

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے سلسلہ میں مولانا نے اپنے اخبارات الہلال و البلاغ میں کئی مضامین سپردِ قلم کیے۔ یہ مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں یہاں الہلال میں شائع ایک مضمون کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں اس مضمون میں مولانا نے کمیٹی اور حق کو جدا جدا اور ایک دوسرے کی ضد بنا لیا ہے۔ اپنے دعوے کی دلیل میں قرآن کی آیات پیش کی ہیں، دینی علما اس پر غور فرمائیں کہ کیا یہ آیتیں اس معانی میں استعمال کی جا سکتی ہیں۔

مولانا سمجھتے تھے کہ راست بازی و حق گوئی دنیا میں آج مظلوم ہے اور کوئی نہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبران کی مخالفت مول لے حالانکہ خدا ان کو آزمائیگا محض وعدوں سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ مولانا کمیٹی کو مسلمانوں کو گمراہ کرنے والا مجمع سمجھتے تھے۔ فاؤنڈیشن کمیٹی نے ایک ڈیپوٹیشن حکومت سے گفت و شنید کرنے کے لیے بنایا تھا۔ اس ڈیپوٹیشن کی ممبری سے مظہر الحق صاحب نے استعفیٰ دیدیا تھا۔ کچھ آپسی اختلافات کی بنا پر یہ استعفیٰ دیا گیا تھا۔ مولانا کو موقع ہاتھ آیا اور اس واقعہ کو بنیاد بنا کر فاؤنڈیشن کمیٹی کو حرفِ ملامت بنایا۔

"مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے پچھلے اجلاس کے واقعات میرے لیے واقعی بر از اشکال تھے میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ کس قدر پر آشوب ہے اور حق و راستی کی مظلومی کس درجہ درد انگیز حد تک پہنچ چکی ہے کوئی نہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر اس کے چند بندوں کا غصہ جھیل لے"[2]

---

[1] ایضاً [2] الہلال مارچ ۱۹۱۳ء ص۵

مولانا آزاد فاؤنڈیشن کمیٹی کو حق اور راستی کے خلاف جنگ کرنے والا ایک مجمع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کمیٹی کا ہر کام راست بازی کے خلاف ہے اور انھیں صدمہ تھا کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو خدا کی خاطر ان سنگدل کرنے والوں کی مخالفت کر سکے۔ خدا کو بمقابلہ کمیٹی رکھ کر مولانا مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کمیٹی کو بے ایمان اور گمراہ خیال کرتے تھے۔ اپنے گمراہ خیالات میں وہ اس قدر شدید تھے کہ مندرجہ ذیل قرآن کی آیت اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کی۔

"جو لوگ دنیا سے تعریف و مدح مانگتے ہیں ان کو پہلے بتا دینا چاہیے کہ اس کے لیے انھوں نے کیا کھویا ہے۔ (قرآن ۲۹ : ۴)

ترجمہ: کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان سے ایمانداری و راستی کا دعویٰ کر دیں گے اور بغیر آزمائے ہوئے چھوڑ دیے جائیں گے۔ (حالانکہ) جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں خدا نے ان کو بھی آزمائش میں ڈالا تھا۔ (اور یہ ناگزیر عمل ہے) عنقریب خدا ان لوگوں کو معلوم کرکے رہے گا جو اپنے دعوے صداقت میں سچے ہیں اور ان کو بھی جو اپنے اندر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ کیا جن لوگوں کی قوتیں اعمال بد میں خرچ ہو رہی ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے"۔

مظہر الحق نے اس کمیٹی سے ذاتی وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس خبر کو حق و باطل کی جنگ میں حق کی فتح سے تعبیر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مظہر الحق نے صرف استعفیٰ ہی نہیں دیا ہے بلکہ حقیقی شانِ اسلامی کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے جس کی تمام ممبران کو پیروی کرنی چاہیے قرآنی آیت کو استعمال کرکے تمام ممبران سے فرمایا کہ وہ بھی استعفیٰ دیدیں یعنی کوئی پہلو مولانا نے فاؤنڈیشن کمیٹی کی مخالفت کا باقی نہ چھوڑا۔

"مسٹر مظہر الحق نے مسلم یونیورسٹی کے ڈیپوٹیشن کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا۔ میں اپنے عقیدے اور دینی بصیرت کے مطابق یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے استعفیٰ نہیں دیا ہے بلکہ سچائی اور راستبازی کی ایک مثالِ عظیم قوم کے سامنے پیش کی ہے ... خدا نے مومنوں کی سب سے بڑی خصلت یہ بتائی ہے (یجاہدون فی سبیل اللہ ولا یخافون ...... (حق کی راہ میں جہد و سعی کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی

ہ ایضاً

پرواہ نہیں کرتے۔) مجھ کو اعتراف ہے کہ مسٹر مظہرالحق نے اسی حقیقی خصلت ایمانی کا نمونہ قوم کو دکھلایا ہے۔ وفی ذٰلک ...... التنا فسون (اور یہی چیز ہے جس کی پیروی کرنے والوں کو پیروی کرنی چاہیے)۔[۱]

اسی مضمون میں آگے دعا فرمائی کہ مظہرالحق کو اجرِ عظیم ملے اور ایسی ہی قوم پرستی کی مثالیں سامنے آئیں۔

نہیں سمجھتا کہ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ تعالےٰ اس خدمتِ جلیل وعملِ عظیم کے لیے ان کو جزائے خیر دے اور اُس وقت کو دکھانے میں زیادہ دیر نہ کرے جب قوم پرستی اور راست بازی کی ایسی ہی مثالیں بکثرت قوم کے سامنے ہوں۔[۲]

حکومت کی بھیک اور جاہلِ مطلق لیڈران

اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں مولانا کا ایک اور مضمون شائع ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی، یونیورسٹی کی اندرونی خود مختاری کا مطالبہ کر رہی تھی اور حکومت کچھ شرائط پیش کر رہی تھی۔ یوں گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا اور کچھ تلخیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ مولانا نے اس ماحول کا فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات کا اظہار اس مضمون میں کیا کہ مسلم قوم چالیس سال تک حکومت کی بھیک پر پلتی رہی اور سیاسی جدوجہد کو جرم سمجھا اس لیے حکومت اس کی بات کیوں سنے

جو قوم چالیس برس تک محض حکومت کی بھیک، دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے انکار کر دیا، جس نے ہر موقع پر سیاسی جدوجہد کو ایک جرم اور بغاوت سمجھا... آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پرواہ کرے کیوں نہ اس کو ذلیل وخوار بنایا جائے۔[۳]

مولانا کے نزدیک مسلمان چالیس برس تک بھیک پر بسر کرتے رہے یعنی تعلیم کے لیے جو کوششیں علیگڑھ تحریک کے ذریعہ کی گئیں وہ بھیک مانگنے سے مماثلت رکھتی ہیں...... سیاسی جدوجہد کو مسلمانوں نے کبھی جرم نہیں سمجھا، ہاں کانگریس کے خطرناک عزائم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرسید نے مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی جماعت الگ بنائی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان بہت بھولے بھالے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ ہی اپنے لیڈروں کی بات مانی حالانکہ وہ قائدین جاہ پرست اور جاہلِ مطلق تھے

---

[۱] الہلال ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء ص ۳ [۲] ایضاً

اور انھوں نے کبھی بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا خیال نہیں کیا۔

"مسلمان تو ایک ایسی قوم ہے کہ شاید ہی دنیا میں انسانوں کا کوئی گلہ اتنا خوش عقیدہ اور تقلید دوست ہو۔۔۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ ہم میں جو گروہ آج رہنمائی کی موٹر پر سوار ہے اور جس نے لیڈری کا تخت خود ہی بچھایا ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی رسم تاجپوشی ادا کی ہے اس نے اپنی دنیوی عزت وشوکت اور جاہ ونمائش کا جوا کھیلنے کے لیے اپنی امت مظلومہ کو ایک بازیچہ بنالیا ہے۔۔ مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کی گاڑیاں کھینچی ہیں ان کی چیخ وپکار پر ہزاروں اور لاکھوں روپیہ نکال کر رکھ دیئے ہیں۔ ان کے ہر حکم کو فرمانِ الٰہی سمجھ کر اپنا نصب العین بنایا ہے اور یہ سب کچھ ان جاہ پرست جاہلِ مطلق اور عبدۃ الحکام لیڈروں کے ساتھ کیا ہے جنھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی ان کو فائدہ پہنچانے کا خیال نہیں کیا"[1]

مولانا محسن الملک، آغا خان، محمد علی جوہر وغیرہ سے بہت زیادہ حسد کرتے تھے۔ جن لوگوں کو جاہلِ مطلق اور جاہ پرست مولانا فرما رہے ہیں مولانا زندگی بھر بھی ان کے پاسنگ برابر بھی نہ ہو سکے تھے اگر مسلم مفاد کے خلاف بول کر ہندؤں کی حمایت حاصل نہ کرتے۔ تعجب یہ ہے کہ آج الہلال کا سارے زمانے میں چرچہ ہے تمام مسلم دانشوران اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتے ہیں یہ مولانا کا ہی جاری کیا ہوا طریقہ ہے کہ مسلمانوں کو برا کہو اور ہندؤں کی حمایت کر کے بڑے بڑے عہدے حاصل کرو۔ لہٰذا مولانا کانگریس کے صدر بنائے گئے اور نئی تعلیم اور سائنس، وانگریزی علوم سے مطلق ناواقفیت کے باوجود وزیرِ تعلیم بنائے گئے کہ اصلی کام تو آئی اے ایس سیکریٹریز کو کرنا ہوتا ہے وزیر تو محض انگوٹھا لگاتا ہے۔

"خیر یہ تو ایک داستانِ مسلسل ہے جس کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے شورا شوری کی بے نمکی میں ہمارے لیے ایک مؤثر سبق ہے"[2]

انھیں وجوہات کی بنا پر مسلم یونیورسٹی میں ہمیشہ مولنا آزاد کو اچھے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

"ہم یہ پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیڈروں کو اب گورنمنٹ کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ کیوں وہ مسلمانوں کی امیدوں کا لحاظ کرے؟ کیوں وہ اپنے دروازے کے ایک دریوزہ گر کو جس نے ہمیشہ چھوڑی ہوئی ہڈیوں اور روٹی کے باسی ٹکڑوں کو

---

[1] الیضاً [2] الیضاً

آنکھوں سے لگاکر کشکول میں ڈال لیا ہو اور اتنی ہی فیاضی پر خوش ہو کر اپنے معطی کو حاتمِ وقت بتلایا ہو آج اتنی فیاضی کو بھی مصلحت کے خلاف دیکھ کر بھڑک نہ دے۔" ؎۱

کوئی کہہ سکتا ہے کہ بچوڑی ہوئی ہڈیاں اور باسی روٹی کے ٹکڑے مولانا اور ان کے ہم نواؤں نے ضرور چنے اور کانگریس نے آزادی کے بعد ایجوکیشن منسٹری مولانا کے کشکول میں ڈال دی۔ مولانا نے اس کو سر اور آنکھوں پر لگایا اور مسلم قوم ماری کاٹی جاتی رہی ذلیل کی جاتی رہی ایسے وقت میں خاموش رہنے کے صلے میں ان کو سنگیت، ناٹک، اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی وغیرہ کا سرپرست بنایا گیا۔

"اب شاید لکھنؤ میں کوئی جلسہ کیا جائیگا۔ ہمارے ایک دوست (جو یونیورسٹی کمیٹی کے ممبر بھی ہیں) کہنے لگے کہ گورنمنٹ کے اس حکم پر اب عام ایجیٹیشن کیا جائیگا۔ اللہ اللہ اب مسلمانوں کے دشمنوں کو بھی ایجیٹیشن کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہاں اب شاید (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول) کی آیت قرآن سے نکال دی گئی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ چالیس برس کی "مسلمہ قومی پالیسی" بزرگ سرسید کی پولیٹکل شاہراہِ قومی جدوجہد کی بے خطر راہ وغیرہ وغیرہ من الخرافات کے پُر از حکمت گوناگوں مصالح بوقلمون اسباق کیوں بھلا دیئے گئے؟ یہ کیا بدعت سیۂ کفر و ضلالتِ صریح ہے جسکی ملت بیضا مصلحین مرتکب ہو رہی ہے؟ یہ تو ہمسایہ قوم کے باغیانہ اعمال تھے جن سے مسلمانوں کی قوم من حیث القوم الحمد للہ ہمیشہ مجتنب رہی اور اگر کبھی کسی شر ذمۂ قلیل کو ہندوؤں کی چالاکیوں نے گمراہ کیا بھی تو مسلمان لیڈروں نے ان کی اصلاح کر دی۔" ؎۲

مولانا کے نزدیک ہندو ہی ملک کی مجاہد قوم تھی۔ اور مسلمان انگریزوں کی وفاداری کی وجہ سے سیاسی جدوجہد کے میدان سے الگ رہے۔ یہ باغیانہ اعمال صرف ہندو ہی کر سکتے تھے۔ مولانا طنز فرما رہے ہیں کہ آج کیوں مسلمان ایجیٹیشن کی راہ اپنا رہے ہیں یعنی اگر مسلمان اپنے کسی جائز مطالبے کے لیے ایجیٹیشن چلائیں تو وہ درست نہیں کہ پہلے کیوں ایسا نہیں کیا تھا۔

؎۱ الہلال ص۲ ؎۲ ایضاً ص۵

شیعہ کالج لکھنؤ

مولانا آزاد نے شیعہ کالج کے قیام کی بہت عجیب ڈھنگ سے مخالفت کی ہے۔ پہلی یہ کہ علی گڑھ اور شیعہ کالج کے درمیان اختلاف بڑھانے کی کوشش کی دوسرے یہ کہ انگریزوں کا ساتھ لیے جانے کی مخالفت کی۔ فروری ۱۹۱۶ء کے البلاغ میں ایک مضمون "شیعہ کالج" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں شروع میں اتحاد بین المسلمین پر زور دیا اور آخر میں فرمایا۔

"یہ ہیں میرے عقائد یہ ہے میرا مسلک اور یہ ہے وہ بصیرتِ راسخہ جو کتاب وسنت نے مجھے عطا فرمائی ہے اسی بصیرت نے مجھ کو ہمیشہ فریقانہ نزاعات سے الگ رکھا اور وہی آج مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے عزیزوں اور بھائیوں کے آگے جنھوں نے اپنی مصلحت پر عزیزوں کے نفاق کو ترجیح دی ہے دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح۔۔ مجوزہ شیعہ کالج کے طرز واسلوب کار سے اپنا اختلاف پیش کروں"[1]

پچیس فروری ۱۹۱۶ء کو پھر ایک مضمون "شیعہ کالج" کے عنوان سے البلاغ میں شائع کیا جس میں ایک نئے پہلو سے شیعہ کالج کے قیام کی مخالفت کی اور علی گڑھ اور شیعہ کالج کے بانیوں میں تفرقہ کا بیج بونے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے سرسید کے ایک بڑے مرکزِ تعلیم کے نظریہ کا سہارا لیکر علی گڑھ تحریک سے وابستہ حضرات کو شیعہ کالج کی مخالفت کی تلقین کی۔ اس مضمون کے شروع میں سرسید کی اس پالیسی کی مخالفت کی ہے کہ مسلمان صرف تعلیم کے ذریعہ ہی ترقی کر سکتے ہیں۔

"اُن لوگوں نے اپنی تقلید کا ایک نیا بت بنایا ہے اس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بت ہوتا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ علم وعمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم سرسید کی پالیسی سے سرمو تجاوز نہ کریں گے اور مسلمان صرف وہی ہے جو سرسید کی پالیسی پر نہ صرف ایمانِ مجمل بلکہ ایمانِ مفصل کا اقرار کرے"[2]

---

[1] البلاغ ۱۸، فروری ۱۹۱۶ء ص۳ [2] البلاغ، ۲۵، فروری ۱۹۱۶ء ص۳

"مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ" کے عنوان سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک رزولوشن سرسید نے پاس کر دیا تھا جس میں مسلمانوں کی قسمت کو تعلیمی ترقی سے وابستہ کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس میں اتنا اضافہ اور کردیا کہ اس رزولوشن میں یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی جب تک کہ وہ متفرق تعلیمی کوششوں کو ترک نہ کردیں گے ناممکن ہے۔

اس رزولوشن کو بنیاد بنا کر مولانا نے علی گڑھ والوں کو للکارا کہ اب جبکہ لکھنؤ میں شیعہ کالج بن رہا ہے تم اس کی مخالفت کیوں نہیں کر رہے ہو؟ سب گونگے اور بہرے کیوں بن گئے؟

سرسید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ انھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس اور نیز میرٹھ کانفرنس میں خاص رزولوشن پیش کئے کہ جب تک مسلمان اپنی متفرق اور علیحدہ کوششوں کو ترک کرکے ایک مکمّل تعلیمی مرکز نہیں بنالیں گے ان کی کشتی طوفانِ ہلاکت سے نہیں نکلے گی چنانچہ انھوں نے اس رزولوشن کا نام "مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ" رکھا۔۔۔ میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت اس کی مخالفت واصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے لیے کیا کارروائی کی ہے؟ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا موضوع صرف تعلیم ہے مسئلۂ تعلیم قوم کی اس یکسر ہلاکت و بربادی کے لیے کون سی صدا بلند کی ہے؟ یہ کیا کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکسر بہرا گونگا بن گیا ہے۔ جیسا کہ سرسید نے نہیں بلکہ صاحبِ شریعت نے کہا ہے۔ "الساکت عن الحق شیطان اخرس"۔۔۔ اور یہ کون ہے جس نے تمام مصلحینِ قوم ماہرینِ فلسفۂ تعلیم۔۔۔ کی زبانوں پر قفل لگا دیے ہیں کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ اور سب پر ہلاکت کی چپ اور موت کی خاموشی چھا گئی ہے؛ "اموات غیر احیاء و لا یشعرون (قرآن ۱۶: ۲۱)"[1]

آخر میں علی گڑھ پارٹی کو مولانا للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارا مسلکِ مرکزیت کہاں ختم ہو گیا؟ اب کیوں

---

1. ایضاً

خاموش ہو اور شیعہ کالج کی مخالفت کیوں نہیں کرتے؟ اس خاموشی کا جواب بھی مولانا کے پاس ہے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کیونکہ انگریز گورنر شیعہ کالج کی حمایت کر رہا ہے اس لیے یہ لوگ اس کی مخالفت نہیں کر رہے۔ کیا خوب منطق ہے۔

"تمہارا مسلکِ مرکزیت کہاں گیا، تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جا رہی ہے تم کہاں چھپ گئے ہو، تمہارے امامِ معصوم کا مذہب ذبح کیا جا رہا ہے تم کیوں نہیں بولتے؟ تم بھلا ان سوالات کے جواب کیا دو گے میں خود ہی حقیقت بے نقاب کیے دیتا ہوں... اصل یہ ہے کہ تمہارے صوبے کا سب سے بڑا حاکم اعلانیہ شیعہ کالج کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے یہ دیکھ کر تمہارے ہوش و حواس غائب ہو گئے ہیں اور مارے ڈر و ہیبت کے تمہاری جان نکلی جا رہی ہے۔ تم دیکھتے ہو مگر بول نہیں سکتے۔ تم کہتے ہو کہ اگر ہم نے ذرا بھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ ہم دربارِ شاہی سے مردود ہو جائیں"[۱]

یہ ہے مولانا کے تصور کی اڑان ان کا ذہن عجائبِ روزگار تھا اور طرح طرح کے شاخسانے تراشتا رہتا تھا خود ہی سوال قائم کیا اور خود ہی پوچھا یا جواب لکھ دیا اور قرآن تو ہے ہی مولانا کی حمایت کرنے کے لیے

"آہ ایک انسان کے ڈر نے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کر دی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے جس کو تمہارا دل کہہ رہا ہے۔ اے مسرت ایمانو! تم انسان سے ڈرتے ہو مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے نکل جاتا ہے۔ "علیٰ خوف من فرعون"[۲] ---- یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر تم میرے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہو اور تمام دنیا دیکھ لیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے"[۳]

۱۔ ایضاً   ۲۔ ایضاً   ۳۔ القرآن الحکیم (۱۰، ۸۳)

مسلمانوں کی گمراہی: تعلیم مسلم یونیورسٹی اور مسلم لیگ

الہلال ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں،

مولانا نے "بنیادی گمراہی" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون مولانا آزاد کی فکر کا آئینہ دار ہے کہ اس زمانے میں وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کن کن کاموں کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ تعلیم اور مسلم یونیورسٹی تحریک کو بھی مولانا مضرت رساں سیاست پر قربان کر دینے کے حق میں تھے جس انداز سے اور جن الفاظ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے وہ ایک قابلِ توجہ بات ہے۔ مولانا ہندوؤں کو ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت سمجھتے تھے۔ سر سید کی تعلیمی تحریک اور بعد میں مسلم یونیورسٹی تحریک دونوں مولانا کی نظر میں اس لیے شروع کی گئی تھیں کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ رہیں یعنی مسلمان کانگریس میں شریک نہ ہوں۔

"سب سے پہلے یہ ہوا کہ ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت یعنی ہندوؤں سے مسلمان الگ ہو گئے اور اس طرح عرصہ تک کے لیے ملکی مطالبات کی فتحیابی سے گورنمنٹ مطمئن ہو گئی اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری تھا کہ ان کو بیکار نہیں چھوڑنا چاہیے ورنہ بیکاری سے اکتا کر راستہ کی تلاش میں ضرور نکلیں گے کوئی مشغلہ ایسا ہونا چاہیے جو عرصہ تک ان کو اپنے میں الجھائے رکھے اور اصلی کاموں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دے۔ تعلیم کو مسلمان پہلے ہی سے لیے بیٹھے تھے اسی لیے اعلیٰ تعلیم کے بال و پر پھیلا کر ایک ایسا الف لیلہٰ کا عجیب الخلقت پرندہ بنایا جو اپنے پر کھول دے تو سورج کو زمین پر جھانکنے کے لیے کوئی سوراخ نہ ملے۔"[1]

یعنی سر سید نے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس کر کے مسلمانوں کو اس کی طرف راغب کرنے کی جو کوشش کی اس کے پسِ پردہ یہ سازش تھی کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ ہو جائیں جو مولانا کی نظر میں کانگریس کے جھنڈے تلے حریت کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ جس وقت ملک کی جائز آزادی کے مطالبات میں ہندو اپنا وقت و روپیہ خرچ کر رہے تھے مسلمان تعلیم کی ٹھنڈی لاش لیے پھر رہے تھے۔

---

[1] الہلال ستمبر ۱۹۱۲ء

ایسا لگتا ہے کہ مولانا تعلیم کے معنی سے ہی نا واقف تھے ورنہ تعلیم کو ٹھنڈی لاش سے تشبیہہ دینا کسی ناسمجھ آدمی کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

"قوم کی وہ تو تیں جو یقیناً زمانے کے قدرتی اثرات سے متاثر ہو کر ملکی تحریکوں میں صرف ہوتیں تمام تو صرف ایک اعلیٰ تعلیم کے شور و واویلا کے پیچھے مٹا دی گئیں اور جبکہ ہم سے ایک دیوار کے فاصلے پر ملک کی جائز آزادی، ملکی حقوق کے مطالبات۔۔ کی گرمیوں میں ہمسایوں کے جذبات و امیال صرف ہو رہے تھے ہم اپنی کانفرنسوں، اپنے بڑے بڑے مجمعوں، اپنی شاندار تحریروں، اپنے قومی اخباروں کے صفحوں کے اندر صرف ایک افسانۂ تعلیم کی سرد لاش اٹھائے پھر رہے تھے۔ قومیں اگر وطن پرستی کے نشہ میں چور تھیں تو ہم تعلیم کے خمار میں انگڑائیاں لیتے تھے ہمسائے اگر ملکی آزادی کے آفتاب کے نیچے کھڑے تھے تو ہمارے سر اور چہرے تعلیم کی شبنم سے بھیگ رہے تھے۔"[۱]

ہمسائے یعنی ہندو مولانا کے نزدیک ملکی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اور مسلمان فقط تعلیم کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ مولانا کو شاید یہ نہیں پتہ تھا کہ اس وقت ہندو یونیورسٹی بنائے جانے کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی اور ۱۹۱۶ء میں ہندو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آگیا۔ مولانا کے نزدیک وطن ایسے خدا کا درجہ رکھتا ہے جو خدائے وحدہٗ لاشریک سے بھی بلند تر ہے۔ مولانا کی کوشش تھی کہ مسلمان ہندوؤں کی قیادت میں ملک کو اپنا دیوتا بنا لیں اور پرستش کریں جیسا کہ وہ خود کرتے رہے۔

"اعلیٰ تعلیم کی گرہ سلجھانے میں ہم نے چالیس برس سے زیادہ صرف کر دیئے لیکن انسان جو سونے اور جاگنے دونوں کے لیے بنایا گیا ہے ممکن نہیں کہ صرف سوتا رہے چالیس برس کے مرض النوم کے بعد آپ خود بہ خود طبیعتیں کروٹیں لینے لگی ہیں بالآخر تعلیم کے افسانے کی خواب آور قوت گھٹنے لگی اور مسلمان بھی اب اس افسانے سے اکتا گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ ہندوستان کے آنسو پوچھنے کے لیے رفاہی اسکیم کا رومال جیب سے نکال رہی تھی اور ملک میں ایک نیا انقلاب ہونے والا تھا اس وقت ممکن

---

[۱] ایضاً۔ [۲] ایضاً۔

تھا کہ مسلمان چالیس برس گنے کے بعد ہوشیاری کی آنکھیں کھولتے اور ہندوستان کی جاگنے والی قوم ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جاتے کیونکہ پرانے مشغلۂ تعلیم میں اب زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور پولیٹیکل کاموں کا اسٹیج ملک بھر میں صرف کانگریس ہی تھا۔ پس ضرور ہوا کہ اب تبدیلیٔ ذائقہ کے لیے کوئی نیا کھلونا ہماری گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ کھلونا ہماری نئی ضلالت یا غفلتِ بیداری نما مسلم لیگ تھا۔"

مولانا کی اکثر تحریروں میں چالیس سال سونے یا گمراہی میں بسر کرنے کا ذکر بہت ملتا ہے۔ اکثر مولانا نے یہ لکھا ہے کہ چالیس سال کی غلط روی کے بعد اب مسلمانوں کو سنبھلنا چاہیے۔ یہ خاص توجہ کے لائق بات ہے مولانا کی اس تحریر کے وقت سرسید کو علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو گئے تھے۔ سرسید کے آخر دور میں مسلمانوں میں مکمل اتحاد تھا کہ سرسید کا بتایا ہوا راستہ بالکل درست ہے یہ مولانا آزاد کا کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے خلاف انھوں نے[۲۰] اٹھائی۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان اب شاید ہندوؤں کی قیادت قبول کر لیتے کہ تعلیم کا نشہ اتر رہا تھا لیکن ان کو ایک نیا کھلونا دے دیا گیا اور وہ کھلونا مسلم لیگ تھا۔ ہندو مولانا کے نزدیک جاگنے والی اور کام کرنے والی قوم تھی کیونکہ انھوں نے کانگریس بنائی تھی وہ چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیم کو چھوڑ کر ہندوؤں کے پیچھے چلنے لگیں۔ اپنا کوئی سیاسی تشخص اور وزن پیدا نہ کریں۔ مولانا نے تمام عمر اسی کام میں صرف کر دی کہ مسلمان کہیں سیاسی طاقت نہ بن جائیں مسلمانوں کو صرف ہندوؤں کے پیچھے چلنا چاہیے۔ اس مشن کی حمایت میں قرآن کی دلیلوں سے ان کی ہر تحریر و تقریر پُر رہتی تھی۔

"ہم کو سمجھایا گیا کہ آج سے تیس برس پہلے جو اسباب پالیٹکس سے الگ رہنے کے تھے آج پالیٹکس میں در آنے کے بعد بھی قائم ہیں اس سبق کہنہ کو پھر دہرا لو تعلیم کی کمی تعداد کی قلت بے میارتی کا خلفشار عناصر کی مسابقت۔۔ اس لیے اگر ملکی حقوق کے میدان میں آگے تو ہمسایہ قومیں تم سے بازی لے جائیں گی۔ پس تمہاری سیاست یہی ہے کہ پہلے اپنے حقوق ہندوؤں کے مقابلے میں تو حاصل کر لو انھوں نے اپنے غلبۂ تعلیم و تعداد

۲۰۔ ایضاً۔

سے تمہاری ترقی کی راہیں تم پر بند کر دی ہیں اور تمہارے قومی حقوق چھین کر غصب کر لیے ہیں اصل پالٹکس وہی ہے کہ ان راہوں کو ہمسایوں کے حملوں سے محفوظ کر لو۔[1]

اس تحریر سے تیس سال پہلے کا عرصہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب سر سید نے مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی تھی کہ مسلمان تعلیم میں کم ہیں، تعداد میں کم ہیں ان کے لیے کسی بھی ایجی ٹیشن میں شریک ہونا خطرناک ہے۔ مولانا اس نظریہ کے بہت خلاف تھے وہ تو تعلیم ہی کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی تعلیم میں پہل اور تعداد کا زیادہ ہونا کسی بھی طرح مسلمانوں کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو تو نہ تعلیم حاصل کرنی چاہئے اور نہ اقلیت ہونے سے ڈرنا چاہئے۔ صرف آنکھیں بند کر کے کانگریس کی سیاست میں کود پڑنا چاہئے۔ یہ مولانا کی عجیب و غریب منطق ہے جس کا کوئی بھی حامی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد یہ ثابت کیا کہ مسلمان ہمیشہ ہی غلط راہ پر چلتے رہے۔ پہلے یہ کہ تعلیم میں چالیس سال ضائع کر دیئے اس کے بعد مسلم لیگ بنائی یعنی سیاسی شناخت کی بیکار کوشش کی اور اب اسی غلط راہ پر چلتے ہوئے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ گمراہی کی آخری منزل تھی۔

"گزشتہ تمہید سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ ہمارا قدم جب کبھی اٹھا غلط راہ پر اٹھا۔ جس زمانے نے ہندوؤں کا ہاتھ پکڑا تھا اس کو ہماری رہنمائی سے انکار نہ تھا کسی نہ کسی طرح ہم بھی صحیح راہ پر چل نکلتے مگر ہمارے لیڈروں نے ہمیشہ ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی کھلونا ڈال دیا۔ جس کے مشغلے میں الجھ کر ہم کو اصلی کاموں کو اختیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی پہلے اعلیٰ تعلیم میں چالیس سال بسر کرا دیے پھر جب اس سے اکتا گئے اور دیکھا کہ قابو سے باہر ہو رہے ہیں تو مسلم لیگ کا طلسم کھڑا کر دیا۔ اسی زنجیر کی آخری کڑی مسلم یونیورسٹی کی تحریک تھی جو عین ایسے موقع پر شروع کی گئی جبکہ ملک کے در و دیوار سے تغیر و تبدل کی صدائیں اٹھنے والی تھیں ...... اتنے طویل عرصہ کی غلط روی کے بعد اب شاید صحیح راستے کی تلاش شروع ہو جاتی لیکن مسلم یونیورسٹی کی ایک ایسی طول طویل داستان شروع ہو گئی جس کے پیچ در پیچ قصوں کو سنا کر اور ہر طرف سے کان بند

---

[1] الہلال۔ ۸ستمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۸

کر دیے گئے ہیں۔[۱]

مولانا ہندوؤں کو صحیح راہ پر گامزن سمجھتے تھے۔ لیکن اس کی وجوہات پر انھوں نے شاید کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں کی کوئی بھی قوم بغیر تعلیم حاصل کیے ہوئے کسی بھی طرح کی کوشش نہیں کر سکتی ہندو ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے سے تعلیم کی طرف متوجہ تھے اور مسلمان سرسید کی کوششوں سے ۱۸۷۵ء میں کچھ کچھ تعلیم میں دلچسپی لینے لگے تھے مگر یہ بھی مولانا آزاد جیسے لوگوں کو گوارا نہ تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کسی طرح یہ راستہ چھوڑ دیں۔ کانگریس ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بنائی اور مسلم لیگ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بنائی اگر مولانا مسلمانوں کے ہمدرد ہوتے تو تعلیم سے نہ روکتے بلکہ اس کے لیے کوشش کرتے۔

انفاق فی سبیل الشیاطین
شیطان کے راستے میں خرچ کرنا

پہلی جنگ عظیم میں ترکی جنگ میں ملوث تھا خلافت عثمانیہ کا آخری دور تھا مسلمان خلافتِ عثمانیہ کی بقا میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو ایک نادر موقع مسلم یونیورسٹی تحریک کی مخالفت کا ہاتھ آیا۔ حکومت کی عائد کردہ شرط تھی کہ مسلمان پہلے تیس لاکھ روپیہ جمع کریں تو یونیورسٹی ان کو مل سکتی ہے۔ ترکی کے مسلمانوں کی مدد کے لیے بھی ہندوستان میں روپیہ جمع کیا جا رہا تھا۔ مولانا کی رائے تھی کہ تیس لاکھ روپیہ جو یونیورسٹی لینے کے لیے جمع کیا گیا تھا اسی روپیہ کو مسلمانوں کی مدد کے لیے ترکی بھیج دیا جائے۔ دلیل ملاحظہ کریں۔

"مسلمان اگر علی گڑھ یونیورسٹی پر اسلام کو ترجیح دیں اگر وہ یہ سمجھیں کہ اسلام کے دم سے علی گڑھ ہے مگر علی گڑھ سے اسلام کی زندگی نہیں ہے تو وہ اس وقت حفظ کلمۂ اسلام کے لیے بغیر کسی مشکل میں پڑے تیس لاکھ روپیہ کی شاندار مالی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔"[۲]

قائدین یونیورسٹی سے مولانا مخاطب ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے دلوں کا حال مولانا کے اوپر بالکل واضح تھا۔ البتہ عام مسلمانوں سے ان رہنماؤں کے خلاف اپیل فرمائی۔

۱؎ الہلال ۶ دسمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۶

۲؎ الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۸

"میں ان لوگوں کے دلوں کی حالت جاننے کے لیے عام نظروں سے بہتر فراست رکھتا ہوں جو آج مسلمانِ ہند کی مسندِ رہنمائی و ریاست پر متمکن ہیں بس ان سے میرا خطاب نہیں اور نہ تخاطب سے کوئی نتیجہ حاصل، البتہ عام مسلمانوں سے التجا کرتا ہوں کہ اس وقت ہماری تیرہ سو برس کی عزت جو ڈوبنے کے قریب تھی ڈوب رہی ہے وقت تجویزوں اور دعوتوں کا نہیں ہے۔ اولین کام روپیہ کی اعانت ہے اور تیس لاکھ روپیہ آپ کے پاس فراہم شدہ ہے پس یہ کیا بے غیرتی اور کیسی دل و روح کی موت ہے کہ زخمی ترکوں کی زبان سے العطش! العطش کی چیخیں آرہی ہیں آپ کے پاس پانی کا ایک لبریز حوض موجود ہے مگر ان تشنہ کاموں کے پاس ایک قطرہ بھی نصیب نہیں۔"

اللہ اور ملائکہ کی لعنت ہو یونیورسٹی پر

اس کمزور دلیل کو بنیاد بنا کر مولانا نے یونیورسٹی پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی لعنت بھیجی۔ ایک معمولی ذہن رکھنے والا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ تیس لاکھ روپیہ سے کسی جنگ کے نقشہ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ مولانا اس بات سے واقف نہ ہوں مگر مولانا کو تو بہر صورت یونیورسٹی بننے کی مخالفت کرنی تھی لہٰذا کی، اور خوب جم کر کی۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا کو یونیورسٹی کی افادیت کا علم ہی نہیں تھا۔

"کمبخت یونیورسٹی مسلمانوں کے کیا کام آئے گی جب آج طرابلس اور قرق قلعہ کے میدانوں کے زخمیوں کو اسکے فنڈ سے مرہم کی ایک پٹی بھی نصیب نہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ میرے مطلب کے اظہار کے لیے کافی نہیں مجھ کو کہنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ کی لعنت ہو اس یونیورسٹی پر جس کا تیس لاکھ روپیہ ہندوستان کے بنکوں میں جمع ہو اور مسلمان زخمیوں کی صفیں میدانِ قتال کی برف باری میں ایڑیاں رگڑ رہی ہوں۔"

مولانا یونیورسٹی کو طوقِ لعنت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو للکارا کہ انہیں سب سے پہلے اسلام عزیز ہونا چاہیے اور اسلام و مسلم یونیورسٹی دونوں میں سے کوئی ایک چیز پسند کرنی چاہیے۔ یہ تجویز بھی انہیں منظور نہ تھی کہ ترکوں کے لیے الگ سے جمع کر لیا جائے کہ علی گڑھ کے لیڈران محمد علی جوہر وغیرہ حضرات نے الگ سے چندے کی اپیل

ایضاً

کی تھی۔ مولانا اس اپیل کے بھی خلاف تھے اور بضد تھے کہ یہی روپیہ ترکی بھیجنا چاہیے تاکہ یونیورسٹی کا پروگرام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

"لیڈران قوم کو یونیورسٹی عزیز ہے گو وہ غلامی اور استبداد کا ایک نیا طوقِ لعنت ہو لیکن اے اخوانِ ملت! ہم مومن ہیں اور ہم کو ہر شے سے پہلے اسلام عزیز ہونا چاہیے پھر جب نماز اور حج سے بھی بڑھ کر ہمارا فرض ترکوں کی مدد ہے تو ہم یونیورسٹی کی کیا حقیقت سمجھتے ہیں؟ یہ کہنا کہ ایک نیک کام کے لیے دوسرے اچھے کام کو چھوڑ دینا ضروری نہیں اور مسلمان ترکوں کے لیے بھی روپیہ جمع کرلیں بالکل مغالطہ ہے کیونکہ آج مسلمانوں کے لیے اور نیک کام ہی کہاں باقی ہے۔"[1]

بڑے بڑے معزز مسلمانوں نے اپنی خاص جیبوں سے لاکھ لاکھ روپیہ تک یونیورسٹی فنڈ کے لیے دیا تھا۔ اس زمانے کا ایک لاکھ روپیہ آج کے ایک کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ان مخلصینِ قوم کو مولانا نے خوب خوب گالیاں دیں ان کو منحوس کہا اور کہا کہ یہ لوگ شیطان کے راستہ میں خرچ کرنے والے ہیں یعنی یونیورسٹی کے لیے خرچ کرنا شیطان کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

"رہی یہ بات کہ جن بڑے بڑے رئیسوں نے ایک ایک لاکھ روپیہ دیا ہے وہ اسے گوارہ نہ کریں گے تو جو لوگ اس خیال کے ہوں وہ فوراً اپنا اپنا روپیہ واپس لے کر ہماری راہ سے ہٹ جائیں اور اپنی شوکت کی نجاست سے تمام مسلمانوں کی اسلام پرستی کے تقدس کو ملوث نہ کریں خدا اپنے کلمۂ توحید کی حفاظت کے لیے منافقوں کی اعانت کا محتاج نہیں ہے جن لوگوں کی دولت انفاق فی سبیل الشیطان کے لیے ہے ان کو انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق کب مل سکتی ہے۔"[2]

مسلم یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم

معمولی تعلیم یافتہ انسان بھی نصابِ تعلیم کے معنی بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپریل ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک نظم مسلم یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم کے عنوان سے شائع کی عنوان پر غور کریں اور اشعار ملاحظہ کریں۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

(نظم)

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں
کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے

ہماری مجلسِ قومی کے جب اجلاس ہوتے ہیں
تو اخلاقی قوائد میں بھی کچھ ترمیم ہوتی ہے

ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں
اشاروں میں ادھر فردِ عمل تقسیم ہوتی ہے

طلسمِ چشم و ابرو کے جو اسرارِ نہانی ہیں
تو آموزوں کو ان کی دم بدم تعلیم ہوتی ہے

بٹھائے جاتے ہیں کالج کے لڑکے صدر و بائیں میں
سکھائی جاتی ہے جو کچھ نئی اسکیم ہوتی ہے

یہاں تک تو خدا کے فضل سے ہم نے ترقی کی
اب آگے دیکھئے اس فن میں کیا ترمیم ہوتی ہے[1]

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا جواب

مولانا آزاد کو مسلم یونیورسٹی تحریک سے اتنی شدید نفرت تھی کہ اس کے لیڈروں کے خلاف لکھنے میں شرافت تک کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے اور قطعاً خیال نہ کرتے کہ کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک مضمون میں راجہ صاحب محمود آباد پر بے بنیاد الزام تراشیاں کیں جس کا جواب صاحبزادہ آفتاب احمد نے دیا یہ جواب بھی الہلال میں شائع ہوا۔ مولانا نے خیال ظاہر کیا تھا کہ روپیہ جو یونیورسٹی لی جا رہی ہے وہ اس روپیہ کی قیمت کی ہے بھی یا نہیں؟ یعنی یہ بھی گویا کسی زمین یا باغ کا سودا تھا یا تجارت ہو رہی تھی۔

"یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ نہ ہونے سے کسی کام کا ہونا بہر حال بہتر ہے۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ایک

---

[1] الہلال اپریل ۱۹۱۳ء ص۱۳۶

کروڑ روپیے جو تاج خریدی جا رہی ہے وہ اس قیمت کی ہے بھی کہ نہیں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو مخصوص ممبران روپیہ دینے والوں کی نیابت کا دعویٰ کر کے شملہ جاتے رہے ہیں انھوں نے اپنا فرض پورا کیا کہ نہیں"[1]

مولانا راجہ صاحب محمود آباد کو بد دیانت سمجھتے تھے انکا خیال تھا کہ آزاد و خود مختار یونیورسٹی گورنمنٹ نہیں دے سکتی۔

"سب سے پہلے قوم کو راجہ صاحب سے پوچھنا چاہئے کہ شکوہ شکایت کا ہنگامہ ہوتا رہے گا۔ خود اپنی نسبت تو یقین دلائیں کہ تیس لاکھ روپیہ دینے والوں کی نیابت کہاں تک انھوں نے دیانت و صداقت سے انجام دی ہے۔ یونیورسٹی کے متعلق بھی اپنی عادت کے مطابق ان لیڈروں نے یہی سمجھا تھا کہ قوم نے نہ کبھی پوچھا ہے اور نہ کبھی پوچھے گی۔ روپیہ لیتے جائیں اور وقت ٹالتے جائیں۔ بند کمروں میں بیٹھ کر جو کچھ کرنا ہے کر لیں گے .... بار بار پوچھا گیا کہ آخر یونیورسٹی ہے کیا شے؟ .... گورنمنٹ کیوں کر ایک آزاد یونیورسٹی کا چارٹر دے سکتی ہے مگر یونیورسٹی بھی (استواء علی العرش) کا مسئلہ تھی کہ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ اس کی حقیقت مجہول ہے مگر اس پر اعتقاد واجب ہے اور اس کی نسبت سوال بدعت ہے!"[2]

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مولانا کا مضمون پڑھا اور جواب دینا ضروری خیال کیا۔ انھوں نے لکھا کہ۔

"میں نے اس وقت آپ کے اخبار ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء میں مضمون پڑھا جو جناب نے مسلم یونیورسٹی پر تحریر فرمایا ہے۔ جس قدر آپ نے اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کی ..... البتہ آپ نے اپنے مضمون کے آخر میں جناب والا آنریبل راجہ علی محمد خاں صاحب پریسیڈنٹ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی نسبت خاص طور پر جو کچھ لکھا ہے چونکہ اس کا تعلق واقعات سے ہے اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو صحیح حالات ہیں وہ پبلک کو معلوم ہوں اور ایک ایسا شخص جو ہر طرح پر قوم کے شکریہ کا مستحق ہے اس کے متعلق قوم میں غلط فہمی نہ ہو ..."[3]

---

[1] الہلال ۷ اگست ۱۹۱۳ء ص۲ - [2] الہلال ۲۲ اگست ۱۹۱۳ء ص۱ - [3] ایضاً

اکثر انگریز حکام یونیورسٹی دینے کے خلاف تھے اور یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی بھی کوئی یونیورسٹی ہو مگر راجہ صاحب نے کمیٹی کے مطالبات کو پیش کرنے میں اس بات کا کچھ خیال نہ کیا کہ حکومت ان سے ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ صاحبزادہ آفتاب صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق ابتدا سے اس وقت تک گورنمنٹ کے ساتھ جو کارروائی ہوئی ہے اس کی نسبت مجھ کو ذاتی علم ہے اور اس کے لحاظ سے میں دعویٰ کے ساتھ اس بات کو کہہ سکتا ہوں کہ راجہ صاحب ممدوح نے کبھی کسی معاملے میں اس خیال سے کہ گورنمنٹ یا گورنمنٹ کا کوئی عہدیداران سے خوش ہو قومی مقاصد کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ جس جرأت اور بے باکی سے انھوں نے قومی مقاصد کی حفاظت کی ہے اس سے ہم سب کو ایک گونہ حیرت ہے کہ باوجود مسلمان تعلقدار ہونے کے انھوں نے ذاتی نفع نقصان کا کچھ خیال نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارے صوبے کے لیفٹننٹ گورنر مجوزہ یونیورسٹی کی تحریک کو پسند نہیں کرتے اور ہمارے صوبے کے انگریز عام طور پر اس کے موافق نہ تھے لیکن راجہ صاحب موصوف نے ان حالات کی کبھی پرواہ نہ کی ۔۔۔۔۔۔

میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا وہ معتبر ذریعہ کون سا ہے جس کی بنا پر آپ نے راجہ صاحب موصوف پر ایسا بے بنیاد الزام لگایا راجہ صاحب نے جو قومی خدمت کی ہے وہ قوم اور پبلک کے سامنے ہے نہ وہ کسی اعتراف کی محتاج ہے اور نہ بیجا نکتہ چینی سے اس کو کسی قسم کا اندیشہ ہے۔"[1]

---

[1] ایضاً

قصصِ اسرائیل

سامری اور سرسید

گذرے ہوئے صفحات میں اس کا ذکر ہو چکا کہ مولانا آزاد گمراہی کی تین منزلیں سمجھتے تھے پہلی وہابیت پھر نیچریت اور تیسری منزل الحاد قطعی کی۔ ان کے خیال میں سرسید کو یہی منزلیں پیش آئیں تھیں۔ مولانا نے الہلال کی ستمبر ۱۹۱۳ء (شمارہ ۳) کی اشاعت میں قصصِ بنی اسرائیل کے عنوان سے بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا ہے۔ اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا بلکہ بہت نیک کام تھا کہ مسلمانوں کو پرانی تاریخ سے روشناس کرایا جا رہا ہے لیکن یہ تو مولانا کی فطرت کے خلاف ہوتا کہ قرآن کی کوئی آیت یا حکایت بغیر کسی مطلب اور اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے محض علمی مقصد سے بیان کی جائے لہٰذا اس واقعہ سے کس طرح انھوں نے سرسید کی توہین کی ہے اس سے مولانا کے خاص رجحان اور فطرت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مضمون تو بہت لمبا ہے مختصراً ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ

> حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک حضرت اسماعیلؑ اور دوسرے حضرت اسحٰقؑ۔ اسماعیلؑ ملکِ عرب میں جا بسے اور اسحٰقؑ کنعان میں۔ حضرت اسحٰقؑ سے یعقوبؑ پیدا ہوئے جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سے ایک یوسفؑ تھے جن کو ان کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے مصر جا رہے ایک قافلے کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ آخر آخر حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی حکومت مصر میں قائم ہو گئی اور وہ وہاں ایک مدت تک عزت و وقار کی زندگی گذارتے رہے تا آنکہ فرعونِ مصر نے ان کی حکومت چھین لی اور ان کو ذلیل و خوار کیا۔

اسی تناظر میں مولانا ہندوستان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم بھی جس سرزمین میں گئے ایک مدت تک عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے تا آنکہ

فراعنۂ مصر نے ہم کو ہماری شہنشاہیوں سے معزول کیا۔۔ ہمارے عزت و جلال کے تخت کو الٹ دیا۔۔ بنی اسرائیل کا ایک فرعون تھا لیکن ہمارے سامنے فراعنۂ زمانہ کی ایک جماعت ہے[۱]

جب فراعنۂ مصر کے ظلم و ستم حد سے گذر گئے تو خدا نے موسیٰ کو پیدا کیا جنھوں نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور فراعنہ کو بحرِ احمر میں ڈبو دیا۔ عبورِ بحرِ احمر کے بعد بنی اسرائیل میں سامری پیدا ہوا۔

"جس نے بنی اسرائیل کو دینِ موسوی سے بیزار کیا۔ ان کی جماعتِ سیاسہ کو منتشر کر دیا۔ سونے چاندی کے زیوروں کو بزورِ سحر گائے کی صورت میں ڈھال کر خدا بنایا۔۔۔ مسلمانوں کے بھی ہر دورِ موسوی میں خود ان کی قوم سے سامری اٹھے جنھوں نے حق کے ابطال اور باطل کے احقاق کی کوشش کی ۔۔۔ خود اس ہندوستان میں بھی ایک سامری اٹھا جس نے اپنی جاہ و عزت کے جادو سے مسلمانوں کو عجیب و غریب کرتب دکھائے اس نے ملتِ بیضا کی تخمیر کی قلوب کو مذہب سے بیزار کیا۔ مسلمانوں کی جمعیتِ سیاسی کو منتشر کیا۔ اور خدا سے مغرور ہو کے اصنامِ حیوانیہ کے آگے نہیں بلکہ انسانی بتوں کے سامنے اپنا اور تمام قوم کا سر جھکا دیا اور اس خلیل کے فرزندوں کو بت پرستی کی دعوت دی جس نے کہا تھا۔ (تمہارا خدا وہ ہے جو آسمان و زمین کا خدا اور خالق ہے)[۲]"

یہ کون شخص تھا جس کے بارے میں مولانا فرما رہے ہیں کہ خود اس ہندوستان میں بھی ایک سامری اٹھا جس نے ملت کی تخمیر کی اور مسلمانوں کو انسانی بتوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیا۔ کیا مولانا سر سید کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ؟

"وہ خدا کی عجائب قدرت کا منکر تھا۔ لیکن انسانی خداؤں کی قدرت و استیلاء سے مرعوب تھا وہ گو ملکوت صفت انسانوں کے خوارق عادات اور دلائل معجزات کا قائل نہ تھا۔ لیکن وہ خود شیاطینِ انس کے "تمثلِ زیر لبی" کا معمول اور سحرِ خوش لفظی سے مسحور تھا۔ اس نے سونے چاندی کے سکوں کو تبدیل کیمیاوی کر کے ایک صنم خاکی بنایا جس سے صدائے باطل پرستی اٹھتی تھی اور پھر کہا۔ (دیکھو تمہارا اور موسیٰ کا خدا یہ ہے)[۳]"

---

[۱] الہلال ستمبر ۱۹۱۳ء ص ۲۴۱ [۲] ایضاً

یہی تو وہ الزامات ہیں جو سر سید پر لگائے گئے کہ وہ معجزات کے قائل نہ تھے اور وہ شیاطینِ الانس یعنی انگریزوں کی غلامی پر خوش تھے۔۔۔ سر سید نے ہی تو مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی بنائی جس کے تحت مسلمانوں کو بتایا گیا کہ علم حاصل کرو اور کانگریس کے نیشنل ازم کے دھوکے میں نہ آؤ کہ اس سے صرف ہندوؤں کا بھلا ہوگا۔ ۔ آگے بات اور صاف ہو جاتی ہے

"ان اسرائیلان زمانے کی نادانی کتنی عجیب اور ان کی ناحقیقت شناسی کتنی دردانگیز ہے جو ایک جبار و قاہر قوم کی سطوت و قہر سے خوفزدہ ہوئے ؛ اور پھر عجیب تر اور دردانگیز تر یہ کہ اس نے کہا "ہم اس ارضِ مقدس میں اس وقت داخل ہوں گے جب خود دشمن اس کو ہمارے لیے خالی کر دینگے" نادانوں غور کرو یہ قاہر و جابر قوم خود اس ارضِ مقدس میں کس طرح داخل ہوئی تھی اس کے دشمنوں نے شہر اس کے لیئے خود خالی کر دیا۔۔۔ اسرائیلی جو اپنے سینوں میں خوفزدہ قلوب رکھتے تھے اور قلوب میں قنوط و یاس کے سبب شرک و کفر کی سیاہی و ظلمت تھی ڈرے کہ "قومِ جبار" جو ان سے ظاہری ساز و سامان میں زیادہ ہے ان کو پامال نہ کردے"[1]

اسرائیلانِ زمانہ یعنی اس دور کے بھٹکے ہوئے مسلمان جو اپنے دلوں میں خوف رکھتے تھے اور خوف کی وجہ شرک اور کفر کی سیاہی ان کے قلوب پر چھائی تھی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے راضی نہیں کیونکہ انگریز ان سے ظاہری ساز و سامان میں زیادہ تھے اور ہمارے حضرت بغیر ساز و سامان کے انگریزوں سے لڑانا چاہتے تھے۔ آگے لکھا کہ !

"لیکن اے خدا جن پر چالیس سال تک تیرا غضب بھڑکا وہ اپنی سزا کو پہنچ چکے اور اب اپنی چہل سالہ گمراہی کے بعد تیری طرف جھکے ہیں اور اب وہ صداقت و حریت کے اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے ہیں تاکہ ارضِ مقدس کو جباروں کی نجاست سے پاک کر دیں"[2]۔

یہ چہل سالہ گمراہی کیا ہے؟ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں سر سید نے قائم کیا۔ یعنی مولانا کی تحریر کے وقت اس واقعہ کو تقریباً چالیس سال گذر چکے تھے۔۔ یہ اللہ کا غضب تھا جو مسلمانوں پر بھڑکا اور مسلمانوں پر تمام عذابِ خداوندی اسی چہل سالہ گمراہی کا نتیجہ تھا۔ نہ سر سید اور ان کے رفقاء نئی تعلیم کی طرف

---

[1] ایضاً - [2] ایضاً

مسلمانوں کو راغب کرتے اور نہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوتے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مولانا کی ایک اور تحریر ہے

انھوں نے فروری ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھا!

"اسلام دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ انسانوں سے ان تمام اقتدار کو چھین لے جن کے ذریعہ وہ تحکم اور جبر کے ساتھ غیر مسؤلانہ حکومت کرتے ہوں۔۔۔۔ اسلام اس کا دشمن ہے اور اس کو شرک فی الصفات قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک غیر مسؤل ہونا اللہ کی صفت ہے پس جو شخص اس صفت کو اللہ کے سوا کسی اور طاقت میں تسلیم کرتا ہے وہ خدا کی صفت میں دوسرے کو تسلیم کرتا ہے۔ پس یہ ایک شرکِ جلی تھا جو ایک بت پرستی کی صورت میں تمام پیروانِ توحید پر مسلط ہو گیا تھا ہر شخص جو علی گڑھ کو چندہ دینے کے لیے روپیہ رکھتا ہو ہر شخص جس کے پاس علم کی جگہ چاندی سونا ہو، ہر دولت مند جو کسی اجتماع کے موقع پر ایک پر تکلف ڈنر دے سکتا ہو ہر رئیس جس کے پاس سازشوں کے لیے بہت سی موثر کاریں ہوں۔۔۔۔ اس امر کا قدرتی حق رکھتا تھا کہ سات کروڑ انسانوں کا اپنے تئیں معبود و مسجود ظاہر کرے۔۔۔ ذکر اللہ حوالہ۔۔۔ وما یمکرون (ترجمہ) اور اس طرح ہم نے ہر انسانی آبادی میں بڑے بڑے لوگ پیدا کیے وہی ان میں بداعمال بھی تھے تاکہ ان آبادیوں میں مکر و فریب پھیلائیں حالانکہ وہ جس قدر مکر کرتے ہیں اپنے ہی ساتھ کرتے ہیں مگر وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں۔"

اب تو قرآن کی آیت بھی سر سید اور علی گڑھ کے سلسلے میں نازل ہو گئی کون ایسا بدعقیدہ مسلمان ہو گا جو مولانا کی بات پر یقین نہ کرے کہ ہر انسانی آبادی میں بڑے بڑے لوگ خدا نے پیدا کئے جو گمراہ تھے۔ یعنی وہ تمام لوگ جو علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کے لیے چندہ دیتے تھے اور جن کے پاس علم کے سوا ہر چیز تھی بداعمال تھے اور مسلمانوں کے تئیں اپنے آپ کو معبود ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ ایک کھلا شرک تھا جو ایک کھلی بت پرستی کی صورت میں تمام مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

مولانا اور گاندھی جی کا رام راجیہ

سر سید اور ان کے دوستوں کے لیے تو یہ فتویٰ مولانا نے دے دیا۔ اب ذرا ادھر بھی نگاہ ڈالیں کہ کھلے مشرک تھے اور کروڑوں بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے ان کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے۔ موہن داس کرم چند گاندھی

ٹ الہلال ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء ص ۱۳۵ ۔ ١٣٥ قرآن حکیم ۶/ ۱۲۴)

نے ہمیشہ ہی ہندوستان میں رام راجیہ کا خواب دیکھا اور وہ انتہائی کٹر قسم کے ہندو تھے حالانکہ بہت فراخ دل اور مسلمانوں سے میل جاتے تھے یعنی جو مسلمان رام راجیہ پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ آجائیں اور جو نہیں رکھتے انکو بھی کسی طرح اس میں شامل کیا جائے COLLINS & LAPPIERE نے FREEDOM AT MIDNIGHT میں لکھا ہے ۔

NO MAN WAS EVER MORE TOLERANT, MORE GENUINELY FREE OF ANY TAINT OF RELIGIOUS PREJUDICE THAN GANDHI. HE DESPERATELY WANTED TO ASSOCIATE THE MUSLIMS WITH EVERY PHASE OF HIS MOVEMENT. BUT HE WAS A HINDU, AND A DEEP BELIEF IN GOD WAS THE VERY ESSENCE OF HIS BEING. INEVITABLY, UNINTENTIONALLY GANDHI'S CONGRESS PARTY MOVEMENT BEGAN TO TAKE ON A HINDU TONE AND COLOUR THAT AROUSED MUSLIM SUSPICIONS. (P. 27)

گاندھی جی کی چرخہ کاتنے کی مہم بہت مقبول ہوئی وہ خود روزانہ چرخہ کاتتے تھے تاکہ انگلینڈ سے آئے ہوئے کپڑے کا بائیکاٹ کر کے ہندوستانی خود اپنی بنائی ہوئی کھادی پہنیں اور اس طرح اقتصادی انقلاب برپا ہو۔ گاندھی جی چرخہ کاتتے وقت زور زور سے رام رام کا ورد کیا کرتے تھے ۔

THE MAHATAMA BEGAN TO MURMUR RAMA, RAMA, RAMA IN RHYTHM TO THE CLICK, CLICK OF THE SPINNING WHEEL (P.48).

جواہر لال نہرو اعتراف کرتے ہیں کہ گاندھی جی اپنی تقریروں میں اکثر رام راجیہ کا ذکر کیا کرتے تھے جو ان کو برا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ جواہر لال نہرو نے اپنی آپ بیتی میری کہانی میں مولانا مولویوں کا تذکرہ بڑے تحقیر آمیز انداز میں کیا ہے ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ رجعت پسند ہیں لیکن جب تک کہ تحریک صحیح راستہ پر ہے ان رجعت پسند لوگوں کی موجودگی سے کانگریس کی تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ کانگریس میں اس وقت مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ ہی تھے ۔ ان حضرات کے بارے میں جواہر لال نہرو

ا ص ۲۷ ع ص ۴۸

کی رائے پر حیرت ہوتی ہے

"بعض واقعات سے میں پریشان ہو جاتا تھا کہ سیاست میں مذہب کو اتنا دخل کیوں ہے مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی مولوی مولانا اور سوامی جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا مجھے ان کی تاریخ عمرانیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی ہر چیز کو مذہبی رنگ دے دینے سے روشن خیالی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کے بعض بعض جملے بھی مجھے گراں گذرتے تھے مثلاً وہ اس زریں دور کو جو پھر لوٹ کر آنے والا تھا اکثر رام راجیہ سے تعبیر کیا کرتے تھے لیکن میں بے بس تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتا تھا کہ گاندھی جی یہ الفاظ صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ لوگ انھیں جانتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن میں نے ان چیزوں کی زیادہ پرواہ نہیں کی مجھے خود اپنی مصروفیت تھی اور تحریک اس زور و شور سے بڑھ رہی تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے کا وقت ہی نہ تھا۔ ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں اس لیے جب تک ہم صحیح راستہ سے نہ بھٹکیں چند رجعت پسندوں کی موجودگی سے کیا حرج تھا۔"[۱]

سرسید جو ہمیشہ مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کی کوششوں میں لگے رہے ان کی مولانا آزاد نے ہمیشہ تحقیر کی اور کبھی عزت سے نام نہ لیا معدودے چند مواقع کے۔ ایک بار مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں بحیثیت مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے سرسید کے تعلیمی مشن کی تعریف کی لیکن مولانا گاندھی جی کے سیاسی نظریۂ رام راجیہ کے بے انتہا معتقد تھے اور ان کی عظمت سے مولانا کا دل لبریز تھا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں ان کی یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا۔

"جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت میرے دل میں قائم کردی اور جو دن گذرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی گیا۔"[۲]

۱۔ میری کہانی حصہ دوم ص۱۳۶ ۲۔ خطبات آزاد ص۳۶۹

مولانا گاندھی جی ہی کے معتقد نہ تھے بلکہ ہندو مذہب سے بھی متاثر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی نے ہندو دھرم کی ایک ایسی تعبیر دی ہے جو قومی اور جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہے اور اگر انسان کا دماغ اسے سمجھ لے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔ اسی تقریر میں فرمایا۔

"یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے وہ بے شک ہندو تھے لیکن انہوں نے ہندو مذہب و دماغ کی نئی تعبیر کی تھی اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا۔ اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں اور نہ دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔"

ایسا نہ تھا کہ مولانا مسلمان نہ تھے وہ بے شک مسلمان تھے لیکن انہوں نے اسلام کی ایسی تعبیر کی تھی جس میں اختلافی معاملات جن کا تعلق پرانی شریعتوں کی منسوخی سے تھا کوئی اہمیت نہ تھی لہذا مولانا آزاد کی تفسیر قرآن کا گاندھی جی نے گجراتی زبان میں ترجمہ کرایا تھا اور ساہیتہ اکیڈمی نے مولانا کی تفسیر طبع کی۔ مولانا اسلام کے انسانی مساوات کے نظریہ کو مذاہب کی مساوات اور وحدتِ ادیان تک لے جاتے تھے۔

۵؎ ایضاً

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس
پر
مولانا کی رائے

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارے میں مولانا آزاد کی رائے خاصے کی چیز ہے اور اس کا پڑھنا قاری کو حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ یہ کانفرنس کیا تھی اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور وہ کس طرح اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، یہ کہنا کہ مولانا ان تمام باتوں سے ناواقف تھے ہمارے خیال میں صحیح نہیں تو پھر اتنے غلط اور غیر فہمانہ انداز میں اس کے خلاف الہلال میں لکھنے کے کچھ اور معنی بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ بہر حال مولانا نے کیا کہا اس کو جاننے سے پہلے MEC کا مختصر تعارف بھی ضروری ہے۔ MEC سرسید نے ۱۸۸۶ء میں قائم کی چیا کہ ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے سرسید کی زندگی بھی ایک خاص وقفہ کے بعد ختم ہونے والی تھی لہٰذا مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی کوششیں ان کی موت کے بعد بھی جاری رہیں، سرسید نے MEC کی بنیاد ڈالی۔ اپنی زندگی کے آخری گیارہ سالوں میں انھوں نے اس قومی انجمن کو ایک بہترین فعال اور مسلمانوں کی محبوب ترین تعلیمی کانفرنس بنا دیا جس میں سینکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دردمندانِ ملت اور مسلمانوں کا تقریباً تمام ہی تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہو کر ملت کو درپیش تعلیمی اور دوسرے مسائل پر دانشمندانہ بحثیں اور اظہار خیال کیا کرتا تھا۔ بالاثر مسلمان جو اس وقت تک ایسے کسی اجتماع اور اظہارِ خیال کے نادر طریقہ سے ناواقف تھے دور دراز حصوں اور مختلف طبقوں سے جوق در جوق اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج منعقد ہوا اور اس کے مقاصد مندرجہ ذیل قرار دیے گئے۔

۱۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔

۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماء جا بجا طور پر خود تقویت دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کی جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے عمل میں لانے کی تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ مختلف جگہوں کے ممتاز آدمی جو خواہش ظاہر کریں ان کے شہر میں کانفرنس کا انعقاد ہو اور وہی لوگ تاریخیں طے کریں اور انتظامات وغیرہ کا ذمہ لیں اور وہاں کے مسلمانوں کے مدارس مکاتب صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزل کے حالات تحریر کر کے کانفرنسوں کے جلسوں میں بھیجتے رہیں۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس قومی مجلس سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزاروں سے تجاوز کر گئی نہ کسی بے ردنمائش کی غرض سے نہ کسی حاکم کے حکم سے نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں دور دراز سفر کی تکلیف آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنسوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس طرح ایک پراگندہ قوم کے اجزا میں اتحاد قائم ہوتا گیا۔ اور اس سے مسلمانوں میں بلند تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔ خصوصاً جس شہر میں اجلاس ہوتا تھا وہاں پر زیادہ اثر ہوتا تھا" کانفرنس ہی کی تحریک سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے مضامین اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جس سے اردو لٹریچر میں اضافہ ہوا جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' الجزیہ' مضمون 'کتب خانہ اسکندریہ' حقوق الذمیین' مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب' البوریحان بیرونی کی لائف ... مولانا نذیر احمد' نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ۔؎۱

اسی کانفرنس کی تحریک سے الٰہ آباد یونیورسٹی نے کانکس ہسٹری کو جس میں مسلمانوں کے لیے توہین آمیز مضامین تھے ہائی اسکول کے کورس سے خارج کیا گیا۔ اور جب اس بات کی تحریک کی گئی کہ فارسی زبان کی تدریس الٰہ آباد یونیورسٹی میں بند کی جائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ اس غلط تحریک کو رکوایا گیا۔ اس کے علاوہ کانفرنس ہی کی تجویز کے مطابق نواب وقار الملک نے گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے چنانچہ گورنمنٹ نے بعض شرائط پر اس کی اجازت بھی جگہ دے دی۔

اس کے علاوہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں سرسید نے کانگریس کے مطالبات پر ایک

۱؎ حیات جاوید ص۳۴۷

مدلل تقریر لکھنؤ میں ۱۸۸۷ء میں کی۔ یہ مسلمانوں کا سب سے پہلا سیاسی جلسۂ عام تھا جس میں ہندوستان میں جمہوری اداروں کی شروعات پر بحث کی گئی تھی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً سرسید نے کانفرنس کے پروگرام کے ساتھ ساتھ ہی اپنے سیاسی افکار سے ملت اسلامیہ ہند یہ کو سیاست کا پہلا سبق پڑھایا۔ سرسید کے انتقال کے بعد کانفرنس کے جلسوں کا اہتمام محسن الملک کرنے لگے۔ ملی خدمت اور قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ سرسید کے انتقال سے قوم میں بہت زور شور سے پیدا ہو گیا تھا۔ اسی کانفرنس کے جلسہ میں کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیے جانے کی تجویز پاس ہوئی اور مختلف جگہوں پر کانفرنس کے جلسوں کے ذریعہ ہی چندہ جمع کیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں کانفرنس کے جلسہ کے سلسلہ میں آئے مندوبین نے ہی میٹنگ کر کے تاریخ ہند کا سب سے اہم کارنامہ انجام دیا یعنی وقار الملک کی صدارت میں مسلمانوں کی مشہور سیاسی پارٹی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

کانفرنس سے نقصانات

ایسی سودمند اور قوم میں بالعموم ترقی اور تعلیم کا جوش دلانے والی جماعت کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے الہلال کی دسمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ یہ کانفرنس مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ کرنے کے لیے قائم کی گئی تاکہ مسلمان کانفرنس میں مشغول ہو جائیں اور کانگریس میں شرکت نہ کر سکیں۔

> "یہ مسلمانوں کا تمام ملک میں ایک ہی عظیم الشان مجمع ہے جو ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ ۔۔۔ میں اس وقت بالکل پسند نہ کروں گا کہ علی گڑھ کانفرنس کی تاسیس و تشکیل کی تاریخ کا تجسس کروں نہ میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ لوگوں کو یاد دلاؤں کہ سرسید مرحوم نے کانفرنس صرف اس خیال سے قائم کی تھی تاکہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں ایک ایسا مجمع کر دیا جائے جو انھیں تاریخوں میں منعقد ہو جن تاریخوں میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا جائے۔"[1]

کیسا عمدہ طریقہ سرسید نے مسلمانوں کے لیے کانگریس سے علیحدہ رہنے کا نکالا تھا کہ بس جب کانگریس کا جلسہ ہو اسی زمانے میں کانفرنس کا جلسہ کر دو مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں گے (یعنی طور سے ایسا طریقہ سرسید کے ذہن دور رس میں کبھی نہیں آسکتا تھا۔ کانفرنس کی کوئی عوامی ممبر شپ نہیں تھی اور نہ پورے سال اس میں شامل ہونے کی مہم چلائی جاتی تھی اس کے برخلاف

---

[1] الہلال دسمبر ۱۹۱۳ء

کانگریس ایک سیاسی جماعت تھی جو ہمہ وقت ممبرشپ بڑھانے اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے طریقے اختیار کرتی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھا اور اپنے زمانے میں کسی قابل ذکر مسلمان کو کانگریس میں نہ جانے دیا وہ طریقہ کار کیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ کانفرنس کے جلسے ہمیشہ اسی زمانے میں ہوتے تھے جب کانگریس کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا اور دوسرے کانفرنس کے عظیم مقاصد تھے۔ مولانا کی نظر میں کانفرنس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان کانگریس کی سیاست سے علیحدہ ہو گئے ان کے خیال میں کانفرنس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

"اگر آج یہ سوال کیا جائے کہ کانفرنس کے وجود سے قوم کو کس قدر فوائد حاصل ہوئے اور کس قدر نقصان تو میں اس کا جواب دینا پسند کروں گا کانفرنس سے ایک اشد نقصان تو یہ ہوا کہ اسکا وجود بھی منجملہ ان موانع کے تھا جن کے ذریعہ مسلمانوں کو سیاست کے درس و ذوق سے روکا جاتا تھا اور پالٹکس باغِ عدن کا شجر ممنوعہ بن گیا تھا کہ "لا تقربا ہٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین" (قرآن ۳۵ : ۲) درحقیقت اس سعی نے مسلمانوں کو اسقدر نقصان پہنچایا ہے کہ نہیں معلوم ہے کہ اس کی تلافی کبھی ہو بھی سکے گی یا نہیں"۔[۱]

کانفرنس کا مقصد مسلمانوں کو سیاست سے روکنا ہرگز نہ تھا ہاں دشمنوں کی سیاست میں شامل ہونے سے روکنا ضرور تھا اور جس شجر ممنوعہ کے سائے میں مولانا نے ترقی کی۔

اسی مضمون کے آخر میں محسن الملک مرحوم کے بارے میں فرمایا کہ جب بھی وہ تقریر کرتے تھے مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی کا رونا لیکر بیٹھ جاتے تھے۔ مولانا ان کو سننے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ لحاف اوڑھ کر سولیا جائے۔ مولانا کو مسلمانوں کی ترقی اور تعلیمی پروگراموں سے کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ ان کی نظر میں تو دو ہی چیزیں قوموں اور جماعتوں کے لیے اپنے اندر کشش رکھتی تھیں، مذہب یا سیاست یہاں دونوں میں سے ایک بھی شئے نہیں صرف ایک مسئلہ تعلیم لوگ کہاں تک سنیں؟

"خدا بخشے نواب محسن الملک مرحوم اپنے آخری زمانے میں جب کبھی لیکچر دیا کرتے تھے تو اس قدر مجھے تکلیف ہوتی تھی کہ اٹھ کر اپنی قیام گاہ میں چلا آتا اور لحاف اوڑھکر سو رہتا تھا کہ یہ اس سے ہزار درجہ

---

[۱] ایضاً

بہتر اور پر تکلف ولذت بخش ہے ۔۔۔۔ وہ جب کبھی کھڑے ہوئے تو تعلیم کے متعلق تقریر کرتے یا مسلمانوں کے تنزل و بربادی کا افسانہ چھیڑ دیتے ۔۔۔۔ جس وقت سے لیگ قائم ہوئی ہے کانفرنس اور زیادہ بے رونق ہو گئی اگر اب کانفرنس کے اجلاس لیگ کے ساتھ نہ ہوں تو جلسہ کا ویسا ہی حال ہو جیسا ۔۔۔"[1]

محسن احسان کرنے والے کو کہتے ہیں اور احسان وہ عمل ہے جو بغیر کسی بدلے کی توقع کے کیا جائے ہمارے اکابرینِ درسگاہ جنہوں نے لفظاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنا تن من دھن سب کچھ مسلمانوں میں تعلیم کو رائج کرنے اور انھیں تنزلی سے نکال کر باعزت بنانے میں لگا دیا۔ اور اپنی بے لوث خدمت کے باعث ہمارے لیے قابلِ افتخار بن گئے اور محسنِ قوم ہوئے۔ بانیٔ درس گاہ کے دستِ راست نواب سید مہدی جنھیں ہم ان کے اعزازی نام نواب محسن الملک سے عام طور پر جانتے ہیں سرسید کے انتقال کے بعد پہلے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ جب انھوں نے ادارہ کی ذمہ داری سنبھالی تو ایم اے او کالج میں ۳۴۳ طلبا زیرِ تعلیم تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو طلبا کی تعداد ۸۶۳ تک پہنچ گئی تھی جو صرف ان کی بے لوث لگن اور خدمت کا نتیجہ تھی۔ ان کو طلبا کالج سے بے پناہ محبت تھی۔

"اے میرے بچو اور میرے قومی بھائیو! میری زندگی اور موت تمہارے لیے ہے تم یقین مانو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوش آرام سے دلہن کے کونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہیگا "نم کنومۃ العروس" اور اگر خدانخواستہ تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی نہ ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔"[2]

ایسے نیک خیالات رکھنے والے انسان اور ایسی بے مثال قومی خدمت کرنے والے شخص کے بارے میں مولانا کس قدر بے دردی سے لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی تنزلی و بربادی کا افسانہ چھیڑ دیتے تھے۔ یقینی طور پر جس کو جس کام کی لگن تھی اس نے وہ کیا۔ محسن الملک محسنِ ملتِ اسلامیہ تھے سو تمام عمر خدمت میں گزار دی اور مولانا نے تمام زندگی ایسے ایسے سچے محسنوں کی تنقید میں بسر کی اور مسلمانوں کی نہیں بلکہ غیر قوموں کی خدمت میں زندگی صرف کی صرف خود ایسا کیا بلکہ پوری قوم کو اس کام میں لگانا چاہا۔

---

۱ ایضاً

۲ محسن الملک، ایم امین زبیری [illegible] ص ۴۳

مُردے کو زندہ کرنے کی کوشش

۱۹۱۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں ہونا طے پایا تھا۔ مولانا آزاد نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو لکھا کہ میں جلسہ میں شریک ہو کر "صراطِ مستقیم" کے موضوع پر تقریر کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ اس کا مقصد انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ کانفرنس جو مسلمانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا دعویٰ کرتی ہے آیا اس میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لیے اجازت ہے کہ نہیں۔ مولانا مسلمانوں کو اسلام کی دعوت کانفرنس کے جلسہ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سمجھ گئے کہ مولانا کیا چال چلنا چاہتے ہیں۔ کانفرنس کی مخالفت کرنے کے لیے مولانا حسب معمول اسلام اور قرآن کا استعمال کرتے جیسا کہ اپنی تحریروں میں کیا کرتے تھے۔ گذشتہ سال ۱۹۱۵ء میں کانفرنس کا جلسہ راولپنڈی میں منعقد کیا گیا تھا تاکہ سرحد کے مسلمانوں میں بھی تعلیم کا رواج ہو کانفرنس کے آخری جلسہ میں مولانا کا نمبر آیا تو انھوں نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی مخالفت کرتے ہوئے کانفرنس کی تعلیمی تحریک کے متعلق خیال ظاہر کیا کہ یہ ایسی کوشش ہے جیسے کوئی مردے کو رنگ و روغن کے ذریعہ زندہ کرنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کو حسب دستور استعمال کیا ہوگا چنانچہ عوام و منتظمین جلسہ پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا وہ بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مولانا کو لکھا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کے وجود کا مقصد اور موضوع تعلیمی تحریک کی اشاعت ان اصولوں کے مطابق ہے جو سر سیدؒ نے قائم کئے اور جن پر علیگڑھ کی تحریک مبنی ہے۔ پس کانفرنس کے اسٹیج پر جو کچھ بھی تعلیمی تجاویز پیش ہوں اور ان کے متعلق جو کچھ تقریریں ہوں ان سب میں اصلی غرض کا ملحوظ رہنا ضروری ہے کانفرنس میں جو تعلیمی مسائل یا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق جو تجاویز پیش ہوں ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر ایک ممبر کو حق ہے۔
لیکن کانفرنس کے وجود کا جو مقصد و موضوع ہے اس پر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس قدر تمہید کے بعد اب میں آپ کو آپ کی وہ تقریر یاد دلاتا ہوں جو گذشتہ سال راولپنڈی کے اجلاسِ کانفرنس میں آپ نے فرمائی تھی اور جس میں

ے البلاغ، ۱۷ جنوری ۱۹۱۶ء ص ۱۲۵

آپ نے فرمایا تھا کہ کانفرنس کی تعلیمی تحریک ایسی ہے جیسے کہ کسی مردہ کو موم و روغن کے ذریعہ سے زندہ کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے مجھ کو بحث نہیں کہ آپ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ صحیح ہے یا کیا؟ ..... سالہا سال کی کوشش کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا کر کے راولپنڈی میں کانفرنس کا اجلاس اس غرض سے کیا گیا تھا کہ سرحد کے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہو اور شمال مغربی اضلاع میں جو اسلامی خطہ ہے اور جو جہل کی تاریکی کی وجہ سے نہایت پستی کی حالت میں ہے اس میں تعلیم کے ذریعہ سے بیداری کا سامان پیدا ہو چنانچہ حتی الامکان مختلف تحریکوں اور لیکچروں کے ذریعہ حاضرین کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ نے آخری اجلاس میں جو تقریر فرمائی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو اثر کانفرنس کے مقاصد کی تائید میں پیدا ہوا تھا وہ بہت کچھ زائل ہو گیا۔[1]

غرضیکہ مولانا کو جلسہ میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس خط کے جواب میں مولانا نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو خط میں لکھا کہ میں کسی بھی گوشہ میں خدا اور رسولؐ کا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔ اگر بقول ان کے وہ خدا اور رسولؐ کا ہی پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو کانفرنس کے اسٹیج کی کیا حاجت تھی۔ ان کے پاس تو بہت سے پلیٹ فارم تھے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم کے علاوہ الہلال و البلاغ تھے۔ مقصد خدا اور رسولؐ کا پیغام پہنچانا نہیں تھا بلکہ رسول اللہ کا نام نامی استعمال کر کے کانفرنس کے مقاصد کو نقصان پہنچانا تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے وہ جلسۂ راولپنڈی میں کر چکے تھے۔ اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی تعلیمی ترقیوں کی راہ میں روڑے اٹکانا تھا۔

"کانفرنس پنڈال آپ مجھ پر بند کر کے دیکھ لیں میں کسی اور گوشہ میں خدا اور اس کے رسولؐ کا پیغام مسلمانوں کو پہنچا سکتا ہوں۔ میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لیے بڑی اور عجیب و غریب دولت ہے جس سے محروم ہو کر لٹ جاؤں گا تو اس کی حماقت بہت افسوس ناک ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقریر روک کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو بسم اللہ اس کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کر چکے ہیں مجھے اللہ اور رسولؐ کی ان تعلیمات کو کہنا لکھنا مدون کرنا ہے جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً ص ۳۳ ۔ [2] البلاغ ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء ص ۱۲۵

اتحادِ اسلامی

خلافت تحریک اور مسلم یونیورسٹی

مولانا آزاد کا نظریہ پان اسلام ازم بہت عجیب و غریب تھا وہ اسلام کے رشتے سے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم تصور کرتے تھے لیکن اسی رشتہ سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم نہ تھے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے الگ سے تعلیمی کوششوں کو بھی وہ ناگواری کی نظر سے دیکھتے تھے کلکتہ میں "اتحادِ اسلامی" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی تحریک کو اتحاد بین المسلمین کے لیے نقصاندہ بتایا اور یونیورسٹی کے بننے نہ بننے کے مسئلہ کا موازنہ بقائے اسلام سے کیا:

"اے حضرات! یاد رکھیے آج اسلام کے لیے مسلمانوں کے لیے کوئی وطنی اور مقامی تحریک سودمند نہیں ہو سکتی ... ایک قوم جو ریگستان عرب سے دیوارِ چین تک آباد ہے اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کے تغیر سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے"[1]

یعنی چونکہ مسلمان عرب سے چین تک آباد ہیں لہٰذا کسی ایک جگہ کے ترقی کر لینے سے مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ بہت عجیب تر خیال ہے۔ تحریک جہاں بھی شروع ہو کوئی نہ کوئی مقام تو ہوگا ہی لہٰذا ہر تحریک مقامی کہلائی جا سکتی ہے۔ اسلام کی تحریک مکہ سے شروع ہوئی تو یہ تحریک بھی اس منطق سے مقامی کہلائی جا سکتی ہے۔ آگے فرمایا:

---

[1] (خطباتِ آزاد صـ۴۷)

"جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آ رہی ہیں خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زار ہند میں میرے عقیدے میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا عمل السحر ہے۔ جو اس لیے سلاتا ہے کہ سونے والوں کا اس کو اٹھنا پسند نہیں" (ایضاً)

یعنی یہ جو مقامی کوشش علی گڑھ میں مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب لانے کی ہو رہی ہے کاہنِ شیطان کا جادو ہے

مولانا کی نظر میں اسلامی اخوت اور پان اسلام ازم کا جذبہ مسلمانوں سے ختم ہو گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ مسلمان علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنا رہے تھے اگر اصلی اخوت اسلامی مسلمانوں میں باقی ہوتی تو مسلمان یونیورسٹی ہرگز نہ بناتے۔ مولانا کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات ہر وقت آتے رہتے تھے۔ اور جہاں جو دل میں آتا کہہ دیتے تھے معنی یا دلیل سے کوئی مطلب نہیں تھا صرف مقصد واضح تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی جائے فرمایا:

"ہم میں سچا پان اسلام ازم یا بالفاظ دیگر اصلی رشتہ اخوت دینی باقی نہیں رہا اور کیوں کر باقی رہے جب کہ ہندوستان میں ایسے عظیم الشان اشتغال ہمارے لیے موجود ہیں جو نفس اسلام کے بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے یہ مانا کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے جہاں خود اسلام کے بقا و فنا کا سوال در پیش ہے مگر اس کو کیا کیجیے کہ مسلم یونیورسٹی ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین کعبۂ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گذاری کی مرادِ آرزو اور ہمارے رہنمائے اول (یعنی سرسید) کی دی ہوئی شریعت تعلیم کا یوم تکمیل ہے" لے

لے (ایضاً صفحہ ۲۷)

آگے طنز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"جس دن یونیورسٹی بن جائیگی اس دن "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ.....

...... اِسْلَامَ دِیْناً" کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہوگی"

مولانا اسلام کی سیاسی طاقت کے قائم رہنے کا انحصار اس بات پر سمجھتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی نہ بنے۔ یا تو وہ اتنے ہی کم تر درجہ کی عقل کے انسان تھے کہ واقعی ان کا ایسا خیال تھا یا پھر انتہائی درجہ کی کینہ پروری اور چالاکی تھی کہ انہوں نے بھرے جلسہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا:

"اے عزیزان ملت! سوال قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں ہے بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے فرض کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے مکمل کر لیے اور ان کا ہر فرد تعلیم اور دولت کا ایک مرتب طلائی بت بن گیا۔ لیکن اگر سرے سے خود اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری چل گئی تو پھر علی گڑھ میں یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ سونے اور چاندی کی بہشت شداد ہی بن جائے مگر اس کے حور و غلمان کسی کا ترانہ گائیں گے"۔ (ایضاً)

معمولی تعلیم یافتہ انسان بھی اس دلیل کی بے وزنی اور خیال کی گمراہی کو بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے کہ اگر یونیورسٹی نہ بنائی جائے تو اسلام کی سیاسی طاقت محفوظ رہے گی۔ پھر ایک یونیورسٹی اور بہشت شداد کا کیا تقابل۔ ہمارا ذہن و دماغ ان میں کسی طرح کی مماثلت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ایک عیش و جسمانی راحت اور سکون کی جگہ دوسری دماغ سوزی اور فطرت کے اسرار و رموز معلوم کرنے کا مرکزِ تعلیم۔ ایسا لگتا ہے جیسے مولانا یونیورسٹی کے معنی سے ہی ناواقف تھے یا جان بوجھ کر ملت مسلمہ کو خلافت بچانے کا حیلہ کر کے ایک اہم تعمیری کام سے روکنا چاہتے تھے جو بفضل تعالیٰ پورا ہو کر رہا ملّت اسلامیہ کے مجموعی ارادے مال و اسباب اور مخلص بزرگوں کی روز و شب کی محنت کا ثمرہ آج قوم کے سامنے زندہ و تابندہ ہے دنیائے اسلام میں جتنی بھی یونیورسٹیاں ہیں سب کی سب حکومتوں کی سرپرستی

اور حکمرانوں کے حکم سے قائم ہوئیں لیکن یہ شرف علی گڑھ کو ہی حاصل ہے کہ ملت اسلامیہ کے پیسہ اور محنت سے اس کا وجود عمل میں آیا۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اور جو طلباء وہاں سے نکلیں ان کی تعلیم کا انتظام نئے مدارس قائم کر کے کیا جائے اسی طرح کا ایک مدرسہ مولانا آزاد نے جامع مسجد کلکتہ میں اپنی نگرانی میں جاری کیا تھا اس میں بیشتر طلباء مدرسہ عالیہ کلکتہ کے تھے جو مولانا آزاد کی ترغیب پر وہاں سے نکل آئے تھے۔ اس مدرسہ کا افتتاح گاندھی جی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو کیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک پر جو طلبہ اپنی تعلیم اور کیریئر کو چھوڑ کر سیاسی ایجیٹیشن میں شامل ہو گئے تھے ان کے بارے میں مولانا آزاد یہ کہتے تھے کہ انہوں نے احکام الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے تعلیم چھوڑ دی یعنی یہ حکم الٰہی تھا کہ طلباء تعلیم چھوڑ دیں۔ حکم الٰہی کی بھی خوب ہے اور مولانا آزاد کو ذرا بھی شک نہیں تھا کہ یہ طلباء احکام الٰہی کی پابندی کر رہے ہیں اور انہوں نے دنیا پر دین کو ترجیح دی ہے:

"یہ وہ جماعت ہے جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے جس نے مدرسہ عالیہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالیشان ہوسٹل کو محض حکم الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا۔ اور اس طرح وہاں سے نکلے ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جاری ہے کہاں رہے گی۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہے اور جاڑے کی طویل راتیں زمین پر گذاری ہیں۔" ؎

علی گڑھ میں اس تحریک کا کچھ ایسا زور نہ تھا اس لیے مولانا نے علی گڑھ کے طلباء کی ملامت کی:

"علی گڑھ کے کسی طالب علم نے کالج نہیں چھوڑا جب تک دو دو گھنٹے مجھ سے ردوکد کر کے اطمینان نہیں کر لیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے بعد بھی وہ

؎ (خطبات آزاد صفحہ ۳۸)

روپیہ کما سکیں گے۔ لیکن ان طلبار (مدرسہ عالیہ کے طلبار) میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو بلکہ جس وقت ان کو احکام شرع بتا دیئے گئے فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا"۔[1]

"شریعت اور خدا و رسول کے الفاظ استعمال کئے بغیر مولانا کوئی بات نہیں کہتے تھے یہاں بھی شریعت کا حوالہ دیا کہ یہ مولانا کی نظر میں شریعت کا حکم تھا کہ تعلیم چھوڑ دو۔ یہ کہنا کہ ہماری سیاسی جماعت کا حکم ہے یا انگریزوں سے لڑنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے ایک دوسری بات ہوئی لیکن شریعت کا حوالہ دینا یقینی طور سے صریح بے ایمانی ہوئی۔ مولانا کی نظر میں موڈرن کالجوں میں دی جانے والی تعلیم علم کے حقیقی مقصد کو ختم کر دیتی ہے اور طلبار محض پیسے کمانے اور چاول گیہوں پانے کے طلب گار ہو جاتے ہیں اور قدیم عربی مدارس میں پڑھنے والے طلبار ہی دراصل علم دوست ہیں:

"ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ...... یہ بڑی بڑی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی تو آبادیاں ہیں کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ عشاقانِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے۔ علم کی اس عام توہین و تذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی ہے یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدرسوں میں حاصل کر رہی ہیں" (ایضاً)

علم بہر حال علم ہے چاہے کہیں حاصل کیا جائے۔ لیکن مولانا کا یہ فتویٰ کہ صرف عربی مدارس میں ہی پڑھنے والے طلبار حقیقی معنوں میں طالب علم ہیں باقی نہیں شاید صحیح نہیں ہے۔

---

[1] (خطبات آزاد صفحہ ۳۸)

تعلیم چھوڑ کر چلے آنے والے طلبار کی تعریف کرتے ہوئے ایک بار پھر کہا:

"یہ طبقہ جذبۂ علم پرستی اور رضائے الہٰی کے سوا اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اور اس لیے ہندوستان بھر میں علم کو علم کے لیے پڑھنے والی اگر کوئی جماعت ہے تو وہ عربی مدارس کی ہی جماعت ہو سکتی ہے" (ایضاً)

علم کے حوالے سے بھی یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلبار کی مخالفت کر ڈالی کہ یہی گوشہ باقی رہ گیا تھا۔ مدرسۂ عالیہ کے طلبار نے چونکہ مولانا کے کہنے پر خلافت کی حمایت میں تعلیم چھوڑ دی تھی اس لیے ان کو بہلانے کے لیے ایسا کیا جا رہا تھا۔ مولانا نے ہر پہلو اور ہر طریقہ سے یونیورسٹی بننے کی مخالفت کی اور یہ سب وہ بنگالی ہندو کانگریسیوں کی شہہ پر کر رہے تھے۔ الہلال و البلاغ کلکتہ سے کانگریسیوں کی سرپرستی میں نکلتے رہے۔ تحریک خلافت سے بھی مولانا نے یونیورسٹی بننے کی مخالفت کا کام لینا چاہا۔ دراصل مولانا خلافت عثمانیہ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے اور گاندھی جی کے نزدیک یہ تحریک ہندوستان کے نیشنلزم کو بڑھاوا دینے کا بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی اور بارہا مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ خلافت کی پہلی منزل ہندوستان کی آزادی ہے چنانچہ ان کے خطبات جو خلافت کے پلیٹ فارم سے انہوں نے دیئے ان سب میں یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کانگریس کے نیشنلزم میں شامل ہو کر جنگ آزادی لڑنی چاہیے۔ ہندوؤں نے بھی تحریک خلافت کا ساتھ اسی نظریہ کے تحت دیا کہ اس سے انڈین نیشنلزم مضبوط ہوگا۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ترکی کی حکومت میں دلچسپی رکھنا اور دوسرے ممالک کے معاملات پہ نظر رکھنا ہندوستانی نیشنلزم کے مخالف نہ تھا اس لیے تعلیم یافتہ ہندو ان نظریات کو پسند کرتے تھے۔

THE INDIAN MUSLIMS SOUGHT TO DRIVE SOME PSYCHOLOGICAL SATISFACTION FROM A CONTEMPLATION OF ISLAM'S PAST GREATNESS CHIEFLY IN OTHER COUNTRIES AND IN THE FACT OF CONTINUANCE OF TURKEY

AS AN INDEPENDENT MUSLIM POWER, PRACTICALLY THE ONLY ONE LEFT. THIS FEELING WAS NOT OPPOSED TO OR IN CONFLICT WITH INDIAN NATIONALISM. INDEED MANY HINDUS ADMIRED AND WERE WELL ACQUAINTED WITH ISLAMIC HISTORY. (DISCOVERY OF INDIA, P.346)

خلافت تحریک دراصل ہندی مسلمانوں کے احساس کمتری کی پیداوار تھی کیونکہ پورے مغل مسلم دور میں کسی بھی بادشاہ نے ترکی کی خلافت کو نہیں مانا. جب ہندوستان سے مسلم حکمرانی ختم ہونے لگی اور مسلمانوں میں محکومی کا احساس جاگنے لگا تو انہوں نے اس خیال میں پناہ ڈھونڈ لی کہ دنیا میں ہماری حکومتیں بھی ہیں اور ان میں ترکی کی خلافت سب سے اہم تھی لہٰذا ہند میں مسلم حکومتوں کے انہدام کے بعد ہی مسجدوں میں خطبۂ جمعہ میں ترکی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا.

یہ طریقہ ۱۸۵۷ء کے بعد اور بھی زیادہ رائج ہو گیا اور ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے آپ کو خلافت سے جوڑ کر نفسیاتی حفاظت کا احساس پیدا کر لیا. سرسید کی زندگی میں جب ترکی اور روس کی جنگ میں خلافت کو خطرہ پیدا ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی ہند کی حکومت پر زور ڈالا کہ وہ ترکی کا ساتھ دے. سرسید نے اس وقت بھی کسی باہری حکومت کے لیے ملک میں تحریک چلائے جانے کی مخالفت کی تھی. کسی باہری حکومت سے وابستگی کے کیا معنی تھے اگر مسلم حکومت ہوتی یا مسلمان آزاد ہوتے تو وابستگی کچھ معنی بھی رکھتی. جب ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے ان کو نہ مانا اور اس وقت مسلمانوں نے کچھ احتجاج نہ کیا تو غلام ہندوستان کے غلام مسلمان ان سے کس طرح کی وابستگی رکھ سکتے تھے لیکن کچھ جذباتی لوگوں نے تاریخ کو کلیتہً نظرانداز کر کے ہندوستان میں ایک زبردست تحریک خلافت کے قیام کی چلائی. اپنی حکومت تو ہزاروں میل سے آئے اجنبی تاجروں کو گنوا بیٹھے اور ہزاروں میل دور واقع ملک میں ہونے والے واقعات پر ہندوستان میں تحریک چلا کر اثرانداز ہونا چاہتے تھے. لہٰذا تاریخ نے بہت جلد فیصلہ بھی سنا دیا اور

صرف دس گیارہ سال کے عرصہ میں نہ خلافت رہی اور نہ خلافت تحریک اور نہ اس کے قائدین اگر فائدہ کسی کا ہوا تو کانگریس کا کہ وفادار جماعت باغی جماعت بن کر ابھرائی بہت سے خلافت قائدین کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا جن میں علی برادران خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنے علی گڑھ سے تعلق کی بنیاد پر پوری یونیورسیٹی کو اس بے فائدہ اور نقصان دہ تحریک میں شامل کر دینا چاہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے علی برادران نے سرسید کے اس مشورہ کے خلاف عمل کیا تھا کہ مسلمان خلافت ترکی میں کسی طرح کی دلچسپی نہ لیں کہ ان کی نظر میں خلافت کا دور صرف پہلے چار خلیفہ تک رہا تھا بعد کو خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تھی اور مسلم بادشاہوں نے خلیفہ کا نام اختیار کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ شروع کے چار خلفاء تک محدود ہے اس کے علاوہ جتنے بھی بادشاہوں نے خلافت کا نام اختیار کیا خلیفہ نہیں کہلائے جا سکتے۔ شروع کے خلفاء کے بعد یہ منصب غلط اور ناواجب طریقے سے اپنایا گیا اسی لیے سرسید خلافت کی موجودگی سے ہی انکار کرتے تھے۔

جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

SIR SYED HAD OPPOSED THIS AND WRITTEN AGAINST INDIANS INTERESTING THEMSELVES IN TURKEY AND THE SULTANATE. (DISCOVERY OF INDIA. P. 349)

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ وہ تعلیم اور دوسری اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ خلافت تحریک سے بہت سے علی گڑھ مخالفین لیڈروں نے جس میں مولانا آزاد بھی شامل تھے فائدہ اٹھانا چاہا اور مسلم یونیورسیٹی بننے کی مخالفت کی۔

علی برادران اس تحریک میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے شامل تھے لہٰذا جیسے ہی انہیں حقیقت کا علم ہوا انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ کانگریس اور دوسرے قوم پرور لیڈروں کی مخالفت کی، مگر مولانا آزاد کو خلافت میں بالکل دلچسپی نہ تھی وہ تو اس تحریک کو کانگریس کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے اگرہ ۱۹۲۱ء

کی خلافت کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کے لیے اولین قیام گاہ تھا وہ میدان ہندوستان سے باہر کا نہ تھا۔ وہ عراق و شام ...... اور سمرنا کا میدان نہ تھا اور جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا تھا۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا عزم کا عمل کا میدان تھا اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دوں وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپ کے ملک کی فتح و شکست کا تھا .... آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے پہلے میدان کو استوار کرتے جب تک اسے فتح نہ کرتے دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔ تحریک خلافت کے لیے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا...... ہندوستان میں بسنے والی قوموں کا میدان تھا"[۱]

اسی خطبہ میں واضح طور سے فرمایا کہ:

"آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے عمل چاہتا ہے"[۲]

مولانا خلافت تحریک کے پلیٹ فارم کو ہندوستان کی آزادی کے لیے استعمال کر رہے تھے انہیں قطعاً بھی خلافت عثمانیہ سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ عثمانی خلیفہ کو غاصب سمجھتے تھے لیکن جب تک خلافت تحریک چلتی رہی مولانا نے ایک لفظ بھی اپنے اصلی نظریے کے بارے میں نہ کہا بلکہ مسلمانوں کو مریح دھوکے میں رکھا کہ گویا مولانا کو خلافت کے احیاء کی بہت زیادہ فکر ہے جگہ جگہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور کانفرنسیں بلاتے تھے لیکن اصلی خیالات کو بہت خوبی سے چھپائے رکھا۔ جب کمال اتاترک نے خلافت ختم کر دی تو مولانا کی بلی تھیلے سے باہر آگئی اور مولانا نے کمال اتاترک کو مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ ایک بار صحافیوں نے مولانا کو گھیرا اور پوچھا کہ کمال اتاترک کے اس عمل کے بارے میں آپ کیا

---

[۱] (خطباتِ آزاد صفحہ ۴۴) [۲] (ایضاً صفحہ ۵۸)

کہتے ہیں مولانا نے اپنے نظریہ کی وضاحت اپنے ایک مضمون میں کی جو لاہور کے مشہور اخبار زمیندار میں اپریل ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا اس مضمون میں مولانا نے کمال اتاترک کے عمل کی حمایت کی اور خاتمۂ خلافت کو ایک مستحسن فعل قرار دیا کہ خلافتِ عثمانیہ ان کے نزدیک اسلامی خلافت نہ تھی یہ نکتہ مولانا کو خلافت تحریک کی حمایت کرتے ہوئے نہ سوجھا اور پورے جوش سے خلافت کانفرنس میں شریک رہے جیسے ہی خلافت ختم ہوئی فرمایا:

"جس منصب خلافت کو انہوں نے (کمال اتاترک) نے موقوف کیا ہے وہ اسلامی خلافت نہ تھی یہ ایک خود ساختہ منصب تھا جو خود انہی نے غلطی سے قرار دیا تھا۔ جس دن اس حکومت نے اپنا صدر منتخب کیا اسی دن خلیفہ بھی منتخب ہو گیا کیونکہ خلیفہ اور رئیس حکومت دو الگ منصب نہیں ہیں ایک ہی منصب کے دو مختلف نام ہیں پس اگر انہوں نے اس خود ساختہ منصب کو موقوف کر دیا اور کہتے ہیں کہ حکومت کی موجودگی میں یہ ضروری ہے تو جہاں تک اسلامی نظام خلافت کا تعلق ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم نہ اس کے خواہشمند تھے نہ ہم نے اسے صحیح سمجھا تھا" [۱]

مولانا کمال اتاترک کو ہی خلیفہ مانتے تھے انکی نظر میں ایک صدر مملکت جیسا کہ کمال اتاترک تھے خلیفہ کا دوسرا نام تھا بلکہ امیر المومنین کا لقب بھی انہوں نے کمال اتاترک کو اپنی جانب سے بخش دیا تھا:

"آج بھی حکومت ترکیہ ایک رئیس وصدر کا منصب قرار دے چکی ہے یا نہیں؟ اگر قرار دے چکی ہے تو اسی منصب کا نام اسلام کی بول چال میں خلیفہ اور امیر المومنین ہے پھر یہ کیسی معیت ہے کہ ایک حقیقت کے اعتراف عمل سے تو انکار نہیں لیکن اس کے نام سے انکار ہے" [۲]

---

[۱] (غلام رسول مہر: تبرکات آزاد ص۲۱۱) [۲] (ایضاً ص ۲۱۳)

وعظِ یوسفی

مولانا کا مسلمانوں سے خطاب

مسلمان انسانیت کی پیشانی پر بدبختی کا داغ

وعظِ یوسفی کے عنوان سے مولانا نے ایک مضمون دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع کیا۔ اس عنوان کا پس منظر یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتانی آتی تھی۔ بادشاہِ مصر کے ایک خواب کی تعبیر انھوں نے بتائی تھی کہ سات سال بہت زیادہ اناج پیدا ہوگا اور سات سال سوکھا پڑیگا۔ لہٰذا یہی ہوا اور بادشاہ نے ان کے مشورہ پر عمل کرکے ملک کو تباہی سے بچالیا۔ مولانا بھی اس مضمون میں یوسف علیہ السلام کی طرح آئندہ کی باتیں بتارہے ہیں کہ اپنا درجہ ان سے کسی بھی طرح کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس مضمون سے مولانا کے مسلمانوں کے تئیں اصلی جذبات بالکل واضح ہوکر آگئے ہیں جن خطابات اور گندے لفظوں سے مولانا نے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے وہ ان کی مسلمانوں کے تئیں دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ مسلمان جنگِ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں ۱۹۱۳ء میں کسی آزادی کا کوئی تصور تک نہ تھا اور آزادی کا پہلا رزولوشن ۱۹۳۰ء میں پاس ہوا۔ اس سے پہلے جب حسرت موہانی نے ۱۹۲۱ء میں کامل آزادی کا رزولوشن کانگریس میں پاس کرانا چاہا تو گاندھی جی اور کانگریس نے اس تجویز کو ٹھکرادیا اور صرف چند اصلاحات کا مطالبہ کیا لیکن مولانا پھر بھی مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں روڑہ تصور کرتے رہے۔

"جو ہونے والا ہے اسے کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی یقیناً ایک دن آئیگا جب ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہوچکا ہوگا ... وہ سب کچھ ہوچکا ہوگا جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت ملکی ترقی کی تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائیگا" [۱]

ملہ الہلال ۱۸، دسمبر ۱۹۱۳ء ص۵

مولانا ہمیشہ ملک کی ترقی کی بات کرتے تھے ان کی زبان سے کبھی بھی مسلمانوں کی ترقی کا ذکر نہیں نکلا۔

"اس میں لکھا جائیگا کہ ایک بدبخت اور زبون طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا۔ ... ہندوستانی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی ہے۔"[1]

مولانا کے نزدیک مسلمان بدبخت، زبون طالع اور حاکمانہ طمع کا کھلونا تھے۔ مولانا کا واحد مقصد ملک کی ترقی تھا ملک کی ترقی کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ پیڑ پودوں اور جنگلوں وندیوں کی ترقی بلکہ اس میں بسنے والے انسانوں کی ترقی تھی جس طرح کی ترقی کی بات کانگریس کرتی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف ایک فرقہ ملک میں حکمراں ہو اور دوسرا فرقہ اس کا محکوم۔ مولانا اس راہ میں کانگریس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

"اس میں لکھا جائیگا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جسے کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا... جس میں کوئی انسانی ارادہ کوئی انسانی دماغ کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی... ایک وجود شل جو صرف زمین کے لیے بار ہو۔ ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو... اور سب سے آخر میں یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔"[2]

مولانا سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنایا ہے ہندی مسلمان مولانا کے نزدیک انسان ہی نہ تھے بلکہ جانور تھے جو نہ اپنی آواز سے بول سکتے تھے نہ سوچ سکتے تھے اور نہ عمل کر سکتے تھے اس طرح کی عمدہ اور دانشمندانہ باتیں ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا میں کسی لیڈر نے بھی نہ کی ہوں گی۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہنے والے کسی قدیم قبیلہ کے قائد نے بھی ایسے الفاظ اپنی قوم کے لیے استعمال نہ کئے ہوں گے اوپر سے قرآن کی آیت بھی دلیل میں پیش کر دی اب تو کسی قسم کا شک ہی باقی نہ رہا کہ مولانا پیغمبر رہے ہیں

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

ترجمہ:۔ "ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں کان ہیں مگر سنتے نہیں ان کی مثال چارپایوں کی سی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر، وہی ہیں جن کو غفلت کی سرشاری نے انسانیت سے محروم کر دیا ہے۔[1] (القرآن ۸۴ : ۲۸)

علماء دین یہ بتائیں گے کہ ملک کی ترقی کے لیے اور آزادی کے لیے کوشش نہ کرنے والوں کے لیے یہ آیت اتری ہے یا مولانا نے اپنی مرضی سے یہ سمجھا ہے اگر واقعی یہ آیت اسی مقصد سے اتری ہے تو بھی تمام مسلمان گنہگار قرار نہیں دیے جا سکتے کیونکہ مسلمان من حیثت القوم اپنے طریقہ سے آزادی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔

پھر اس میں لکھا جائیگا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ تم آہ کہ مسلم تھی ... اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی جو اوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجودِ زبون سے اس نے ہمیشہ روکا جو مسلم تھی پس چاہئیے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے ہوتیں کیونکہ اسلام اس کے پاس تھا۔[2]

مولانا مسلمانوں کا یہ فرض بتاتے تھے کہ وہ ہندوؤں کی نقل کرتے اور جو کچھ بھی ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے وہ کر رہے تھے مسلمان بھی ویسا ہی کرتے کیونکہ اسلام ان کے پاس تھا۔ مولانا کا اسلام ضرور یہ فرض عائد کر سکتا ہے مگر رسولؐ کا اسلام شاید ایسی تعلیم نہیں دیتا۔

اگر تم لکھو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی شرف و عظمت کا ایک باب ہو گا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھوں بے شک ایک باب ہو گا مگر جانتے ہو اس میں کیا ہو گا؟ اس میں لکھا ہو گا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں میں چھپ گئے ... ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا پر اس قوم نے جو ... نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔[3]

۱۔ ایضاً ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً

مولانا اگرانی ہی ضد کر رہے ہیں کہ ہندو ملک کی آزادی کے لیے جانیں قربان کر رہے تھے تو ہم مانے لیتے ہیں کہ ایسا ہی تھا اور مسلمان واقعی غاروں میں چھپ گئے تھے۔ مگر آخر مسلمان ان کا ساتھ کیوں دیتے کانگریس جسطرح کا نظام ملک میں لانا چاہتی تھی اس میں اکثریت کی حکومت اقلیت پر لازمی تھی جمہوریت میں ۵۱٪ کی ۴۹٪ پر حکومت ہوتی ہے یہاں تو ۲۰ اور ۸۰ کا فرق تھا۔ دانشمند قائدین نے یہی فیصلہ کیا کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں کیونکہ اس نظام میں جو کانگریس لانا چاہتی ہے مسلمان محکوم ہو جائیں گے

"ہندو اٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے وقف کر دیا لیکن عین اس وقت جب کہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔۔ جبکہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "وقت نہیں آیا" اور یہ اسی میں مسحور رہے"[۱]

کانگریس ۱۸۸۵ء میں بنی اس وقت تک ہندوؤں کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے پورے ۷۰ ستر سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا اور کئی بڑی بڑی یونیورسٹیاں انھوں نے قائم کر لی تھیں۔ ہندوؤں کے اسی پڑھے لکھے طبقہ نے کانگریس بنائی۔ اس وقت سرسید کا مدرسہ قائم ہوئے صرف دس سال ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں ابھی ایک بچہ بھی تعلیم پا کر نہ نکلا تھا کہ ہندوؤں نے سیاسی کاروائیاں شروع کر دیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاست میں آنا چاہیے تھا اور تعلیم تو ان کے نزدیک ایک ٹھنڈی لاش تھی۔ سرسید نے کہا تھا کہ مسلمان صرف تعلیم حاصل کریں، اپنی جماعت بنائیں اور کانگریس میں شریک نہ ہوں مولانا اس پالیسی کے سخت خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں اپنی جماعت نہ بنائیں اور کانگریس میں شامل ہوں۔

"اس کے بعد آنے والا مورخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا بس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفروشی سے ہوا جو مسلم نہ تھی پر جو مسلم تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی سربلندی کی

---

[۱] ایضاً۔

جگہ سجدہ منزلت کی کوشش کی ہندوستان کی ملکی نجات کی داستان یقیناً ایک عظمت اور عزت کی یادگار ہے۔ ۔ ۔ لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ ۔ ۔ اگر ملک کے قوانین میں ترمیم ہوئی۔ ۔ ۔ آخر یہ کہ ملک کو حکومتِ خود اختیاری ملی تو صرف ہندوؤں قابلِ عزت ہندوؤں مسلمانوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے۔[۱]

خیالات کی یہ بلندی قلم کی یہ روانی اور عقل و دانش کی یہ انتہا صرف مولانا کے یہاں پائی جاتی ہے واقعات کروں صرف مولانا ہی مسخ کر سکتے ہیں۔ زمانے نے یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں کی طرف مولانا اشارہ کر رہے ہیں انھیں حضرات نے ملک میں مسلمانوں کے تحفظات کی خاطر جانیں قربان کیں۔ سجدہ ضرور کیا لیکن مولانا اور ان کے ہمنواؤں نے پہلے دن جو کانگریس کی چوکھٹ پر پیشانی ٹیکی تو تمام زندگی نہ اٹھائی ہزاروں فسادات ہوئے اردو ختم کی گئی حیدرآباد میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، کھلے عام خون کی ہولی کھیلی گئی مگر مولانا نے سجدے سے سر نہ اٹھایا اور افسوس کہ دینی علمار کے ایک طبقہ کو بھی اپنے پیچھے مقتدی بنا کر کھڑا کر لیا۔ قابلِ عزت ہندو و قابلِ اقتدار بن گئے۔ مولانا آزاد ہمیشہ کانگریس کے پیچھے چلنے والے رہے کبھی قائد کا درجہ ان کو نہ مل سکا۔ ہاں ایک زمانہ میں جب ضرورت تھی ان کو صدر بھی بنائے رکھا گیا اور بعد میں وزیر تعلیم بنا یا گیا۔ مرکز کا وزیر تعلیم لچار خود مختار یونیورسٹیوں کا وزیر تعلیم۔ اور مولانا خوش رہے سجدہ طویل تھا بہت طویل ۱۹۱۸ء سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک۔

"ہندوؤں کی وجہ یہ ہے کیونکہ انھوں نے پالیٹکس کو شروع کیا مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے یہی سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں چاندی سونا نہیں لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے"[۲]

یہاں مولانا یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ کانگریس کی سیاست ہندوؤں نے شروع کی۔ اگر مسلمان اس سے الگ رہے تو کیا برا کیا۔ آزادی کے چالیس سالوں میں مسلمان کانگریس اور دوسری قوم پرور جماعتوں میں شریک ہوئے انھیں کیا ملا؟ پی اے سی کی بندوق کی گولی اور بے روزگاری۔

۱۔ ایضاً   ۲۔ ایضاً

"بے شک مدتوں بعد ہندو لوٹے جس کو کفر کہا تھا اس کو ثواب وطاعت کہنا پڑا۔۔۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام لیگ رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی ۔۔۔ نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو شاید ہی آج تک کسی قوم نے سیاست کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہو گی جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی! اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو تم نے کی۔ تمہارا وجود جبیں سیاست کی تحقیر اور تمہارے اعمال اس کی پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکا ہیں تم نے غلامی کا ایک بتکدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔"[۱]

ہندوؤں کے مطالبہ پر ۱۹۰۱ء میں اردو ہٹا کر ہندی رائج کیا جانا اس کے بعد تقسیم بنگال کی تنسیخ کرانا جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا کہ تقسیم بنگال حکومت نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ وہ عوامل تھے جس کی بنا پر تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مسلمانوں کی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا علی گڑھ سے کئی نسلیں تعلیم یافتہ ہو کر نکل چکی تھیں محسن الملک، وقار الملک، سر آغا خاں، جیسے آزمودہ قائدین موجود تھے لہٰذا فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کو من حیث القوم سیاست میں آنا چاہیے ورنہ یکے بعد دیگرے انگریز ہندوؤں کے تمام مطالبات مسلمانوں کے خلاف مانتے چلے جائیں گے۔ لہٰذا وقار الملک کی صدارت میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا آزاد ان عظیم الشان رہبرانِ قوم کو چاندی اور سونے کا پجاری کہہ رہے ہیں جنھوں نے تمام زندگی مسلمانوں کی خدمت میں وقف کر دی اور ایک ایک پیسہ بھیک مانگ کر مسلمانوں کے لیے یونیورسٹی قائم کی۔ ان کو نادان اور نہ جانے کیا کیا مولانا سمجھتے تھے۔

"ہندو مسلمان کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اندر بدبختی سے ناچنے والے نابرح ہے ہیں اور یہ خیال کہ "تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لیے تمہاری سیاست یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو" غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت

۱۔ ایضاً۔

کی چال تھی..... پس تم تھے کہ خدا تم کو آگے کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو پھر اپنے آپکو بھلا دیا۔"

ترجمہ: "اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے خدا کو بھلا دیا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول گئے۔ وہ یقیناً فاسقوں میں سے تھے۔" (القرآن حکیم ۵۹: ۱۹)[1]

بغیر تعلیم کے کوئی بھی ترقی ممکن نہیں ہے یہ بچہ بھی جانتا ہے۔ مولانا بھی بخوبی جانتے ہوں گے لیکن کیونکہ انہیں مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لہذا مولانا کا سیاست میں پہلا قدم ہی مسلم مفاد کے خلاف تھا کہ تقسیم بنگال کی مخالفت میں ہندوؤں کا ساتھ دینا مولانا کا پہلا سیاسی عمل تھا۔ مولانا کی ہر تحریر میں قرآن کی آیات کی بھرمار ہے۔ ایسا بے دریغ استعمال صرف وہی انسان کر سکتا ہے جسے خدا کا کچھ بھی خوف نہ ہو۔

ایسا نہ تھا کہ مولانا کے یہ خیالات بہت شروع کے ہیں بلکہ یہ نظریات ان کے تمام عمر رہے۔ لہذا ۱۹۴۸ء کی دہلی جامع مسجد کی مشہور تقریر میں اسی مضمون کا حوالہ دیا۔

"ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔۔" جو ہونے والا ہے اسے کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔"[2]

الہلال و البلاغ میں متعدد مضامین اس طرح کے ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا محض دیوانہ ہے۔ اتنے واہیات اور گھٹیا معیار کے مضامین اردو کے بدترین رسائل میں بھی نہیں پائے جاتے۔ لیکن مدح نگاران آزاد کی نظر میں الہلال و البلاغ "قرآنی آیات کی بازگشت ہیں" اور وہ "اپنی تحریروں میں قرآنی آیات کے ذریعہ مزید جلال و عظمت پیدا کر لیتے ہیں" ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قرآنی آیات ان کی ہر تحریر کا خاص حصہ ہوتی ہیں لیکن یہ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ آیات کس لیے استعمال کی جا رہی ہیں۔ جن احادیث یا آیات کو مولانا نے اپنے پراگندہ خیالات کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے وہ یقینی طور سے رسول اور خدا کی بے پایاں ناراضگی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ ملاحظہ کریں مندرجہ ذیل دو مضامین جو مولانا نے شائع کیے:۔

---

[1] القرآن حکیم (۵۹، ۱۹) [2] مرقع ملیا بادی: ابوالکلام آزاد صفحہ

تمہارا احساس فنا ہوگیا

مولانا آزاد مسلمانوں سے ہمیشہ بیزار رہے وہ یہ چاہتے تھے کہ پوری مسلم قوم ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلے جب ان کی توقعات پوری نہیں ہوتی تھیں تو مسلمانوں کو گمراہ، جاہل، اندھے اور نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے تھے۔

زبانی کہی گئی بات کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی لیکن مولانا آزاد نے البلاغ والہلال میں متعدد مضامین اس طرح کے لکھے ہیں جن میں پوری مسلم قوم کو مختلف خطابات سے نوازا گیا ہے۔ ملاحظہ کریں البلاغ کی مندرجہ ذیل تحریر فرمایا

"دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی نیند اگر موت کی نیند نہ ہو تو کبھی نہ کبھی ختم ضرور ہوتی ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ سونے والا کبھی نہ جاگے"[1]

یعنی مسلمانوں کی نیند موت کی طرح کی ہے۔ اس مضمون میں اپنی کاوشوں کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو جگانے کے لیے الہلال والبلاغ کے ذریعہ کیں حریت و آزادی کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنا چاہا ۔ ہر طرح کی تنبیہ و کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا؟

"پس تنبیہ و ہوشیاری کی تمام تدبیریں ہو چکیں پر افسوس کہ تمہاری آنکھیں اب تک بند ہیں تمہاری غفلت کا نشہ کسی طرح نہیں اترتا۔ تمہاری موت کی نیند کسی طرح نہیں ٹوٹتی ..... آہ تم غافل ہوگئے تم گمراہی کے قبضہ میں آگئے تمہارے احساس فنا ہو گئے. تمہارے دل کی دانائی مٹ دی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسا تھا کہ اندھے بینا ہو جاتے، لنگڑے چلنے لگتے، گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی.... آہ تمہاری غفلت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی۔ آہ تم ایسے نہ تھے پھر تم ان لوگوں کی طرح کیوں ہو گئے جن کے لیے خدا کا رسول ماتم کرتا تھا"[2]

خدا کا رسولؐ کن لوگوں کے لیے ماتم کرتا تھا؟ اس کا ذکر مولانا نے نہیں کیا۔ بغیر کسی عقلی دلیل و توجیح کے مولانا مسلمانوں کو غافل بتا رہے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر ذہنی گمراہی کی دلیلیں سیر رسولؐ و صحابہ سے پیش کرتے تھے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال ان کو نہ آتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں کیا لکھ رہا ہوں۔ ایک جنون تھا کہ مسلمان کسی طرح میرے پیچھے پیچھے چلنے لگیں اور چاہے وہ راستہ مکمل بربادی کا ہو مسلمان کچھ نہ سوچیں اس مقصد کے حصول کے لیے نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے تھے اور جب فرسٹریشن زیادہ بڑھتا تھا تو بقول غالب یہ کیفیت ہو جاتی

---

[1] البلاغ مارچ ۱۹۱۶ء ص ۳ [2] ایضاً

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

"آہ کوئی نہیں سب گمراہ ہو گئے۔ سب نکمے نکلے سب غافل ہو گئے سب پر موت کی نیند چھا گئی، سب نے ایک ہی طرح کی ہلاکت پی لی، سب نے خدا کو چھوڑا، سب نے اس کے عشق سے منہ موڑ لیا، سب نے اس کے رشتے کو بٹہ لگایا، سب نے عزیزوں کی چوکھٹ کی گرد چاٹی سب نے ایک ساتھ مل کر گندگیوں اور ناپاکیوں سے پیار کیا، سب نے عہد باندھا ہے کہ ہم ایک ہی وقت میں اللہ کی پکار سے بھاگیں گے، سب اس سے بھاگ گئے۔ سب نے غول در غول بن کر بیوفائی کی کوئی نہیں جو اس کے لیے روئے کوئی نہیں جو اس کے عشق میں نالہ کرے۔ اس کی محبت کی بستیاں اجڑ گئیں ۔۔۔ سب شیطان کے پیچھے دوڑے سب نے ابلیس کے ساتھ عاشقی کی اور سب نے بدکار عورتوں کی طرح اپنی آشنائی کے لیے اسے پکارا پھر اس پر قیامت یہ کہ کسی کو ندامت نہیں۔ آہ میں کیا کروں کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو"[1]

یہ تحریر ایک ۲۸ سال کا لڑکا لکھ رہا ہے یہ ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت امام الہند آزاد کی تحریر ہے۔ یہ الہلال والبلاغ جیسے عظیم الشان رسائل کی تحریر ہے یہ ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم رہنما کی تحریر ہے۔ جس کی تعریفوں میں اس زمانے کے بڑے بڑے عالمی شہرت یافتہ علماء رطب اللسان رہتے ہیں۔ یہ گمراہی کی آخری منزل ہے کہ سامنے کی بات ہوتے بھی دانشورانِ قوم مسلم کو ان الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے بلکہ اس کو آسمانی صحیفہ مانتے ہیں ایک بڑے دانشور کا یہ مشہور قول ہے کہ قرآن اگر اردو میں اترتا تو مولانا آزاد کی نثر میں اترتا۔ تحریر ابھی آپ نے ملاحظہ کی اس کی مطابقت کس آسمانی صحیفے بتائی جا رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کی مجموعی بدنصیبی ہے کہ ایک شخص جو اپنی مخالفت کو اس طرح بیان کرتا تھا کہ گویا خدا کی مخالفت کی جا رہی ہے اسی کی تعریف و توصیف میں علماء دین تک لگے ہوئے ہیں بڑے بڑے معتمد علماء آئے دن مدحِ آزاد میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

---

[1] ایضاً

ماہِ ربیع الاوّل اور مسلمان

مولانا نے ایک مضمون "ماہِ ربیع الاوّل" کے عنوان سے جنوری ۱۹۱۶ کے البلاغ میں تحریر فرمایا۔ یہ مضمون مولانا کی ذہنیت کا ایک خاص نمونہ ہے جس سے ہمارے اس دعوے کو کہ مولانا رسولؐ، قرآن اور صحابہ کی زندگیوں کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے، ثابت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ربیع الاول کا مہینہ مسلمانوں کے لیے خاص خوشی کا مہینہ ہے کہ بارہ ربیع الاوّل کو رسول اللہؐ دنیا میں تشریف لائے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس مہینہ میں خوشیاں مناتے ہیں کہ یہ مہینہ توحید کی شرک پر فتحمندی کی علامت ہے۔ مولانا نے بعثت رسولؐ کو بھی جنگِ آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دینے کے لیے ایک پیغام بنایا ہے کہ ہندوستان کے ہندؤں کے ساتھ مل کر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ لیں یہی ماہ ربیع الاوّل کا پیغام ہے اور یہی اسوۂ رسولؐ اللہ سے ثابت ہے۔ اور مولانا کی نظر میں چونکہ مسلمان اس پیام پر عمل نہیں کر رہے لہٰذا ان کو خوشیاں منانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ رسولؐ اللہ کی بعثت کو بھی مولانا نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کس طرح استعمال کیا ہے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔

مضمون کی شروعات میں مولانا نے بعثتِ رسولؐ اللہ کے واقعہ کو درج کیا ہے اور آخر میں گھما کر اس کو ہندوستان کی جنگِ آزادی سے جوڑ دیا ہے۔

"پس ربیع الاول انسانی حریّت کی پیدائش کا مہینہ ہے غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے۔ خلافتِ الٰہی کی بخشش کا یوم اوّلین ہے۔ اسی ماہ میں کلمۂ حق زندہ ہوا"[1]

یعنی اس مہینہ کی اہمیت مولانا کے لیے صرف اتنی ہے کہ یہ غلامی کے خلاف حریّت کا پیغام ہے اور چونکہ مسلمان انگریزوں کی غلامی میں خوش ہیں اور ہندؤں کے ساتھ مل کر آزادی کے لیے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں لہٰذا انہیں اس مہینہ کی خوشیاں منانے کا حق نہیں ہے۔

"لیکن آہ تم اس ماہِ حریّت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو اور اس کے لیے تیاریاں کرتے ہو گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری خوشیوں کے لیے ہی آیا ہے خدارا مجھے بتاؤ کہ تمہیں اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح کو اپنا ساتھی بنائے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا

---

[1] البلاغ ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء ص۔

کی عقلیں نہ ہنسیں گی۔ اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کریں؟ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے؟"[1]

مسلمانوں کو یعنی بقول مولانا شہروں اور اندھوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ زندگی اور روشنی کا ذکر کریں۔ اس مہینہ کی خوشیاں مسلمان نہیں منا سکتے کہ وہ آزادی کی جنگ میں حصہ نہیں لے رہے ایسا نہ تھا بلکہ مولانا کو یوں کہنا تھا کہ تم اندھوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں نہیں چلتے تب بات میں کچھ وزن پیدا ہوتا۔

"پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی ما سوی اللہ رشتوں کی غلامی اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا رکھا ہے۔ تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو جو نہ خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور روح ہے۔ البتہ چور چور ہو سکتا ہے۔ تم غبار راہ کی ایک مشت ہو جس کو ہوا اڑا لے جا تو سکتی ہے ورنہ وہ خود صرف اس لیے ہے تاکہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور چلنے والوں کے قدم سے پامال کی جائے۔"[2]

یہ گوشہ تحقیق طلب ہے کہ مسلمانوں سے مولانا کو آخر اس قدر دشمنی کیوں تھی کہ ان کو ٹھوکروں سے روندے جانے کی امید کرتے تھے۔ لیکن کیا اگر مسلمان روندے جاتے تو خود آزاد نہ جاتے؟ اس کا انتظام بھی مولانا نے کر لیا تھا۔ اپنی خدمت ہندو قومیت کی انھوں نے کی تھی کہ جس وقت حیدرآباد میں لاکھوں مسلمان پولیس ایکشن میں شہید کیے گئے مولانا وزارت تعلیم لے کر عیش کرتے رہے۔

"پھر اے غفلت کی ہستیو اور اے بے خبری کی سرگشتہ خواب روحو! تم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کی بخشش کا مژدہ اور فیروز مندی کی جزوی و سلوی کے لیے آیا تھا! اللہ اللہ غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی ما سوی اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں انسانوں کی مملوکیت و عبودیت کے حلقے گردنوں میں ..... ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہوئے ہو کہ ربیع الاول کے آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح، حریت صادقہ کا

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

اعلان حق، عدالت حقہ کی ملکوتیت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس اے غفلت شعارانِ ملت! تمہاری غفلت پر صد فغاں و حسرت اور تمہاری سرشاریوں پر صد ہزار نالۂ و بکا اگر تم اس راہ کی اصلی عظمت و حقیقت سے بے خبر رہو۔[۱]

مسلمانوں کے بارے میں تو مولانا کے یہ خیالات تھے اور ہندوؤں کو مولانا آزاد مجاہد قوم سمجھتے تھے تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ علماء کا یہ خیال ہو گیا کہ ملک و وطن کو بت بنا کر اس کی پرستش کرنے والے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کو بھی اسی طرح عمل کرنے کا درس دے رہے تھے اور مسلمان جب عمومی طور سے اس نظریے سے الگ رہے تو ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ مولانا آزاد ہندوؤں سے مرعوب تھے۔ اور مسلمانوں کو بھی اسی راہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں فرمایا:۔

"آج تک انھوں نے ملک کی تمام خدمتیں صرف ہندوؤں کے لیے ہی چھوڑ دی تھیں اور خود اپنے لیے ہندوؤں کو باغی کہنے کا شریفانہ مشغلہ منتخب کر لیا تھا۔ ملک کی فلاح و بہبود کی فکر ہو تو صرف ہندوؤں ہی کو جابرانہ قوانین کے خلاف احتجاج کریں تو صرف ہندو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے لیے روئیں تو صرف ہندو اگر ایسا ہی ہے تو خدارا اپنے دلوں میں سوچو کہ بدبخت مسلمان آخر کس مرض کی دوا ہیں۔"[۲]

---

[۱] الیضاً

[۲] الہلال، اکتوبر ۱۹۱۳ء ص ۳۰

کانگریس
ایک صادق العمل جماعت

مولانا کی کانگریس میں شمولیت ان کی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ ایسا نہ تھا کہ کانگریسی لیڈران نے مولانا آزاد سے کانگریس کا ساتھ دینے کی درخواست کی ہو بلکہ مولانا خود کانگریس کے در پر بمع اپنے علمِ قرآن وحدیث تشریف لے گئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس پر بھی ایک زمانے تک کانگریس میں ان پر اعتماد نہ کیا گیا۔ اس وقت تک چونکہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان نہ تھا اور تمام کے تمام مسلمان سرسید کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہے تھے۔ ایک زمانے کے آزمائے ہوئے قائدین قوم میں موجود تھے جن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مولانا اس وقت بائیس سال کے لڑکے تھے۔ لیکن خود اعتمادی سے بھرپور اور ترقی کرنے کے شدید خواہشمند۔ کوئی طریقہ ایسا نہ تھا کہ وہ جلد نکل کر آگے آسکیں لہٰذا طریقہ یہ نکالا کہ مسلمانوں کو ایک نیا سبق پڑھائیں جس سے کانگریس کی پوری طاقت ان کے ساتھ ہو جائے اور جتنے بھی مسلمان ان کے ساتھ آسکیں وہ زیادہ ہی زیادہ ہیں۔ اسی اسکیم کے تحت دینی عالموں کے ایک طبقہ کو مولانا اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ علماء کا سرسید سے پرانا بیر تھا۔ سرسید کی زندگی میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے بلکہ الٹا سرسید سے اتفاق کرنا پڑا لیکن اب چونکہ کانگریس کی پوری طاقت ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی لہٰذا اگر مسلمان ساتھ نہ بھی دیتے تو بھی کوئی گھاٹا نہ تھا۔ کامیابی ہر صورت تھی چاہے مسلمان ساتھ دیں یا نہ دیں۔ اب کانگریس کو اپنا بہت پرانا دعویٰ ثابت کرنے کا وقت آگیا تھا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے۔

"یا دش بخیر مسلمانوں کا ایک سیاسی دور چند سال پیشتر تک تھا جو کہ گزر چکا ہے کہتے ہیں کہ اس گذشتہ عہد میں ایک خوں خوار عفریت کسی آبادی کے عین وسط میں رہتا تھا جس کا نام مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی تھا۔ اس کی طاقت عجیب

اور اس کے خون خوارانہ حملے بے امان تھے۔ خواہ انسان کہیں ہو اور کسی فکر میں ہو اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ تمام ملک اس کے دستِ تظلم سے عاجز آ گیا تھا اور اس شیطان لعین کے حملوں سے بپا نما نگتا تھا۔"[1]

یعنی سرسید کی "مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی" کے نظریہ کو مولانا شیطان لعین اور درندہ سمجھتے تھے مسلمان تعلیم حاصل کریں اور سیاسی شور غوغا میں شریک نہ ہوں یہ نظریہ مولانا کو سخت ناپسند تھا۔ یعنی مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں اور سیاسی شور غوغا میں اپنی صلاحیتیں غیروں کے لیے ضائع کریں۔ یہ تھا مولانا کا نظریہ۔

"چنانچہ بالآخر خدا نے دعاؤں کو سنا اور اپنے بعض بندوں کو بھیج دیا جنہوں نے روایات یہود کے بلغم باعور کی طرح اس عفریتِ سیاہ کو ایک ہی وار میں ٹکرے ٹکرے کر دیا (قرآن) فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین۔"[2]

دوسرے الفاظ میں مولانا یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں خدا کی طرف سے اس پالیسی کو ختم کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہوں ساتھ ہی ساتھ قرآن کی آیت بھی اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کر دی

"پس وہ عہد گذر چکا اب اس کا تذکرہ فضول ہے مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی اگر کوئی تھی تو اب اس کا عفریت مر چکا ہے۔ ۔ ۔ ۔ وہ زمانہ گیا جب انڈین نیشنل کانگریس کی شرکت کے تصور سے مسلمان کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں علی گڑھ کی برادری حقہ پانی بند نہ کر دے اور قومی اصطلاحات کی فرہنگ میں سب سے بڑی گالی یہ تھی کہ اسے کانگریسی کہہ دیا جائے۔"[3]

مولانا کو کانگریس کی حیثیت کا صحیح اعتراف تھا کہ کانگریس ہونا گالی میں شمار کیا جاتا تھا پھر بھی مولانا نے عام مسلمانوں کے مفاد کو قربان کر کے سرسید کی قومی پالیسی کی مخالفت بہت گندے اور گھٹیا الفاظ میں کی۔ کہ یہ عفریت تھا جو کہ مر چکا۔

"اب مسلمان کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر ملک کی ایک ہی سچی اور صادق العمل جماعت نے استقامت اور راستبازی سے ان کی ضد اور ہٹ پر فتح و غرور

---

[1] الہلال دسمبر ۱۹۱۳ء ص ۴۲۰ [2] ایضاً [3] ایضاً

بانی ہے۔ اور مسلمہ قومی پالیسی کے سوگو اب شرم و حیا سے اپنی ذلالتِ چہل سالہ کا اعلانیہ اقرار نہ کریں لیکن ان کے دل اور ضمیر......[۱]

کانگریس کی صادق العملی آزاد ہندوستان کے مسلمان زیادہ بہتر طریقہ سے جانتے ہیں یہاں کانگریس سے مراد صرف کانگریس نام کی پارٹی نہیں ہے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ اپوزیشن کی حمایت ہمارا مقصود ہے۔ بلکہ کانگریس کے نام سے ایک فلسفہ وابستہ ہے جو جماعت بھی اس فلسفہ کو اپنائے وہ کانگریس ہی ہے چاہے اس کا نام بدل دیا گیا ہو۔

ان گنت فسادات جو حکومت کی سرپرستی میں ہوئے مولانا کے فتوے پر گواہ ہیں کہ حقیقت میں مولانا صحیح سمجھتے تھے کہ ملک میں اگر کوئی سچی اور صادق العمل جماعت ہے اور تھی تو وہ مولانا کی کانگریس ہے

"اگرچہ بعض استقامت فرمایانِ راہِ ضلالت اب بھی موجود ہیں جو کانگریس کی شرکت کو مسلمانوں کے لیے مضر بتلانے سے نہیں شرماتے.... لیکن جو حق تھا وہ ظاہر ہو گیا اور جو باطل تھا اسے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی۔ "ان الباطل کان ذہوقا۔"[۲]

اب تو کانگریس کو حق پر ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیت بھی پیش کر دی گئی پھر بھی مسلمان اس کو مضر اور باطل ماننے پر مصر تھے جب کہ ایک عالم قرآن کی آیت سے دلیل لا رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کے پاس دماغ نہ تھا تو مولانا سے لے لیتے مگر افسوس کہ اس بات کو بھی لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔

"افسوس کہ نہ زمانے کے پاس دماغ ہے اور نہ کسی کے پاس دماغ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے قلم دوات کے علاوہ اور بھی چند چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عقل و دانائی ایک شئے ہے جس کا ثبوت مانگنے کا ہمیں ہر مدعیِ انسانیت سے حق حاصل ہے۔"[۳]

علی گڑھ برادری اور قائدین علی گڑھ تحریک کی مسلمانوں پر لیڈری مولانا کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی

۱۔ المتنبا ۲۔ ایضاً ۳۔ الہلال دسمبر ۱۹۱۳ء ص ۳۶

اس کی جگہ وہ کانگریس کی قیادت مسلمانوں میں قائم کرنا چاہتے تھے مسلمانوں سے مخاطب ہیں!

"صرف اپنی قوم کے ان لوگوں کو دیکھو جن کے پاس جائداد کا کوئی حصہ یا چاندی سونے کے کچھ سکے جمع ہو گئے ہیں اور اس لیے لیڈری اور پیشوائی کے بھی مدعی ہیں ان میں سے بہت سے فراعنہ اور نمارد ہ تم کو ایسے ملیں گے جن کا نام اگر ان خطابوں سے الگ کر کے زبان سے نکالا جائے جو ان کے شیطانی خبث و غرور نے گڑھ لیے ہیں یا حکومت کی خوشامد و غلامی کا اصطباغ لے کر گڑھ لیے ہیں تو ان کے چہرے مارے غیظ و غضب کے درندوں کی طرح خونخوار ہو جاتے ہیں"[1]

اس اقتباس کی زبان اگر دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوگا گویا کسی بہت ہی غیر تہذیب یافتہ انسان کے ہاتھ میں کسی طرح سے قلم آگیا ہے۔ اس اسلوب کی تعریف میں ہمارے ادیب اور نقاد تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے دنیائے اردو میں الہلال کے اسلوب کا اور اس کے طرز تحریر کا۔ بعض تو اس کو قرآنی لہجے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کانگریس کی محبت اور علی گڑھ تحریک سے نفرت یہ تھا مولانا کا مشنِ حیات کانگریس کی حمایت کے بل بوتے پر چیلنج کرتے ہیں

"....مگر میری آواز کا ہر سامع آج انھیں ان کی ناکامی کا پیام پہنچا دے وہ دنیا جسنے بحرِ احمر میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق ہوتے دیکھا تھا وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے اندر بحرِ حریت و صداقت میں ان مغرور لیڈروں کے غرق ہونے کا بھی تماشہ دیکھ لے"[2] (ہم نے فرعونوں کو انسانوں کی پیشوائی اور لیڈری تو دی تھی مگر وہ ایسے لیڈر تھے جو ہدایت اور رہنمائی کی جگہ قوم کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے)"[3]

یعنی مسلم قائدین تو مسلمانوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے اور کانگریس مسلمانوں کو جنت کی راہ دکھا رہی تھی یہ گمراہی کی نہ جانے کون سی منزل ہے علماء تحقیق کریں۔

۱۔ الہلال جولائی ۱۹۱۳ء ص۵۶ ۲۔ ایضاً ۳۔ القرآن الکریم ۲۸:۴۱۔

خطبۂ رام گڑھ

مولانا کے سیاسی خیالات کا آئینہ

۱۹۴۰ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ رام گڑھ میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی۔ اس جلسہ کا خطبۂ صدارت مولانا آزاد کے سیاسی تصورات کا آئینہ ہے یہ خطبہ مولانا کی سیاسی تقاریر میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس تقریر میں انہوں نے اپنے سیاسی خیالات کی تشریح کی ہے جو آج کے مسلمانوں کے لیے خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ حال ہے کہ بس کسی نہ کسی طرح زندہ ہیں اور سانس لینے و سجدہ کرنے کی اجازت ہے باقی باعزت اور خوشحال زندگی کا کوئی شائبہ تک ان کی حالت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور خیالات کا از سر نو تجزیہ کیا جائے جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی عظیم شخصیت سرسید احمد خاں نے بھی اپنے سیاسی خیالات اور تصورات کو مسلمانوں میں عام کیا اور کانگریس کے برخلاف مسلمانوں کے لیے ایک نیا نظریہ وضع کرنے میں اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال صرف کیے۔ اس وقت تک سرسید ایک طویل زندگی گذار چکے تھے۔ نئے زمانے کا پورا علم اور تجربہ کی بصیرت ان کی مددگار تھی۔ سرسید کے سیاسی خیالات کو سمجھنے کے لیے ان کی تین تقاریر بہت اہم ہیں۔ ایک لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر ۱۸۸۲ء میں دوسری ۱۸۸۸ء میں لکھنؤ میں اور تیسری ۱۸۹۶ء میں میرٹھ میں۔ لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کانگریس بننے سے تین سال پہلے ہی ملک میں مختلف قوموں کی موجودگی کا اظہار کیا تھا مولانا آزاد کا خطبۂ رام گڑھ سرسید کی ان تقاریر کیساتھ پڑھنے سے بہت تلخ حقائق سامنے آتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا نے اپنے سیاسی تصورات کی بنیاد میں سرسید و مسلم مخالف عنصر کو شامل کر لیا تھا یہ عنصر ان کی تمام زندگی کے کاموں میں صاف جھلکتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جو کبھی یہ نہیں بھولتا کہ مجھے بہر حال مسلم مفاد کی مخالفت کرنا ہے۔ سادہ جمہوری نظام میں اکثریت اور اقلیت کا کلیدی مقام ہے اکثریت حکمراں اور اقلیت اس کی دست نگر ہوتی ہے مولانا نے سب سے پہلے اسی حقیقت پر حملہ کیا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں میں سے کتنے ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔۔۔ اگر چند اشخاص ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کرونگا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں میں نے اس زمانے میں بھی اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں کہی گئی جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے"۔[۱]

کمتر درجہ کی عقل کا انسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت ہیں۔ پندرہ اور پچاسی فیصد کا تناسب ہندو مسلم آبادی میں ہے جمہوریت کا خاصہ اکثریت کی حکومت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان ایک عرصہ سے حکمراں چلے آتے تھے۔ کئی صدیوں بعد جمہوری طریقۂ حکومت میں اکثریت کو اپنی بالادستی قائم کرنے کا موقعہ مل رہا تھا اور وہ بلا کسی قانونی رعایت کے ان طریقوں کے رائج کرنے کی خواہشمند تھی یہ ۱۸۸۲ء سے ہی جمہوری اداروں کی شروعات میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ بنا کر انگریزی حکومت کر چکی تھی پھر بھی مولانا نے مسلمانوں کو اقلیت ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف سرسید نے سلف جمہوری اداروں کی شروعات پر ایک مراسلہ میں لکھا تھا کہ

"یہ کوشش زیادہ تر ہندیوں کی نقلوں کی کی ہے اور حقیقی پیروی انگلینڈ وامریکہ کی نہیں ہے اور ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس کا نتیجہ اس ملک کی قسمت پر کیا ہوگا۔ کل دنیا کے ممالک میں ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لیے مناسب ہے اور میں اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے کل اقوام ہند کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے کیونکہ اگرچہ مسلمان مینارٹی میں لیکن سب سے متحد اور بڑی مینارٹی ہیں اور کم از کم روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب مجاری ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں اور جو طریقہ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے زیادہ مضر ہوگا"۔[۲]

۱۔ مرض سلیانی ابوالکلام آزاد ص۱۲۹ ۲۔ مراسلہ ایڈیٹر پانیر مکتوبات سرسید ص۲۹۹

سرسید کے انہیں خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ اگر وقت ہوتا تو میں بتاتا کہ ساٹھ سال پہلے کن ہاتھوں نے ان خیالات کی بنیاد ڈالی ۱۹۴۰ء سے پہلے ساٹھ سال کا عرصہ سرسید کی تحریک کے زمانے پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی ۱۸۸۰ء کے آس پاس اور اس وقت سرسید نے کانگریس بننے سے تین سال پہلے ہی لارڈ رپن کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر بولتے ہوئے سادے جمہوری اداروں کی شروعات پر تنقید کی تھی۔

"اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل سے بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی ہے۔ ۔ ۔ ۔ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے"[۱]

سرسید نے کانگریس کی مخالفت جمہوری انگریز افسروں اور دانش رائے کی رضامندی سے نہیں تھی محض حقائق کی بنیاد پر کی اور مشکلات کا اظہار کیا جو کانگریس کے مطالبات پورے ہونے پر مسلمانوں پر پڑنے والی تھیں یہ پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کانگریس کی تھی کہ کانگریس مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی پالیسی اختیار کر رہی تھی۔ سرسید نے صرف اتنا کہا کہ یہ مطالبات جو کانگریس نے پیش کئے ہیں اور کانگریس کے مقاصد ہمارے لیے نقصان دہ ہیں تو وہ پھوٹ ڈالنے کے گنہگار قرار دیے گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزوں نے کانگریس ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی۔ سرسید کی تحریک محض ایسی تھی جیسے ایک کمزور آدمی طاقتور اور توانا انسان کے حملے سے بچنے کے لیے پینترے بدلتا ہے۔ مولانا نے آگے خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان قوموں کا تصور جو اس زمانے میں پیش کیا گیا اور مسلمانوں کا اقلیت میں ہونا دراصل یہ غلط اور فریب کی باتیں ہیں۔ مسلمانوں کی حیثیت کو نظریہ متحدہ قومیت میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

"اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور پر ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی

۱؎ شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد ص ۱۹۱

تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہیں اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی"۔

کانگریس سے سرسید کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ جب کانگریس کے مطالبات ان کے سامنے آئے تو انھوں نے اس پر تفصیلی بحث کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور یہ ثابت کیا کہ یہ مطالبات مسلمانوں کے لیے مضر ہیں۔ کانگریس اگر واقعی باہمی دوستی اور متحدہ قومیت کی علمبردار تھی تو اسے سرسید کے اشکال دور کر کے اپنے مطالبات میں ترمیم کرنی چاہئے تھی۔ اس کے برخلاف ایسا نہ کرکے مخالفتوں کو بڑھایا گیا اور سرسید کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ایسے مقاصد اور مطالبات جن کے پورا ہونے سے مسلمانوں کے پچھڑ جانے کا اندیشہ تھا کوئی بھی ہمدردِ ملت کیسے قبول کر سکتا تھا لہٰذا مخالفت کا بیج کانگریس نے پہلے ہی اجلاس میں بو دیا تھا اور مسلمانوں کے اعتراض کرنے کے باوجود انہیں اعتماد میں لینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

مسلمان اقلیت نہیں ہیں

مولانا آزاد کا تصورِ اقلیت بہت عجیب و غریب اور غیر عقلی ہے۔ ان کے خیال میں اقلیت کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہو سکتا کہ تعدادی اعتبار سے اگر کوئی گروہ کم ہے تو وہ محض اس بنیاد پر اقلیت قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ صلاحیت کے اعتبار سے بھی اسے تعدادی اعتبار سے بڑے گروہ سے کم حیثیت کا ہونا چاہئے یہ بہت حیرت انگیز خیال ہے اور دنیا کی کوئی ڈکشنری یا کوئی ماہرِ لسانیات اس غیر حقیقی خیال کی تائید نہیں کرے گا۔ اگر مولانا تعداد کے ساتھ صلاحیت کے تصور کو بھی ضروری خیال کرتے تھے تو کیا صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے اور ہیں؟ مسلمانوں میں تعلیم کا حال، ان کا غیر مذہبی رسموں کو مذہب سمجھنا، انحطاط پذیر معاشی اور معاشرتی نظام کیا ان کو ہندوؤں سے صلاحیتوں میں کم ثابت نہیں کرتا؟ کیا ہم یہ تصور کریں کہ مولانا ان حقائق سے واقف نہ تھے؟ یا یہ کہا جائے کہ جان بوجھ کر وہ قوم میں غلط خیالات پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے ہندو مسلمانوں دونوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ الٹا ان غلط تصورات کے شائع ہونے سے ہندو مسلم کے سوال میں اور الجھاؤ پیدا ہوا۔ اقلیت کے معنی تو وہی رہیں گے جو ہیں، مولانا کو اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی دوسرا لفظ تلاش کرنا چاہئے تھا۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی اقلیت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا

کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیتوں، دونوں کے اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔۔۔ اس تعداد (number) کے ساتھ نوعیت (nature) کا سوال بھی کام کرتا ہے ۔"

یعنی مولانا آزاد یہ فرض کرتے ہیں کہ مسلمان تعداد کے علاوہ صلاحیتوں کے اعتبار کو بھی ہندوؤں سے کم نہیں ہیں اور اسی وجہ سے انہیں کسی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں گمراہ اور غلط خیالات کی وجہ سے مولانا کو مسلمانوں کے حقوق کا خیال تمام زندگی نہ آیا کیونکہ وہ مسلمانوں کو اقلیت تک ماننے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا کسی بھی طرح سے مسلمانوں کے حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا کیا حیرت انگیز مفروضہ ہے اور کیا کیا اس کے نتائج ہمارے سامنے آج موجود ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کی مانگ کرنے والا فرقہ پرست کہکر بدنام کر دیا جاتا ہے اور جو حقوق غصب کر رہا ہے اور جان و مال کو لوٹ رہا ہے وہ پھر بھی ان الزامات سے بری ہے۔ کیونکہ ہمارے قائدین نے یہ تسلیم کر لیا کہ اقلیت کا سوال ایک "بازیگر کا کھیل" ہے اور "ناچنے والے ناچ رہے ہیں" ہندوستانی مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ سر سید نے میرٹھ کے مشہور لیکچر میں کہا تھا کہ !

"پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہم اس پولیٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں۔۔۔ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے ۔"

سر سید کے ان حقیقت پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتنا بڑا گروہ اقلیت قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ کہنا کہ مسلمان کمزور ہیں اور علم میں کم ہیں، صریح دھوکا دینا ہے۔

۱۔ ایضاً ص ۹۱

اُب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی ۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان کرنا صریح دھوکا ہے۔ ... سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانوں کی اتنی عظیم تعداد کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟¹

ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے حقیقتاً اس مسئلہ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا جیسا کہ وہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ایک ہی نگاہ میں یہ پتہ چل جائے گا کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں اور آٹھ کروڑ کی تعداد کبھی اقلیت نہیں ہوسکتی چاہے اس کے مقابلے پر تیس ۳۰ کروڑ انسانوں کی آبادی ہو اور نوعیت (Nature) میں چاہے کتنی ہی ترقی یافتہ ہو۔ مولانا یہ تصور کرکے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں خود ہی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ایسے اندیشوں کی کہ مسلمان محکوم ہوجائیں گے اور ان کے حقوق کا کیا ہوگا کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے؟ مولانا ان اندیشوں تک کو صحیح نہیں مانتے تھے کہ شک بھی مت کرو حالانکہ کسی بھی ہمدردِ ملت کے لیے سب سے اہم اور پہلا سوال یہی ہوسکتا تھا کہ وہ یہ غور کرے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ لیکن مولانا کے نزدیک یہ جائز سوال نہ تھا۔ لہٰذا آزاد ہندوستان میں بھی بحیثیت وزیر تعلیم کبھی بھی ان کے ذہن میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خیال تک نہ آیا اور ملک میں کوئی مسلم ادارہ انھوں نے قائم نہیں کیا۔ کم سے کم وہ یہ کرسکتے تھے کہ تعلیمی ترقی دینے کی کوشش کرتے اگر فسادات نہیں روک سکتے تھے۔ لیکن یہ سوال تو جب ذہن میں آتا جب وہ مسلمانوں کو اقلیت اور ان کے الگ مسائل کا اقرار کرتے۔ اپنے تصورات اور عقائد کے اعتبار سے انھوں نے جو کچھ کیا صحیح کیا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے خیالات کی پرواز بے روک ٹوک جاری رہنے دینے کے عادی تھے۔ تصورات کی خوبصورت دنیا بنانے میں ان کا ثانی نہ تھا اور تلخ حقائق کے سامنے آنے کے باوجود اپنی راہ بدلنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اس کی ایک بہت عمدہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ہندوستان ایک فیڈرل ری پبلک ہوگا اور مرکز کے پاس چند محکموں کے علاوہ سارے محکمے آزاد

---

¹ ایضاً صفحہ ۱۵۱

ریاستوں کے پاس ہوں گے اور ہندوستان کی گیارہ ریاستوں میں سے چار ریاستوں میں کیونکہ ان کی اکثریت ہے لہٰذا مسلمانوں کو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ گمان کی بلندی ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان کا آئندہ دستور اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو لیکن وہ ایسا دستور ہوگا جس کے کل حلقے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جس کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی دفاع، کسٹم وغیرہ۔۔۔ ایسی حالت میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دماغ۔۔۔ ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے پر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشہ میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔"[۱]

یہ بہت عجیب منطق ہے کہ بے خوف وخطر اور بنا سوچے سمجھے مسلمان حالات کے دریا میں کود پڑیں اور کانگریسی نیشنل ازم کو اپنا لیں۔ تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ اس نظریہ کو اپنانے والی سب سے پہلے دینی علماء کی جماعت تھی جس کے خلاف سرسید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا۔ سرسید نے ۱۸۸۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ عام میں کانگریس کے مطالبات کی مخالفت کی تھی۔ ہزاروں سے مسلمان اس جلسہ میں شریک ہوئے اس تقریر میں انھوں نے کانگریس کے مطالبات پر اور خاص طور سے جمہوری اداروں کی شروعات پر روشنی ڈالی تھی مولانا اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔"[۲]

یعنی مولانا ۱۹۴۰ء میں یہ کہہ رہے ہیں کہ آج سے تیس سال پہلے میں نے یہ غور کرنے کی کوشش کی

۱۔ ایضاً ص ۱۵۲ ۲۔ ایضاً ص ۱۵۲

تھی اس وقت موصوف کی عمر محض ۳۳ تیئیس سال ہوتی ہے۔ سر سید کے انتقال کو صرف بارہ سال ہوئے تھے اور پورے ہندوستان میں سرسید کے خیالات جاری تھے جو کہ ۱۸۸۸ء میں انھوں نے کانگریس کے خلاف اپنی مشہور تقریر میرٹھ میں ظاہر کیے تھے۔ مسلمان مولانا کی نظر میں سیاست سے یک قلم کنارہ کش تھے۔ دراصل یہ کہنا چاہیے کہ کانگریس کی سیاست سے کنارہ کش تھے ورنہ مسلمانوں کی اپنی جماعتیں مسلم لیگ وغیرہ تھیں جس وقت سرسید نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۶ء میں تحریک شروع کی وہ ایک پوری عمر قومی خدمت میں گذار کر اپنی عمر کے اکھتر ویں سال میں داخل ہوئے تھے۔ ایک عمر کا تجربہ اور دانشوری اور عدیم المثال ذہانت ان کے اس فیصلہ میں شریک کار تھی کہ کانگریس مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ صورتحال میں ان کے لیے انتہائی درجہ مضر ہے۔ محسن الملک، وقار الملک اور سر آغا خاں وغیرہ جنھوں نے کہ ایک عمر مسلمانوں کی خدمت میں بسر کی سرسید کے سچے جانشیں دنیا دیکھے ہوئے برتے ہوئے معزز بزرگ سرسید کے پیغام کو ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچا رہے تھے اس وقت مولانا آزاد نے یہ منصوبہ باندھا کہ کس طرح اس تحریک کو ختم کر کے اپنے لیے قیادت اور ناموری حاصل کی جائے لہٰذا الہلال کا اجرا کیا۔ الہلال کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کے صفحات نے کبھی مسلمانوں کے جداگانہ مسائل کی موجودگی کا اقرار نہیں کیا بلکہ ایسے سوالات کو قدامت پرستی اور فرقہ پرستی سے تشبیہ دی۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو بنگالی کانگریسیوں نے سرسید اور ان کے رفقاء کے خلاف استعمال کئے۔ مولانا کی زبان پر بھی یہ ہمیشہ جاری رہے۔ الہلال نے صرف یہی نہیں کیا کہ مسلمانوں کے مسائل کی موجودگی سے انکار کیا بلکہ ان کے لیے کی جانے والی کوششوں حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کو بھی قدامت پرستانہ اور اسلام دشمن اقدام بتایا۔ اسی خطبہ میں آگے فرماتے ہیں!

اپنی آنکھیں بند کرلو

"میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کرسکتے ہیں صرف اس طرح کہ معاملے کی سطح پر نہ رہیں اس کی بنیادوں تک اتریں اور دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک

سوال کے جواب پر موقوف ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بداعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے۔۔۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے تو پھر ہماری راہ بالکل صاف ہو جاتی ہے۔۔۔ شک تذبذب بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔"

شک اور تذبذب اور یقین یا بے یقینی بذات خود کوئی ایکشن نہیں ہے بلکہ یہ ری ایکشن ہے۔ حالات کا اور واقعات کا اور تجربے کے ذریعہ حاصل کی گئی ذہانت کا۔ ایک آزمائے ہوئے شخص پر بار بار یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یقین اور بھروسہ جو کسی شخص پر ہوتا ہے وہ ایک عرصہ دراز تک اس کے اعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک انسان جو کسی دوسرے انسان کی کسی طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور ہر بار بوقت آزمائش ناکام ہوتا ہے اس پر کوئی کیسے بھروسہ کر سکتا ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ ہم خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھتے ہیں یا شک اور بداعتمادی کی نظر سے بہت بحث طلب مسئلہ ہے ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہیں گے کہ خود اعتمادی اپنی قابلیت اور حالات کی سازگاری دونوں پر منحصر ہوتی ہے۔ کوئی ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ لے کر خود اعتمادی سے یونیورسٹی لیکچررشپ کا انٹرویو دینے کے لیے تیار نہیں کر سکتا یا چیس فیصد مسلمان ۴۲ سے زیادہ سیٹیں نہیں جیت سکتے۔ سوال خود اعتمادی اور بے اعتمادی کا نہیں تھا بلکہ ان قوانین اور ضوابط کا تھا جن سے ملک کی حکومت چلائی جائے گی۔ قانون اگر یہ ہے کہ مقابلہ کا امتحان بنا کسی رزرویشن کے جاری ہوگا تو مسلمان کتنی ہی خود اعتمادی اور ہمت سے اس میں بیٹھیں پروبلیٹی یہ کہتی ہے کہ ان کا چانس تقریباً زیرو ہے۔ اس لیے کہ مقابلہ میں آنے والی قوموں کی قوت کا اندازہ ہر شخص بخوبی کر سکتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا ملکی قوانین پر تفصیلی بحث نہیں چاہتے تھے ان کی بس یہ خواہش تھی کہ مسلمان اعتماد کریں اور آنکھیں بند کر کے تاریک مستقبل میں قدم رکھ دیں۔

"میں نے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔

آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا ۔۔۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ اس تمام مدت میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ میری آنکھوں نے دیکھنے اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی ۔۔۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی تھی۔ [لہ]

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا عرصہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسے دور کی حیثیت سے یاد کیا جائیگا جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار ہندی مسلمانوں کی سیاست کے دھارے کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں جبکہ مولانا کی عمر محض چوبیس [۲۴] سال کے لگ بھگ ہوتی ہے اور ان کی تعلیمی حیثیت کا علم بھی سبھی کو ہے کہ نہ انھوں نے کوئی ماڈرن یونیورسٹی دیکھی اور نہ خود سر سید کی طرح آثار الصنادید کی طرح کا کوئی علمی کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے عالمِ سائنس میں سر سید کا نام پہچانا جانے لگا تھا اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا ممبر نامزد کیا گیا جو بلا شبہ اس زمانے میں کسی انسان کی علمی حیثیت کا سب سے بڑا اعتراف تھا۔ مولانا آزاد نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ قرآن و حدیث کا اسقدر بیجا استعمال کیا کہ اپنے ہر ذاتی خیال کے لیے بھی ہمیشہ قرآن کی آیت پیش کی۔ ہمارا خیال ہے کہ باقاعدہ کوئی دینی ادارہ دیوبند یا ندوہ اس کی تحقیق کرے تو وہ بہت مناسب ہوگا کہ آیا جن قرآنی آیات کا ذکر مولانا نے جا بجا کیا ہے وہ اس سلسلہ میں قابلِ استعمال میں کہ نہیں؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک حیرت انگیز ریسرچ لوگوں کے سامنے آئے گی کہ دینی علماء اور عام مسلمان سب انگشت بدندان رہ جائیں گے

۱۹۱۲ء کی راہِ عمل کیا تھی سوائے اس کے کہ اپنا ہاتھ نابینا انسان کی طرح دوسری قوم کے ہاتھ میں دے دو، اور اس پر اعتماد رکھو۔ خود اعتمادی اور ہمت سے آنکھیں رکھتے ہوئے انھیں بند کر لو اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دو اور کشاں کشاں اس کے پیچھے پیچھے چلو اور امید رکھو کہ وہ تمہیں منزل پر پہنچائے گا۔ یہ عمل دونوں کے لیے ایک بوجھ ہے اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ کبھی آنکھ اگر دھوکے سے کھل بھی جائے تو دیکھو مت اور سوال مت کرو کہ یہ راستہ منزل پر نہیں جاتا۔ قرآن کی آیتوں کا ہتھیار مولانا

لہ ایضاً ص ۱۵۱۔

اپنے ایک ہاتھ میں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے مسلمانوں کے ایک مجمع کو اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ١٩١٢ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کرونگا۔ ۔ ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا گرد آلود ہو رہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیئے ... وہ آج بھی ہر پہلو سے غور کرلیں وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں پائیں گے؎[1]

یہ مشورہ بہت مناسب ہے کہ ہر پہلو پر غور کرلیں اس کے بعد راستہ متعین کریں گے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ دعوتِ فکر کے ساتھ ساتھ اس کا نتیجہ بھی بتا دیا۔

اسلام سے رشتہ

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے .... بحیثیت مسلمان میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے ... میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا؎[2]

مولانا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ مذہب اور کلچر صرف ان دو دائروں میں ایک خاص ہستی رکھتے ہیں اور وہ اس میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کے قائل نہیں ہیں مگر جہاں سیاسی دائرہ شروع ہو جاتا ہے وہ اپنا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے توڑ کر ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت سے جوڑتے ہیں اور اس میں مسلمانوں

ا؎ ایضاً ص۱۵۲ ۔ ۲؎ ایضاً ص۱۵۱۔

یا اسلام کی مداخلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔

جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ اسلام میرا مذہب ہے اسلامی تاریخ اور علوم و فنون میرا سرمایہ ہے تو ہم اتنا بتادیں کہ اسلام کو نقصان پہنچانے والوں نے ہمیشہ ایسا ہی دعویٰ کیا ہے ۔ امیر معاویہ کے پاس معروف چند تمام اسلامی دنیا کے علما و وقت کے فتاویٰ تھے جب انھوں نے یزید کو خلیفہ مقرر کیا تھا عثمانیہ ترک کی فوجوں کے خون سے مسجد حرم کو لالہ زار بنانے والے بھی اسلام کے دعویدار تھے اور عقیدے کے اعتبار سے مسلمان تھے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میرا عقیدہ اسلام ہے اور اس کی وجہ سے راہ حق پر ہونے کا سرٹیفکٹ مل جائے گا ۔ جن لوگوں کے خلاف مولانا نے محاذ بنایا وہ بھی عقیدے کے اعتبار سے کافر و مشرک یا یہودی نہ تھے بلکہ کلمہ گو تھے اور اسلام ان کا بھی ایسا ہی مذہب تھا جیسا کہ مولانا آزاد کا ۔

"گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے ۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری ہمارا ادب ہماری معاشرت ہمارا لباس ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں ہم ایک زبان بولنے لگے ۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر دیا ۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا ۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں ۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر زندہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں تو بہتر ہے کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال

دیا ہے۔ ایسے سانچے قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔۔۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔۔۔"[1]

اس متحدہ قومیت کے پرخچے کس نے اڑائے اسی کانگریس نے جو مولانا کو مسلم مفاد سے زیادہ عزیز تھی خود مولانا کی زندگی میں ہزاروں فسادات ہوئے۔ مشترکہ زبان اردو کا جنازہ مولانا کی وزارتِ تعلیم کے دور میں ہی نکالا گیا۔ حیدرآباد پولیس ایکشن میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، نوکریوں کا دروازہ مسلمانوں پر بند کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے ایسا ہو گیا ورنہ مشترکہ زبان اردو بھی اور رہتی یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ اردو کو ہٹانے کی تحریک ۱۸۶۷ء سے ہی شروع ہو گئی تھی جبکہ ملک کو باقاعدہ غلام ہوئے صرف دس سال کا عرصہ گزرا تھا۔ غلام ہندوستان تک میں اردو کو ہٹانے کی تحریک بہت زور شور سے چلی اور کئی صوبوں میں کامیاب بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۹ء کی نہرو رپورٹ تک مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں بالکل خاموش ہے اور بہت سے تاریخی حقائق ہیں جو پاکستان بننا تو دور کی بات ہے تصورِ آزادی سے بھی بہت عرصہ پہلے ہی اس طرف اشارہ کر رہے تھے کہ آئندہ کیا ہونا ہے۔ اگر برائے بحث یہ مان لیا جائے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ اگر وہ نہ بنتا تو ایسا نہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شورش پسند طبقہ الگ ہو گیا اور یہاں سے چلا گیا اب تو اور آرام سے مشترکہ سرمایہ کو بڑھاوا دیا جا سکتا تھا۔ اگر وہی اس کے سنگ گراں تھے تو خدا نے خود بخود اس کو ہمارے راستے سے ہٹا دیا تو بھی ہم کیوں ایسی مشترکہ قومیت کی تعمیر میں ناکام رہے؟ بلکہ سکھ قوم کا قضیہ اور شروع ہو گیا۔

---

[1] ایضاً ۱۵۶۔

جامع مسجد کی تقریر

مولانا آزاد نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی میں بروز جمعہ نمازیوں سے خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر بہت شہرت یافتہ ہے اور مولانا کی سب سے مشہور تقریر مانی جاتی ہے۔ ہم مندرجہ ذیل سطور میں اس تقریر کا ایک تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے لاہور رزولوشن (جو قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہے) میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک کے تین حصے کیے جائیں مشرق اور مغرب میں مسلم اکثریتی علاقوں کو الگ الگ انتظامی حصوں میں تقسیم کیا جائے اور بیچ کے ہندو اکثریت کے علاقہ کو تیسرا حصہ تسلیم کیا جائے۔ ان تینوں حصوں میں ہندو مسلم اقلیت کو معاشی تعلیمی اور ثقافتی ومذہبی ترقیات کے تمام مواقع فراہم کیے جائیں اور دستوری تحفظات کے ذریعہ اقلیتوں کی ترقی کی گارنٹی دی جائے۔ سات طویل سالوں کی تلخ سیاست اور کانگریس اور مسلم لیگ کے ٹکراؤ کے بعد بالآخر ملک کی تقسیم کے اصول کو برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں جماعتوں نے تسلیم کر لیا۔ اس فیصلہ میں اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ ہندو اقلیت پاکستان سے بھارت آجائے اور بھارت سے مسلم اقلیت پاکستان چلی جائے۔ لیکن اقتصادی مواقع کی تلاش اور پنجاب میں مسلم سکھ مفاد کے ٹکراؤ کے باعث بڑے پیمانے پر ہندو مسلم اور سکھ آبادی کا تبادلہ ظہور پذیر ہوا۔ نتیجۃً فسادات کی بھیانک گرم آندھی نے پورے پنجاب اور شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان فسادات کے سبب وقتی طور سے تبادلۂ آبادی رک گیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے ایسے حالات میں جب ہندو اور مسلمان تعلقات بہت زیادہ خراب تھے اور ملک کی

فضا تعصب اور فرقہ پرستی سے گندی ہو رہی تھی، مولانا آزاد نے جامع مسجد میں مسلمانوں سے خطاب کیا۔ بہت سی تقریروں کے ساتھ ساتھ مولانا کی یہ بھی ایک عام تقریر سمجھی جاسکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ جن خیالات کا اظہارِ مولانا نے اس تقریر میں کیا وہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قوم پرور نقطۂ نظر کی بھرپور عکاسی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس تقریر کو بہت اہمیت دی جاتی ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ مولانا آزاد جن کو آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کا مسیحا بنایا جاتا ہے، نے تاریخ کے انتہائی اہم موڑ پر کس طرح مسلمانوں کی رہبری کا حق ادا کیا۔ فرمایا۔

"آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے..... آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی حتی کہ پچھلے چند سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں ہر خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انھیں خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔"

تقسیم کی ذمہ داری

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب "ہماری آزادی" میں کیبنٹ مشن پلان کی ناکامی کا ذمہ دار سراسر جواہر لال نہرو کو قرار دیا ہے۔ اس پلان کے تحت ملک کو متحد رکھنے کی سبیل نکل آئی تھی۔ مسلم لیگ نے مطالبۂ تقسیم کو رد کرکے اس پلان کو منظور کر لیا تھا۔ کانگریس نے بھی اس پلان کو منظور کر لیا تھا۔ تمام دنیا سے مبارکباد کے پیغامات آرہے تھے کہ ہندوستان کی لیڈران نے ایک اہم مسئلہ کو باہمی گفت و شنید سے حل کر لیا ہے۔ لیکن جواہر لال نہرو نے جس طرح چند ہی دنوں کے اندر اس پلان کو ناکام بنا دیا اس کو مولانا اور دوسرے مورخین نے بدنصیبی اور دغا سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے واقعات پیش آنے کے بعد ہی مولانا نے جامع مسجد میں مسلمانوں سے خطاب

کیا۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان تمام حالات کو جاننے کے باوجود مولانا نے مسلمانوں کو ہی صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا بنایا۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ جو حق تھا وہی کہا جاتا۔ اس کے برخلاف مولانا نے مسلمانوں کو ہی تقسیمِ وطن کا ذمہ دار قرار دے کر ان میں احساس جرم پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس اقتباس سے ایسا لگتا ہے کہ ایک شخص غرور کے نشے میں چور متغیر سامعین کو خطاب کر رہا ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا بس ہاتھ اٹھا کر دعا ہی کرنے والے ہیں کہ اے خدا تو انھیں غارت کر دے کہ انھوں نے میری نہیں سنی۔

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی۔۔۔۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں"

قراردادِ پاکستان کے بموجب دہلی کبھی بھی پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ دہلی یا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے کچھ ملنے والا تھا تو یہ سمجھنے والے کی غلطی ہے لیکن اقلیتوں کے لیے دستوری تحفظات کا مطالبہ خود اس قرارداد میں موجود ہے۔ لہٰذا سہارا چھوڑنے کی بات سرے سے ہی غلط ہے اور پھر ۱۸۸۵ء سے ہی مسلمانوں کے حقوق کی علمبردار کانگریس ملک میں تھی اور خود مولانا آزاد موجود تھے جن کے نزدیک اقلیت و اکثریت کا سوال سرے سے ہی بازیگر کا کھیل تھا۔ کیا مسئلہ مسلمانوں کو پیش آسکتا تھا جبکہ ہندو مسلم سکھ وغیرہ ایک ہی قوم تھے؟ کیا کانگریس نے ایک قوم کے نظریہ کو پاکستان بننے کے بعد ترک کر دیا تھا؟ آخر مولانا اپنی موجودگی میں مسلمانوں کو لاوارث کیسے کہہ سکتے تھے؟

انگریزوں کی غلامی

"انگریزی کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بت بھی تمہیں دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔"

یعنی مسلمان انگریزوں کی حکومت چاہتے تھے انگریز ہندوستان سے مسلمانوں کی خواہش کے برخلاف واپس جا رہا تھا۔ یہ بہت عجیب تر الزام ہے۔

مولانا نے اس تقریر میں بار بار مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بتایا ہے گھما پھرا کر کئی مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت چاہتے تھے۔ یعنی مسلمانوں کا ملک کی آزادی حاصل کرنے میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایسا سنگین الزام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر لگانا مولانا آزاد کا ہی کام تھا۔ مسلمانوں کی آزادی حاصل کرنے کے لیے شاندار قربانیاں ہیں۔ یہ بات کٹر ہندو فرقہ پرست بھی مانتے ہیں

الہلال میں شائع ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے پھر مسلمانوں کو آزادی کا دشمن قرار دیا۔

"ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا؛ جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے۔ اگر تم نے تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا ہوا کرتا ہے"۔

امام الہند مولانا آزاد آخر بلا وجہ امام الہند نہیں ہو گئے اس کی کچھ بہت ہی خاص وجہ ہے۔ مسلمانوں کو منحوس کا لقب مولانا ہی دے سکتے تھے اور وہ بھی خود مسلمانوں کے سامنے حسرت موہانی، محمد علی جوہر، شوکت علی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی بے مثال قربانیاں بھی مولانا بھول گئے۔ حسرت موہانی نے ۱۹۲۱ء کے کانگریس سیشن میں جب مکمل آزادی کا رزولوشن پیش کرنا چاہا تو گاندھی جی نے کہا کہ "مولانا ہمیں ایسے پانیوں میں لے جانا چاہتے ہیں جن کی گہرائی کا اندازہ نہیں" محمد علی جوہر نے انگلینڈ میں گول میز کانفرنس میں اعلان کیا کہ میں غلام ہندوستان واپس جانا پسند نہیں کرونگا۔ خدا نے ان کی لاج رکھ لی۔ انکا وہیں انتقال ہوا اور بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ یہ خلافت کانفرنس ہی تھی جس نے سب سے پہلے انگریز حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ملک کی آزادی کی آگ بھڑکائی ورنہ ہندوستانی انگریزوں سے مقابلہ آرائی سے بالکل ناآشنا تھے اور ہمت نہ ہوتی تھی کہ مقابلہ کریں۔ اس وقت تک کانگریس وفاداری کے رزولوشن پاس کرتی رہی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ مولانا اس تاریخ سے ناواقف رہے ہوں گے بلکہ جان بوجھ کر مسلمانوں کے دلوں سے باعزت اور برابری کی زندگی کا تصور نکال دینا چاہتے تھے۔

انکا خیال تھا کہ ملک ہندوؤں کی خوش نصیبی سے آزاد ہوا ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے ملک کی خوشیوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے حقوق کی آواز بلند کرتے، یہ فرمایا کہ مسلمانوں کا حصہ ہی نہیں ہے کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی چاہتے تھے۔

ہندوؤں کا حق

"یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے"

مسلمان اگر خوفزدہ تھے تو انھیں سہارے اور دلاسہ کی ضرورت تھی نہ کہ الزام تراشیوں اور لعنت ملامت کی لیکن مولانا نے ایک بار پھر کہا کہ مسلمان غیر ملکی غلامی چاہتے تھے اور وہ حاکموں کی طمع کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔

ہاں تمہاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے کو ہی نجات مادی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھ میں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔"

قوم کے کچھ افراد کی نسبت یہ الزام لگانا کہ وہ غلامی چاہتے تھے کہ ان کو اسی میں فائدہ تھا ایک الگ بات ہے لیکن پوری قوم کو غلامی پسند قرار دینا مولانا کا ہی کام تھا۔

"مجھے سات برس کی رو داد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے البتہ ہندوستانی مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں میں پہلے ہی دن سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔"

ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کن کن وجوہات کی بنا پر ہے یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اگر مولانا کی نظر پہلے ہی سے ان حالات پر تھی تو غالباً آج کے حالات پر بھی ان کی نظر رہی ہو گی۔ اگر اس وقت مسلم لیگ ذمہ دار تھی تو آج کون ذمہ دار ہے؟ کیا یہ کہا جائے کہ مولانا آزاد ذمہ دار ہیں؟ اقتصادی ترقی کے دروازے مسلمانوں پر بند ہیں، ان کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں ان کو

نوکریاں نہیں دی جائیں اور آئے دن کے فسادات نے ان کی کمر توڑ کر رکھدی ہے۔ سرکاری ایجنسیاں جیسے پولیس اور پی اے سی وغیرہ کھل کر اینٹی مسلم فسادات میں حصہ لیتی ہیں یہ سب کس کی حکومت میں ہو رہا ہے؟ اسی کانگریس کی حکومت میں ہو رہا ہے جس کی انصاف پسندی کے مولانا معتقد تھے بلکہ مولانا نے کانگریس کا اعتماد مسلمانوں میں قرآن وحدیث کے ذریعہ پیدا کیا۔ خود مولانا کے سامنے ہی جبل پور میں مسلم کش فسادات ہوئے، اردو ختم کی گئی اور مولانا نے اپنا "سر ہندی کے آگے جھکا دیا"۔ نمازیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا اور کیا کیا نہ ہوا مولانا کی کانگریس کی حکمرانی میں؟

"اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے اب یہ ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں سوچ بھی سکتے ہیں یا نہیں"۔

ملک کی تقسیم کی ذمہ داری مسلمانوں پر صرف اسی لیے جان بوجھ کر ڈالی جاتی ہے کہ وہ کہیں پھر سے اپنے مطالبات کے لیے مسلم لیگ یا اپنی دوسری جماعتیں نہ بنالیں۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ اب مسلم لیگ کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے، حقیقت سے منہ موڑنا ہے۔ اس وقت بھی جس وقت مولانا تقریر فرما رہے تھے مسلم لیگ کے ممبر کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں موجود تھے۔ مولانا محمد اسماعیل خاں صاحب کی اسمبلی کے اندر تقاریر موجود ہیں انھوں نے پہلے ہی دن سے اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے حقوق کی جنگ چھیڑ دی تھی۔ خاص طور سے جداگانہ انتخابات کے مسئلہ پر سردار پٹیل سے ان کی جھڑپیں ہوئیں۔ یہ سب ریکارڈ میں موجود ہیں کوئی کہی سنی بات نہیں ہے۔ پھر اسی مسلم لیگ سے جنوبی ہندوستان کی کئی ریاستوں میں کانگریس نے اتحاد کیا اور ایک عرصہ تک کیرالہ میں ساجھا حکومت کی جہاں مسلمانوں کو پسماندہ قرار دیا گیا اور ان کے لیے ١١٪ گیارہ فیصد رزرویشن تمام سروسز اور تعلیمی اداروں میں آج بھی جاری ہے لہٰذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ کے لیے ہندوستان میں جگہ نہیں غلط ہے۔ مسلم لیگ ایک دن کے لیے بھی ہندوستان سے ختم نہیں ہوئی ہاں البتہ شمالی ہندوستان سے یہ پارٹی ضرور ختم کردی گئی، اس وجہ سے کہ مولانا آزاد اور جمعیۃ العلماء کا اس علاقہ میں پاکستان بننے کے بعد کوئی مدِ مقابل نہ رہا۔ لیکن یہ صورتِ حال کچھ سالوں تک رہی اور ١٩٦٩ء میں میرٹھ میں پھر سے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور نوجوانوں کے طبقہ نے اس کی آواز پر لبیک کہا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ چودھری چرن سنگھ نے بحیثیت وزیرِ اعظم مسلم لیگ سے الیکشن الائنس کیا اور مسلم لیگ کے نمائندے کے لیے ہی دہلی جامع مسجد کے سامنے مسلمانوں کو خطاب کیا اور ووٹوں کی اپیل کی کہ چاندنی چوک پارلیمانی حلقہ سے مسلم لیگ

کے امیدوار کو ووٹ دیں۔ یہ ہے تاریخ کا فیصلہ جس نے مولانا کے دعوے کو غلط ثابت کر دکھایا۔

ہجرت غلط ہے

"یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم کو یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

مولانا کا یہ مشورہ بہت قیمتی اور بہت سودمند تھا یقینی طور سے حالات سے گھبرا کر مسلمانوں کو ترکِ وطن نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مولانا کی اس اپیل کا دہلی کے مسلمانوں پر اثر بھی ہوا۔ حالانکہ فسادات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ نے کسی بھی طرح کے سفر کو ناممکن بنا دیا تھا پھر بھی مولانا کی تقریر کا اثر دہلی کے مسلمانوں پر ہوا اور بہت سے لوگوں نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔

"عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں رہ سکتے۔۔۔ سچے مسلمانوں کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔"

تقریر کے اس حصہ میں ضرور ایسا لگتا ہے کہ کوئی مسلمانوں کا ہمدرد ان سے مخاطب ہے اور بہت سمجھداری کی باتیں مولانا نے مسلمانوں کو بتائیں۔ آخر پاکستان سے باقی مسلمانوں کو کیا مطلب ہو سکتا تھا لوگ خوانخواہ ہی امیدیں باندھ کر اس ملک میں جا رہے تھے جو ان کے لیے بنا ہی نہ تھا۔ یہ مطالبہ ہی نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان بنوایا جا رہا ہے۔ بلکہ ایک سیاسی جماعت نے مسلم اکثریتی علاقوں کو الگ ملک بنانے کی تجویز رکھی تھی جو اتفاقِ رائے سے مان لی گئی۔ اس تجویز میں اقلیتوں کے لیے قانونی گارنٹی کی بات بھی کہی گئی تھی۔ سو قانونی گارنٹی ملی ہی تھی اس لیے خوف اور ہراس واقعی بیجا تھا اور مولانا نے صحیح وقت پر مناسب تلقین مسلمانوں کو کی۔

کچھ دیر اچھی اچھی باتیں کرنے کے بعد مولانا نے پھر سے مسلمانوں پر انگریز پرستی کا الزام لگایا:

"میں تمہیں نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔"

یعنی مسلمان انگریزوں کے دور میں کاسہ لیسی کر رہے تھے۔ مسلم قوم نے کبھی بھی کاسہ لیسی نہ کی بلکہ ہمیشہ بے انصافی اور ظلم کے سامنے سینہ سپر رہی آزادی کے بعد بھی اور پہلے بھی ہاں آزادی کے بعد قوم پرور قائدین نے مزور کاسہ لیسی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ہزاروں واقعات بھارتی مسلمانوں پر ظلم اور نا انصافی کے ہوئے لیکن مولانا آخر وقت تک وزیر بنے رہے اور ایک بار بھی احتجاجاً وزارت چھوڑنے کی دھمکی تک نہ دی۔

مسئلہ نشاۃ و تجدید

ملت اسلامیہ کو پستی اور ادبار سے نکالنے کے لیے مختلف مصلحین نے اپنے اپنے طریقے سے کوششیں کیں اور حل پیش کئے۔ اس مسئلہ کا حل مولانا کے پاس کیا تھا ہم یہاں اس کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں تین مختلف مذاہبِ اصلاح موجود ہیں۔ پہلے مذہب یا طریقہ کو وہ اصلاحِ فرنگی سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ فرقہ ان کی نظر میں وہ ہے جس نے یورپ کی ترقی اور چمک دمک کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا اہل یورپ اور عیسائیوں کی تقلید و اطاعت میں مسلمانوں کے احیاء کا خواب دیکھا۔ جمیعۃ العلماء ہند کے لاہور اجتماع میں جو نومبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:

"جب یورپ کے ہوش ربا تمدن کا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا تو دو مختلف اثرات جماعتوں پر مرتب ہوئے غالب جماعت نے تو اپنی غفلت اور جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی۔ لیکن ایک جماعت اربابِ بنیش و جزم کی تھی جس نے فوراً تغیرِ احوال کو محسوس کیا۔ اپنی پستی و کمزوری اور جلوے کی نظر فریبی و ہوشربائی کی وجہ سے یہ اول نظر مرعوب و مسحور ہوگئی اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے متبعین اور مقلدین ٹرکی میں سلطان محمود خاں اور اس کے

عہد کے وزرا، وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔" ؎۱

یورپ کی تقلید کا الزام جس انداز سے مولانا آزاد نے سرسید پر لگایا ہے وہ یقینی طور سے درست نہیں ہے سرسید یورپ کی تقلید نہیں بلکہ یورپی علوم وفنون سائنس و ٹکنالوجی کو مسلمانوں میں رائج کرکے ان کو دنیا کی سربلند قوموں کی برابری عطا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ دنیا کی کوئی قوم بغیر علوم وفنون پر مہارت حاصل کئے ہوئے عزت یافتہ نہیں ہو سکتی اور اطاعت کا جہاں تک تعلق ہے اطاعت ہتھیاروں اور علم کی طاقت سے کرائی جاتی ہے اور جاہل وغیر تربیت یافتہ قومیں ہمیشہ محکوم رہی ہیں آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ مقابلہ و مقاومت خالی دماغ اور فرسودہ ہتھیاروں سے نہیں ہو سکتا تھا ایک زمانے سے اپنی برتری کھو چکے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے ہاتھوں سے صدیوں پرانی حکومتیں انگریزوں اور دیگر یوروپی اقوام کے ہاتھوں میں کیوں جاتیں؟ لہٰذا سرسید نے مسلمانوں کے لیے علم و ہنر حاصل کرنے کو ضروری قرار دیا۔ اور آج زمانہ ان کی فہم و فراست کا قایل ہے اور ہندوستانی مسلمان کا سر سید کے بار احسان سے جھکا ہوا ہے۔

مولانا آزاد کی نظر میں دوسرا گروہ، اصلاحِ سیاسی، کے طریقہ پر کاربند ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک سیاسی اصلاح اور پولٹیکل طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آئے ان کی فلاح کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ تیسرا گروہ، اصلاحِ دینی واسلامی، پر یقین رکھتا ہے کہ اس طریقہ سے مسلمان عزت یافتہ ہو جائیں گے درحقیقت یہی گروہ ہے جسے مولانا صراطِ مستقیم پر مانتے ہیں۔ پہلے دو نظریات 'تعلیمی ترقی اور سیاسی اصلاح' مولانا کی نظر میں غلط ہیں:

"فی الحقیقت مسئلہ اصلاح میں یہی گروہ اصحاب رشد و ہدایت اور سالکینِ جادۂ اقتصاد وحق رہا ہے۔" (ایضاً)

مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے الہلال اسی مقصد سے جاری کیا اور اسی

؎۱ (خطبات آزاد صفحہ ۱۰۹)

مقصد کے حصول کے لیے جمیعۃ العلمار ہند وجود میں آئی۔ دعوے میں اور عمل میں تضاد کافی واضح ہے۔ کیونکہ جمیعۃ العلمار ایک نیم سیاسی جماعت رہی ہے۔ اور اس کے مقاصد میں مسلم لیگ کے نظریات کی مخالفت کا عنصر ہمیشہ بنیادی نظریہ رہا ہے اور اس جماعت نے ہمیشہ وطن کو قوم کی اساس قرار دیا۔ دین و مذہب کی تبلیغ کبھی بھی اس جماعت کا مقصد نہیں رہا بلکہ یہ جماعت کانگریس کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی تاکہ مسلمان جو مذہب کے نام پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اس کو کچھ دینی عالم بسبب اپنے علم کے کانگریس کے نظریہ نیشنل ازم کی طرف مائل کر سکیں۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی مقصد ہے جس پر یہ جماعت آج تک کاربند ہے: جمیعۃ العلمار کے تیسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمیعۃ العلما، جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسفِ مقصود ہے جس کے فراق میں ۱۹۱۱ء سے متصل " واسفا علیٰ یوسف " کی فغاں سنجی کر رہا ہوں..... ۱۹۱۱ء سے آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔"[۱]

اسی خطبہ میں اس نظریہ کا بھی اظہار کیا کہ مسلمانوں کو تجدید کی ضرورت ہے تاسیس کی نہیں۔ تجدید کے معنی یہ ہیں کہ پہلے سے موجودہ چیزوں کو صحیح حالت میں کر لیا جائے اور تاسیس کے یہ معنی ہیں کہ نئے علوم اور نئے طریقے سیکھے جائیں۔ مولانا نے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اس کی ضرورت ہے کہ از سر نو نئی باتیں نئے طریقے نئے ڈھنگ نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں یا صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک کارخانۂ ملت موجود ہے جس کو اپنی بقاو ترقی کے لیے کسی نئی بات کی

---

[۱] (خطبات آزاد ص ۱۱۴)

احتیاج نہیں مگر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور بہت سی باتیں بڑھا دی گئی ہیں بس ضرورت اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کر دی جائیں. کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں اور اس کو ویسا ہی بنا دیا جائے جیسا کہ وہ اصل میں تھا... ،،

نئے نظام اور نئے طریقے تو آج کی دنیا کی خصوصیت ہیں ہر روز نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں سائنس ٹکنالوجی نے ناقابل یقین ترقی کر لی ہے. ان علوم اور نظریات کو جانے بغیر آج کوئی بھی قوم دنیا میں عزت سے نہیں رہ سکتی پہلے سے جو کارخانۂ ملت موجود تھا اس کی حالت کا بھی سب کو اندازہ ہے نہ صرف ۱۹۲۰ء کے آس پاس بلکہ آج کے دور میں بھی جبکہ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے وہی پرانا شخصی حکومتوں کا نظام فرسودہ طریقۂ تعلیم اور ہر نئی اور ترقی یافتہ چیز کو پہلے ٹھکرانے اور بعد میں اپنانے کی ادا. آخر اسی تعلیم کو جس کو سرسید مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے. جس پر مکہ و مدینہ تک سے سرسید کے واجب القتل ہونے اور کفر کے فتوے لائے گئے آج اسی مکہ و مدینہ میں نہایت عالی شان اور موڈرن یونیورسٹیاں قائم کی جا رہی ہیں. بڑی بڑی تنخواہیں دے کر دنیا بھر سے عالموں کو لایا جاتا ہے کہ للّٰلہ ہماری نسلوں کو پڑھاؤ کہ یہ جاہل رہی جاتی ہیں اور ان علماء کا نام و نشان تک نہیں جو اب نئی تعلیم کی مخالفت کر سکیں. ان کے فتوے اور ان کے افکار حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے. سرسید کے سو سال کے بعد اب ان کی سمجھ میں نئی تعلیم اور سائنس کی اہمیت آئی حالانکہ قرآن جگہ جگہ یہ حکم دیتا ہے کہ غور کرو تفکر کرو اور کائنات کو تسخیر کرو. مگر نہ قرآن کا حکم مانتے ہیں اور نہ عقل کا. وقت گذر جانے کے بعد جو انسان صحیح بات کو مانے عقلمند نہیں کہلا سکتا. ایک طبقہ ہمیشہ سے ہی ایسا موجود رہا ہے جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے اور اس عمل کے لیے وہ قرآن اور اسلام کا حوالہ دیتا ہے اور اسوہ رسول اللہؐ سے دلیلیں لاتا ہے:

،، منجملہ ان عظیم ترین اختلافات کے جو مجھ میں اور کارفرمایان عمل میں ہیں

ایک اصولی اختلاف ہے کہ وہ آج جب کبھی کسی کام کے لیے اٹھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ راہِ تاسیس اختیار کریں اور میں اللہ کی بخشی ہوئی بصیرت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے ان کے اعمال ملی میں سے کسی شاخ کے لیے بھی تاسیس کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ صرف تجدید کی اور اس بارے میں اس درجہ متعصب اور متقشف ہوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی رائے میں متزلزل نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً)

تاسیس کے خلاف اس وقت کے علماء بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ نہ جانے کیوں نئے علوم اور نظریات سے یہ لوگ اتنا ڈرتے ہیں اسلام کو اتنا بودا کیوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سائنس نظریات کے آگے ٹک نہیں سکتا۔ حالانکہ اسلام تو ہمیشہ ہی ہر زمانہ میں کسی بھی نئے فلسفہ کے مقابلہ میں سربلند رہا ہے۔ نئی سائنس و تعلیم اسلام کی حمایت کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ سب حقائق تو دینی علماء بھی جانتے ہیں لیکن پھر بھی دینی مدارس میں سائنس انگلش و ہندی رائج کرنے پر رضامند نہیں ہیں اس کی وجہ حمیتِ اسلامی نہیں ہے بلکہ ان مضامین کے اضافے کے ساتھ ساتھ مدرسوں کے ایڈمنسٹریشن میں بھی دوسرے لوگوں کو دخل دینے کا موقع ملے گا اور صدیوں سے چلی آرہی موروثی نظامت کے ختم ہونے کا ڈر پیدا ہو جائے گا لہٰذا اسلام کی حفاظت کا نعرہ بلند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں صرف عبادات کر لینے اور دعائیں مانگنے سے ہی مسلمانوں کو دنیا میں عزت مل سکتی ہے۔ بیشک اگر خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات فطرتِ اللہ کے خلاف ہے جس عمل میں جو تاثیر ہے اس کا وہی اثر ہوگا دوسرا نہیں۔ نماز فرض ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ پڑھیں نماز اور پیدا ہو جائے گیہوں کی کوئی نئی ورائٹی۔ نماز کا اثر اپنی جگہ ہے اور ریسرچ کا نتیجہ اپنی جگہ۔ مولانا آزاد نے غیروں کی تقلید کی مخالفت میں فرمایا:

"دین کامل ہو چکا اور اتمام نعمت کا اعلان کر دیا گیا..... اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ اصلاحِ ملت اسلامیہ کے لیے قرآن و شریعت کی تعلیمات و نظامات کافی نہیں ہیں

اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ بس یہ امر تو متفق و مسلم ہے کہ راہِ اصلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے تاسیس کی نہیں[1]

غیروں کی تقلید کا نظریہ بھی خوب ہے ایک مشہور حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ علم اگر چین میں حاصل ہو تو اس کو حاصل کرو۔ گویا یہ بھی غیروں کی تقلید کا حکم ہے۔ نئی دریافتوں سے فائدہ اٹھانے میں سب برابر شریک ہیں اور اس وقت غیروں کی تقلید کا سوال نہیں پیدا ہوتا مگر جب کوئی کہتا ہے کہ ان کے علوم و فنون محنت کر کے سیکھو تو تقلید کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اکثر دینی علماء کی نظر میں مسلمانوں کا مقصد آگے بڑھنا نہیں ہے بلکہ پیچھے ہٹنا ہے تاکہ مسلمان صحابہؓ جیسے ہو جائیں اور یہ بات ہمیشہ سائنس اور نئی تعلیم کے خلاف استعمال کی جاتی ہے گویا خدانخواستہ صحابہ کرامؓ دنیا سے ایسے ہی ناواقف تھے جیسے کہ ہم ہیں۔ مولانا الہلال میں لکھتے ہیں:

"ہم کو اپنے کاموں میں چاہیئے کہ گذشتہ اصولوں کو زندہ کریں ہم کو نئے مقصدوں کی ضرورت نہیں ہے ہم کو نئی صداؤں کی احتیاج نہیں ہم کو آگے نہیں بڑھنا ہے بلکہ پیچھے ہٹنا ہے ...... نئے ولولوں اور نئے تماشوں کا بھی ہم نے تجربہ کر لیا اب ہم اکتا گئے ہیں اور زیادہ تجربہ کی ہم میں سکت نہیں ہمیں چھوڑ دو تاکہ اپنی قدیم وحشت کی ایک ادنیٰ ادا پر تمہاری نئی دلفریبیوں کو قربان کر دیں،،[2]

لفظ قدیم وحشت خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔ مسلمانوں کو کبھی وحشت نہیں رہی بلکہ وہ بہت سمجھدار، سنجیدہ اور کارخانۂ حیات کو سمجھنے والے اور اپنے زمانے میں بڑی بڑی سائنسی دریافتیں کرنے والے تھے۔ اور ہم آج قدیم وحشت کا ذکر کر کے ان کی دانشمندی اور اقبال مندی کی توہین کرنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ محض جذباتی تھے اور تلوار چلانا جانتے تھے علوم اور صنعت و حرفت سے کچھ ان کو تعلق نہ تھا۔ آج ضرور اسلام کے نام لیوا مسلمانوں کو بہکانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور سائنس اور دیگر علوم کو اسلام کے مخالف سمجھا جاتا ہے

---

[1] (خطبات آزاد صفحہ ۱۲۷) [2] (الہلال جولائی ۱۹۱۳ صفحہ ۸۵)

مگر خدارا اپنے بزرگوں کو تو بدنام نہ کرو۔ وہ ایسے نہ تھے ہاں مگر ہم نے اسلام کو بدنام کر دیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اسلام ہر طرح کی ترقی اور خوشحالی کے خلاف ہے ضرورت ہے کہ سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ معاملات پر غور کیا جائے اور مسلمانوں کی ترقی کی راہیں تلاش کی جائیں کہ اسی میں اسلام کی ترقی ہے سرسید نے فرمایا کہ :

> "اگر تمام مسلمان مفلس ذلیل اور نان شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے تو اسلام کی کیا عزت باقی رہے گی؟ نیک عالم اور درویش جو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں وہ خدا کی طرف ایسے متوجہ ہیں کہ ان کو دنیا کی باتوں پر اور عواقب امور پر کچھ خیال نہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر مسلمانوں کو دنیاوی علوم اور دنیاوی دولت و حشمت کی عزت حاصل ہو گی تو اس سے خود اسلام کی کیسی رونق اور شوکت ہو جاویگی" ؎۱

سرسید مسلمانوں کے لیے راہِ تاسیس کو پسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اسلام کی حمایت بغیر مروجہ علوم پر فتح پائے کامیابی کے ساتھ نہیں ہو سکتی لہذا انہوں نے تمام زندگی مسلمانوں میں سائنس اور نئے علوم کے رواج دینے میں صرف کر دی راہِ تاسیس سے دینی علماء خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں ان کے خیال میں نئے علوم اور سائنس کی تعلیم طلباء کے عقائد میں خرابی پیدا کر دیتی ہے اور وہ گمراہ ہو جاتے ہیں لہذا بڑے بڑے مدارس جیسے ندوۃ العلماء لکھنؤ تک میں انگریزی زبان سائنس اور ریاضیات کے بنیادی مضامین تک شاملِ نصاب نہیں ہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی علی گڑھ کے طلباء کی گمراہی کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

> "مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی معاشرت و تمدن میں انگریزی طور طریقوں کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل" ؎۲ اور ندوۃ العلماء سے فارغین ولیوں اور نائبینِ رسولؐ کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

؎۱ (مجموعہ لیکچرز ۲۹۰) ؎۲ (ہندوستان میں مغرب و مشرق کی کشمکش ص ۹۵)

جمیعتہ العلماء ہند کا نظریۂ قومیت

نظریہ نیشنلزم جو زیادہ تر ممالک میں آج دنیا میں رائج ہے اس کی بنیاد مغرب میں پڑی یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ نظریہ خاص خلافتِ عثمانیہ کو پاش پاش کرکے چھوٹے چھوٹے ممالک میں بانٹ دینے کے لیے استعمال کیا۔ اسی نظریہ کے مقبول ہونے سے عربوں نے ترکوں سے بغاوت کی اور نتیجتاً مکہ معظمہ میں وہ شرم انگیز واقعہ پیش آیا جس میں شریف مکہ کے حامیوں نے ترک فوجوں کو خاص حرم شریف میں شہید کیا اور حرمت حرم کی حفاظت اور احکامِ شرع کی پابندی کرتے ہوئے ترکوں نے ہتھیار نہیں اٹھائے اور چپ چاپ حرمتِ حرم پر قربان ہو گئے۔ عربوں اور ترکوں میں اسلام کے رشتہ کو ختم کرکے عرب قومیت اور ترک قومیت کو ہوا دینے کا اہم کام ایک ایسے شخص نے کیا جو تاریخ میں لارنس آف اریبیا کے نام سے مشہور ہے یہ شخص حقیقتاً عرب یہودی تھا لیکن مسلمانوں کو دھوکا دینے اور ان میں نسلی امتیازات پیدا کرنے کے لیے بظاہر مسلمان بن گیا تھا اور اس وقت اس کا شمار دینی علماء کرام کی صف اول میں کیا جاتا تھا اسی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر اس نے یہ خیال عام کیا کہ رسول اللہؐ عرب تھے اور عرب قوم کا وقار ان کو زیادہ عزیز تھا۔ عرب دوسرے مسلمانوں سے افضل ہیں اور نسلی فرق کے سبب الگ قوم ہیں یہی نظریات ترکی میں بعد کو کمال اتاترک کے عروج کا سبب بنے۔ ہندوستان میں یہ نظریہ انگریز حاکم اپنے ساتھ لائے اور سرہیوم و لارڈ ڈفرن نے ان نظریات کی بنیاد پر ۱۸۸۵ء

میں نیشنل کانگریس قایم کی۔ کانگریس پورے ملک کے تمام باشندوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ اس اہم مسئلہ پر کہ آیا کانگریس کا نظریہ نیشنل ازم درست ہے ہندوستان کے علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ ایسا تھا جو نیشنل ازم کو قرآن و حدیث سے ثابت کر رہا تھا اور دوسرا گروہ اتنی ہی شدت سے اس نظریہ کو اسلام کے منافی قرار دے رہا تھا۔ پہلے گروہ میں جمیعتہ العلماءِ ہند پیش پیش تھی جس کے قائدین میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا آزاد، مولانا محمود الحسن وغیرہ اہم تھے اور دوسرے گروہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مودودی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں گروپ اپنے اپنے نظریات کی دلیل قرآن و حدیث اور اسوۂ رسول اللہؐ سے لاتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بحث مولانا حسین احمد مدنی اور علامہؒ اقبال کے درمیان چلی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے ایک مضمون میں اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں اور قوم کی بنیاد وطن ہے۔ علامہ اقبال کے دل پر اس بیان کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے ایک مضمون مولانا کے نظریہ کی مخالفت میں سپردِ قلم کیا۔ جو روزنامہ 'احسان'، لاہور بابت ۹ مارچ ۱۹۳۸ کو شایع ہو کر مقبولِ عام ہوا۔ اسی مضمون کو عبد الغفار شکیل نے اپنی کتاب 'علامہ اقبال کے نثری افکار' میں شامل کیا جو انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اس مضمون کے علاوہ ارمغانِ حجاز میں 'حسین احمد' کے عنوان سے ایک نظم بھی علامہ اقبال نے لکھی۔ اس کے تین اشعار مندرجہ ذیل ہیں

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ   ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است   چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال اس نظریہ کے شروع سے ہی خلاف تھے۔ یوروپ میں اپنی تعلیم کے دوران ان کو اس نظریہ کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے خیال میں یہ نظریہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے

اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے چنانچہ ان کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں بھی کامیاب ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں"

ہندوستان کے دینی علماء نے مغرب کی بہت سی چیزوں کو ٹھکرایا مثلاً ان کی سائنس، طرزِ معاشرت فلسفہ اور ان کی زبانیں، اسی کے ساتھ مغرب کی دوسری چیزوں کو بڑھ کر گلے سے بھی لگایا مثلاً مغرب کی مصنوعات ان کی ایجادات جیسے کاریں، ٹیلیفون، مائکروفون، نظریۂ وطنیت اور سیکولرازم وغیرہ وغیرہ۔ علامہ نے یورپ ہی میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ عیسائیت دین کو پرائیویٹ وانفرادی معاملہ سمجھتی ہے اس لیے اسٹیٹ سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا:

"مسیحیت نے یہ تعلیم دی ہے کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے اور یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ سبق دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے"

علامہ کو مولانا حسین احمد کے بیان میں فتنہ نظر آیا اور ان کے خیال میں مولانا خود بھی اس فتنے سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔

"جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے مولانا حسین احمد نے جو نظریہ قوم کے سامنے پیش کیا ہے امتِ محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے

لفظ قوم استعمال کیا یا ملت ؟ ہر اس لفظ سے جو ان کے تصور میں امت محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے"

مولانا حسین احمد نے اپنے بیان میں ملت اور قوم کو الگ الگ معنی میں استعمال کیا تھا علامہ کا خیال تھا کہ دونوں صورتوں میں یہ نظریہ مسلمانوں کے لیے خطرناک ہے اور ملک کی اکثریت کے حق میں جاتا ہے۔ اور مسلمان نقصان میں رہیں گے۔

"مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور دوسرا یہ کہ از روئے قوم اور ہو سکتے ہیں اس لیے مذہب کو چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ کا فرق ہے ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اور جس کے اختیار کے لیے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں"

علامہ کی نظر میں ملک و نسب اسلامی اخوت کا اسیر تھا۔ ان کے خیال میں اگر رسول اللہؐ کو وطنیت سے اتنی ہی محبت ہوتی تو وہ کبھی بھی ابوجہل وغیرہ سے مخالفت نہ مول لیتے اور بہ حیثیت عرب قومیت کے ان کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے۔ رسولؐ اللہ کے پیغام سے پہلے یقینی طور سے ایسا ہی تھا لیکن اسلام کے بعد قومیت اور نسلیت کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔

"اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسولؐ اللہ کے بعض اقارب اور ہم نسلوں و ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہو گئی ؟ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو محض ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بہ لحاظ قوم یا قومیت ابوجہل و ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قایم رکھی...... محمدؐ کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب

قوم کی حیثیت ثانوی ہو گئی اور جو لوگ رسولؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے پہلے وہ ملک و نسب میں گرفتار تھے اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا......... حضورؐ رسالت مآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپؐ ابولہب یا ابوجہل اور کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قایم رہو مگر اسی نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدۃ عربیہ قایم کی جاسکتی ہے اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخرالزماں کی راہ نہ ہوتی"

نظریہ وطنیت کے مقبولِ عام ہونے سے اب سارے عرب ورلڈ میں امتِ عربیہ واحدہ کا نعرہ ہر جگہ لکھا ہوا مل جائیگا اخباروں میں، کتابوں میں، راستوں پر، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر چاروں طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ امتِ عرب ایک ہے۔ اپنے وطن سے محبت ہونا ایک فطری بات ہے انسان جہاں پیدا ہوتا ہے پلتا ہے بڑھتا ہے اس جگہ سے اس کو ایک قلبی لگاؤ ہوتا ہے لیکن سیاسی بول چال میں یہ محبت ایک نظریہ ہے صرف جذبہ نہیں:

"عہدِ حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں پیش کرنے پر مجبور کر دیا جو قرآن یا نبیؐ امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں...... کیا خدا کی بارگاہ میں امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہئیتِ اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری، ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے؟"

علامہ اخوت انسانی اور تمام انسانوں سے برابر کی محبت کو ضروری سمجھتے تھے لیکن سیاست میں ان نظریات کا استعمال نظریۂ قومیت کو مضبوط کرنے کے لیے کیا جائے وہ اس فعل کو سراسر غیر اسلامی سمجھتے تھے اخوت انسانی اور عالمی برادری جیسے بڑے اور بھاری الفاظ سے علامہ مرعوب نہیں ہوتے تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی اسلام کی آدرش اسی پہلو سے کرتے تھے اور

آخر کار نظریۂ وطنیت کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش میں اپنے کو کامیاب سمجھتے تھے:

"مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدیر احسان سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ شرف انسانی اور اخوت بشری پر موسس ہے بہت سے مسلمانوں کے لیے تعجب خیز ہو گا لیکن میرے لیے چنداں تعجب خیز نہیں اس لیے کہ معصیت کی طرح گمراہی تنہا نہیں آتی جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ جذبہ غالب آجائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے"

مولانا آزاد اسی نظریۂ وطنیت کے خاص علمبرداروں میں سے تھے۔ اسی نظریۂ وطنیت کو بنیاد بنا کر جمیعۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا محمود الحسن کا مشہور بیان ہے کہ ہم سوئے ہوئے تھے مولانا آزاد نے ہمیں جگا دیا۔ اسی نظریہ کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ مولانا آزاد کو امام الہند کا خطاب دیا گیا۔ مولانا کی ہر تحریر و تقریر میں اس نظریہ کی وکالت ملتی ہے اور وہ اپنی تمام تر دلیلیں قرآن و حدیث سے لاتے رہیں:

"میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔ یہ اعتقاد قرآن کی نص قطعی پر مبنی تھا"

(خطباتِ آزاد صفحہ ۴۷)

اسی نظریہ وطنیت کے سبب ہندو اور مسلمانوں میں اس قدر یگانیت بڑھ گئی تھی کہ شردھانند کو بھی مسجدوں کے ممبروں پر باعزت طریقے پر بٹھایا گیا اور ان سے تقریریں اور وعظ دلوائے گئے۔ کیونکہ یہ تو اب قرآن کا حکم تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ کوئی فرق ہی نہ رہ جائے کم سے کم سیاست میں مگر پھر مذہب بھی اس کی زد میں آگیا کہ ہر دلیل قرآن سے دی جا رہی تھی:

"مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان کے ان مسلمانوں میں ہوں جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پالیسی مسلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان، ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہئیے کہ اتفاق کا قدم آگے بڑھائیں اور بائیس ۲۲ کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا" (خطبات آزاد صفحہ ۵۴)

یہ الزام بالکل غلط ہے کہ علی گڑھ کی پالیسی ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کی تھی سر سید سے زیادہ کوئی اس بات کا متمنی نہیں تھا کہ ہندو عیسائی اور مسلمان سب بھائی بھائی کی طرح رہیں اور انہوں نے اکثر ہندو مسلمان کو دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہہ دی لیکن سر سید سیاست میں ہندوؤں کی جماعتوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ملک کے امن کے اور مسلمانوں کے لیے نقصاندہ سمجھتے تھے۔

مولانا آزاد نے اسوۂ حسنہ حضرت محمدؐ سے دلیل لا کر اس نظریۂ وطنیت کو درست ثابت کرتے ہوئے کہا:

"حضور پیغمبر اسلامؐ کے اس اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا وہ نمونہ جو خود جناب سرورِ کائنات نے پیش کیا ہے اور علماؑ و حکماء جو تعلیم قرآن نے دی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں .... ہندوستان کے

سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندؤں کے ساتھ مل کر ایک نیشن بن جائیں۔" (خطباتِ آزاد صفحہ ۵۱)

یہاں مولانا نے رسول اللہ ﷺ کی مدینہ کے یہودیوں سے صلح کو دلیل بنایا ہے۔ صلح آشتی محبت اور یگانگت یہ سب بہت خوبصورت الفاظ ہیں اور ہر شریف انسان صلح چاہے گا لیکن کسی صلح کو بنیاد بنا کر ہمیشہ کے لیے مغربی نظریۂ وطنیت کو ثابت کرنا بالکل الگ بات ہے۔ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنی قیادت بھی ختم کر دی تھی اور کسی یہودی کے ہاتھ میں دیدی تھی؟ کیا صلح کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنا الگ وجود اور سیاسی تشخص ہی ختم کر دیا جائے؟ یہ تو ہمارے علماءِ دین کے خیالات تھے کہ وہ اتنا زیادہ وفاداری میں آگے بڑھ گئے تھے کہ دین و مذہب کو بھی غلط رنگ میں پیش کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ لیکن جواہر لال نہرو کا نیشنل ازم کے بارے میں کیا خیال تھا وہ خاص توجہ کے لائق چیز ہے۔ نہرو جی کا خیال تھا کہ ہندوستان میں نیشنل ازم کا چہرہ ہندوانہ تھا حالانکہ بہت سے مسلمانوں نے بھی جنگ آزادی میں حصہ لیا لیکن ہندوستانی نیشنل ازم پر ہندو حاوی تھے۔

THAT NATIONALISM HAD A STRONG APPEAL TO THE MUSLIM MIND IN INDIA AND LARGE NUMBER OF MUSLIMS HAD PLAYED A LEADING PART IN THE STRUGGLE FOR FREEDOM. YET INDIAN NATIONALISM WAS DOMINATED BY HINDUS AND HAD A HINDUISED LOOK. (DISCOVERY OF INDIA, P. 354)

خود گاندھی جی بھی قوم پرستی اور جذبۂ وطنیت کو دوسرے درجہ پر رکھتے تھے ان کے نزدیک ان کا دھرم پہلے تھا اور بعد کو وطن وہ پہلے ہندو تھے اور بعد میں قوم پرست بلکہ ملک میں دلچسپی وہ اپنے دھرم کی وجہ سے ہی لیتے تھے:

"ایک لحاظ سے میرا یہ کہنا صحیح ہے کہ میرا مذہب مجھے ملک سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ میں پہلے ایک ہندو ہوں اور بعد میں قوم پرست۔ اس وجہ سے میں کسی بھی قوم پرست سے کم تر نہیں ہوں۔ اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ

ملک کے بارے میں میری دلچسپی میرے مذہب کی دلچسپی سے الگ نہیں ہے"
(ینگ انڈیا صفحہ ۱۲۳ر ۱۹۲۲ء۔ بحوالہ: انتخابات از
گاندھی جی مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۶۹ صفحہ ۳۰)

مولانا آزاد کی ایک اور اہم خصوصیت کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے کہ مولانا پان اسلام ازم پر بھی یقین رکھتے تھے۔ خلافت کو بچانے کے لیے تمام دنیا کے مسلمان مولانا کی نظر میں ایک قوم تھے لیکن جب یہی دلیل ہندوستان کے مسلمانوں کے سلسلے میں دی جاتی تو مولانا کو سخت غصہ آجاتا تھا اس میں بھی دراصل ایک مطلب پوشیدہ تھا ورنہ مولانا کا اصلی نظریہ وہی نیشنل ازم تھا جو مغرب میں پلا بڑھا۔ پان اسلام ازم کے نظریہ کو مشتہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان خلافت کے جلسوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں اور خلافت کو ہندوستان کی جنگِ آزادی کے لیے استعمال کیا جائے۔ مولانا کے جتنے بھی خطبے خلافت کے پلیٹ فارم سے ہیں ان سب میں مولانا نے یہی تاثر دیا کہ "آپ کی تحریکِ خلافت، آزادی کی تحریک ہے یہ ایک مقصد ہے جو نتیجہ چاہتا ہے عمل چاہتا ہے" (خطبات آزاد صفحہ ۵۸)۔ خلافت کو بچانے میں مولانا کو بالکل دلچسپی نہ تھی بلکہ جب اتاترک نے خلافت ختم کردی اور خود مدبر بن گئے تو مولانا نے ان کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور مسلمانوں پر زور ڈالا کہ وہ اتاترک کو ہی خلیفہ مان لیں (حوالہ، تبرکاتِ آزاد: غلام رسول مہر صفحہ ۲۱) مولانا کا اس سلسلہ میں ایک مضمون بھی روزنامہ زمیندار لاہور میں اپریل ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا۔

خلافت کے پلیٹ فارم سے مولانا اسلامی قومیت پر زور دیتے تھے اور اس سے زیادہ مباح کوئی چیز نہ تھی لیکن کانگریس اور جمیعۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اس سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی چیز نہ تھی۔ الفاظ کا جوش پان اسلام ازم کی حمایت میں ملاحظہ ہو۔ انڈین نیشنل ازم کی حمایت بھی قرآنی دلیلوں سے ملاحظہ کی اب پان اسلام ازم بھی اسی قرآن سے ثابت کیا جارہا ہے:

"ملتِ اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء وجوارح ہیں اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ

نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس صدمے سے بےخبر رہیں، اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہار مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہور کا کہ جناب رسول کریمؐ نے فرمایا (ترجمہ: مسلمانوں کی مثال باہمی مروت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی اگر اس کے ایک عضو میں شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے) .... اور فی الحقیقت یہ خصائصِ مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن نے اپنے جامع اور مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے (ترجمہ: کافروں کے لیے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد) ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لیے اور ان کی جس قدر محبت و الفت ہے حق و صدق و اسلام اور توحید کے لیے"

(خطبات آزاد صفحہ ۱۹)

نیشنل ازم اور پان اسلام ازم دونوں کو ایک ہی قرآن سے ثابت کر رہے تھے کیا یہ مان لیا جائے کہ مولانا قرآن کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر جان بوجھ کر ایسا کر رہے تھے؟ لارینس آف عربیا اور لارینس آف انڈیا میں فرق صرف عقیدے کا تھا ایک یہودی تھا اور دوسرا مسلمان۔

مسلم لیگ کا قیام اور تقسیم ہند

۱۸۹۸ء میں مارچ کی ستائیسویں تاریخ کو ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے عظیم رہنما نے دنیا سے کوچ کیا۔ سرسید کے انتقال کے ساتھ ساتھ ہی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ ایسوسی ایشن سرسید کی زندگی میں بھی زیادہ ترقی نہ کر سکی تھی جس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ ۱۸۹۳ء میں ہی اس کے قیام کے وقت سرسید کافی ضعیف ہو چکے تھے ان کی عمر اس وقت ۷۶ سال تھی۔ کسی بھی اتنی زیادہ عمر کے ضعیف انسان سے بہت زیادہ بھاگ دوڑ اور کام کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی یہ ہی بہت تھا کہ سرسید نے مسلمانوں کو ایک راستہ دکھا دیا تھا جس پر چل کر وہ اپنا سیاسی وقار بحال کر سکتے تھے اور دوسرے فرقوں کی دست درازیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ دوسری وجہ سرسید کی ذاتی پریشانیاں تھیں کہ ان کو کالج فنڈ میں غبن ہو جانے اور دیگر ذہنی الجھنوں نے بہت حد تک مایوس اور اداس کر دیا تھا۔ ایک ضعیف انسان کے لیے اس طرح کے شدید صدمات برداشت کر جانا معجزہ سے کم نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ڈیفنس ایسوسی ایشن بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکی اور آخر کار سرسید کے انتقال کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔

۱۸۸۵ء میں قیام کانگریس کے فوراً بعد سے ہی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو بھی کچھ کرنا چاہئے۔ سرسید نے پہلے ہی کانگریس کے اس دعوے کو مسترد کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کی نمائندگی

کرتی ہے اس کے برخلاف سرسید نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کانگریس کے اس دعوے کے دھوکے میں آکر اگر مسلمانوں نے اس کا ساتھ دیا تو ان کی حالت کانگریس کے زیر حکمرانی یہودیوں سے بھی بدتر ہو جائیگی۔ سرسید کے اس فیصلہ کو پوری قوم نے سر آنکھوں پر رکھا تھا اور سوائے چند لوگوں کے پوری کی پوری مسلم قوم کانگریس کی سیاست سے الگ رہی یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرسید کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں کانگریس کے قیام سے بہت پہلے کا ہے اور کانگریس نے جب یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے تو سرسید کو لامحالہ اس کی مخالفت کرنی ہی تھی،

سرسید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ پھر شدت سے ابھر کر آیا کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیئے۔ گزٹ کا اجراء محسن الملک کی ادارت میں تقریباً ایک سال بند رہنے کے بعد پھر ہو گیا تھا۔ گزٹ کے اس دور کے اکثر شمارے ان بحثوں سے بھرے پڑے ہیں کہ

مسلمانوں کو اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

جانشینِ سرسید محسن الملک کالج کے سکریٹری بنائے جا چکے تھے اور گزٹ کے ایڈیٹر بھی انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ :

"یہ سوال کوئی نیا نہیں ہے؟ سرسید مرحوم کی زندگی میں اس وقت جب ایک بڑی ہلچل ڈالنے والی تحریک سے مسلمان علیحدہ کر لیے گئے تھے اس سوال پر بہت غور کیا گیا ہے اور اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ سرسید مرحوم کی اگرچہ یہ رائے تھی کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ہے اور پولیٹکل بحثوں میں پڑنے سے اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا زیادہ مفید ہے۔ مگر وہ اس سے غافل نہ تھے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم ہونے کے خاص حاجتیں رکھتے ہیں اور ان کی حاجتیں اکثر امور میں اس ملک کی دیگر قوموں سے مختلف اور بعض حالات میں متناقض ہیں اور بوجہ کمیِ تعلیم اور ناواقفیت انگریزی لٹریچر اور انگریزی

اصولِ سیاست کے مسلمان اپنے حقوق اور مقاصد کی حفاظت کی کم اہلیت رکھتے ہیں اور اس لیے ان کے پولیٹکل حقوق اور قومی مقاصد کی حفاظت کے لیے کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے.... اور بالآخر ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا ہو"

(گزٹ ۱۵ اگست ۱۹۰۱ صفحہ ۴۴)

یہ تھا سرسید کا سیاسی نظریہ اور اس کو بیان کر رہے ہیں ان کے سب سے قریبی مشیر کار دست راس جناب نواب محسن الملک۔ آزادی کے بعد آج تک سرسید کے ان خیالات سے ہندوستانی مسلمانوں کو بے خبر رکھا گیا۔ نہ جانے دانشوروں کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ بعض بعض نے تو سرسید کی بالکل دوسری تصویر پیش کی ہے۔ سرسید کی اصلی تصویر یہ تھی کہ خود ان کے گھر پر ان کی صدارت میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جسمیں علی گڑھ تحریک سے وابستہ تمام ہی حضرات شریک ہوتے ہیں اور وہی سوال پیش کیا جاتا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس جلسہ میں اس سوال کے حل کے لیے چار طریقے پیش کیے گئے تھے:

"بالآخر جو طریقہ مفید سمجھا گیا اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سرگروہوں اور دانش مند اور بارعب شخصیتوں کو انگلستان کی پبلک اور گورنمنٹ ہند کے روبرو اپنے مطالب کے ظاہر کرنے کی غرض سے ایک ایسوسی ایشن بالاتفاق قائم کرنی چاہیئے اور اس کو عام ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہنا چاہیئے اور اپنا استحقاق اپنی کارروائیوں کی عمدگی اور قابلیت پر قائم کرنا چاہیئے" (ایضاً)

گزٹ میں یہ بحث چل نکلی کہ آخر اب مسلمانوں کو کیا راہِ عمل اختیار کرنی چاہیئے؟ اس بحث سے ایک بات تو بالکل واضح ہو گئی کہ سرسید، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ

کانگریس کی سیاست مسلمانوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے اور اس کے برخلاف اپنی خیال جماعت بنانا چاہتے تھے اور سرسید نے ایسا کیا بھی ہیٹریاٹک ایسوایشن اور ڈیفنس ایسوسی ایشن سرسید کی اسی خواہش کا مظہر ہیں جس میں پہلی مخلوط جماعت تھی سرسید کے انتقال کے بعد یہ احساس اور زیادہ شدت پکڑ گیا کہ اب مسلمان کیا کریں۔ یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسے گھر کے کسی ذمہ دار بزرگ خاندان کا انتقال ہو جائے تو یہ سوال ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے کہ اب کیا ہو؟ سرسید کی حیثیت مسلمانوں کے لیے خاندان کے معزز اور با اختیار بزرگ کی سی ہو گئی تھی ساری مخالفتیں دم توڑ چکی تھیں اور کفر کے فتوے لگانے والے تک سرسید کے حامی ہو چکے تھے اور کسی طرف سے اب کوئی مخالفت باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال انتقالِ سرسید کے بعد یہ سوال مسلمانوں کے سامنے اٹھ کھڑا ہوا کہ اب کیا کریں اخبار یا بینر اور گزٹ میں طویل بحثیں اس مسئلہ پر چلیں۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

> "ہماری جماعت میں مرحوم سرسید کی طرح اب کوئی نہیں رہا جس پر گورنمنٹ اور ہماری حکومت بھروسہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ تک سائی کا اعلیٰ ذریعہ جاتا رہا۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں جبکہ ہمارا جوابدہ لیڈر نہیں ہے ضرورت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اپنا درد پبلک مباحثہ میں متانت اور احتیاط طور سے بیان کریں۔ بشرطیکہ ہماری خواہش ہو کہ ہم اپنی قومیت قائم رکھیں ۔۔۔۔۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ ابھی سے پیش گوئی کی جائے کہ مسلمان اب آئندہ کیا کریں گے۔"
>
> "خاموش رہنے کی پالیسی پہلے بھی خطرناک سمجھی گئی تھی اور اسی مباحثہ میں جو اس وقت ہوا تھا (ڈیفنس ایسوسی ایشن بناتے وقت) صاف صاف بیان کر دیا گیا تھا کہ کچھ نہ کرنا بلکہ اپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی طرف مصروف رکھنا ایک ایسی تجویز ہے کہ اس کا عمل در آمد ناممکن ہے۔"
>
> (گزٹ ۱۵ ر اگست ۱۹۰۱ء صـ۴۴)

بہت سے لوگ اس زمانے میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں

دلچسپی نہیں لینی چاہیئے اور وہ بھی سرسید کے بعض جگہ ظاہر کیے گئے خیالات کا حوالہ دیتے تھے حالانکہ خود انہوں نے دو دو جماعتیں بنائیں اور ان کو چلایا۔ جب ملک میں چاروں طرف سیاست کا بازار گرم ہو، اخبارات سیاسی مضامین سے بھرے ہوں ملکی نظام چلانے کے لیے روز نئے قوانین بن رہے ہوں تو تعلیم یافتہ طبقہ کو کس طرح سیاست میں دلچسپی لینے سے باز رکھا جا سکتا تھا؟ لہٰذا مسلمانوں کو صحیح راہ سے بھٹکنے نہ دینے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی جماعت بنائی جائے اور ان کو بنا رہنمائی کے نہ چھوڑا جائے۔ محسن الملک اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"جس حالت میں کہ مسلمانوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اور ان کے مقاصد پر حملے کیے جاتے ہیں اور اخبار نویس برابر پولیٹیکل آرٹیکل لکھ رہے ہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ مسلمان خاموش رہیں اور ان کی خاموشی سے نقصان نہ پہنچے" (ایضاً)

محسن الملک کا خیال تھا کہ ایسی حالت میں جب مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر تجویز یہ ہے کہ وہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کو دوبارہ زندہ کریں اور مسلمانوں کے ایسا نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کانگریس میں شریک ہو جائیں اور یہ عمل خودکشی کے مترادف ہوگا:

"ہمارے معزز دوست نواب فتح نواز جنگ بھی غالباً مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے اور نہ پسند کریں گے اس لیے کہ مسلمانوں کا ایسا کرنا خودکشی سے کم نہ ہوگا اور اس کو کوئی بھی پسند نہ کرے گا کہ مسلمان اپنے پولیٹیکل حقوق سے چشم پوشی کریں اور ان کی حفاظت کا کچھ انتظام نہ کریں کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری بات مسلمانوں کے لیے مضر نہ ہوگی۔ ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ سکوت سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے ان کے حقوق تلف ہوئے اور تلف ہو رہے ہیں، خیر خواہی کے پردے میں ان کے قومی اغراض پر حملے کیے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں ان کے حقوق اور اغراض سے چشم پوشی کی گئی ہے اور کی جا رہی

اور اگر یہی حالت چند روز اور قائم رہی تو مسلمانوں کی حالت اس درجہ پر پہنچ جائیگی کہ جس کا علاج بھی مشکل ہوگا۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ایک عام ایجیٹیشن میں شریک ہوں اور آخر کو ہولناک مصیبتوں میں گرفتار ہو جاویں ہمارے پولیٹکل مقاصد کی حفاظت کے لیے بظاہر کوئی تجویز اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو سنہ ۱۸۹۳ء میں کی گئی تھی یعنی محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کرنا۔

جن مسلمانوں کو اپنی قوم کی پولیٹکل حفاظت کا خیال ہے ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام ایجی ٹیشن سے علیحدہ رکھیں اور اس ایسوسی ایشن کو مستحکم بنیاد پر قائم کریں اور اب تک یہ تجویز جو عمل میں نہیں لائی گئی ہے اس پر بھی کارروائی شروع کریں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہی تجویز مسلمانوں کے لیے مفید ہے اور اس تجویز پر عمل کرنے سے وہ بغیر اس کے کہ کسی خطرے میں پڑیں اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں...... چونکہ اب سرسید زندہ نہیں ہیں اور نہ کوئی مثل ان کے قوم کا لیڈر اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہے...... اس لیے ایسوسی ایشن کو جس میں ایسے معزز اور سربرآوردہ مسلمان شریک ہوں جو گورنمنٹ میں بھی عزت رکھتے ہوں اور پبلک میں بھی جن کی وقعت ہو مشترکہ وہ کام کرنا چاہیے جو سرسید منفرداً کرتے تھے“ (ایضاً)

یعنی سرسید کی ذات مسلمانوں کے لیے سیاسی انجمن کی برابر حیثیت رکھتی تھی کہ جو کام وہ اکیلے کرتے تھے ایک جماعت بنا کر اسے کیا جانا چاہیئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شروع سے ہی خاص مسلمانوں کی جماعت کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سرسید کی مشترکہ جماعت بنانے کی کوشش جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنا کر کی گئی تھی اس کی ناکامی نے اس سوال کو ختم کر دیا تھا کہ مشترکہ سیاسی جماعت چاہیے وہ مسلمانوں نے ہی بنائی ہو کامیاب ہو سکتی ہے؟ جب سرسید جیسے عظیم المرتبت اور صلح کل انسان کو مشترکہ جماعت میں ناکامی ہو سکتی ہے

تو پھر کسی اور کی کامیابی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

وقار الملک کی رائے

محسن الملک کی مندرجہ بالا تحریر کے سلسلہ میں اخباروں میں بہت سے مضامین اور خطوط شایع ہوئے اور محسن الملک کی اس تجویز کو کہ مسلمانوں کو پھر سے ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کرنی چاہیئے عام طور سے پسند کیا گیا۔ اس ایسوسی ایشن کی ناکامی کی وجوہات پر بھی فرداً فرداً سب ہی قابل ذکر مسلمانوں نے روشنی ڈالی اور سب اسی بات پر متفق تھے کہ سرسید کی ضعیف العمری کالج فنڈ میں غبن اور ذہنی پریشانیوں کے سبب سرسید اس ایسوسی ایشن کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے۔ دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ سیاسی انجمنوں کے نتائج ایک یا چند سالوں میں سامنے نہیں آتے لیکن سرسید کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے سیاسی راہ عمل متعین کرنے کا کام بھی انہوں نے ہی کیا۔ ڈیفنس ایسوسی ایشن مسلمانوں کے لیے سیاسی راہ نما بن گئی اور سرسید کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ان کے مطالبات نہ مانے جانے کا جب مسئلہ آیا تو دانشورانِ قوم کی رائے ڈیفنس ایسوسی ایشن کے دوبارہ قایم اور جاری کرنے پر قائم ہوگئی۔ وقار الملک ڈیفنس ایسوسی ایشن کی ناکامی کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کامیابی اور ناکامیابی کسی تجویز کی اس پر منحصر ہے کہ وہ تجویز اچھی طرح جاری کی جائے اور اس کے جاری کرنے کے لیے جو ضروری انتظام ہے وہ عمل میں لایا جائے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہ اس تجویز پر زیادہ کاروائی نہیں ہوسکی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ تجویز غیر مفید سمجھی گئی تھی بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ مرحوم سرسید کو کالج کے متعلق ایسے افکار پیش آئے اور روحانی مصائب کا ان پر اتنا ہجوم ہوا کہ وہ اس بڑے کام کی تکمیل و تعمیل سے قاصر رہے۔۔۔۔۔۔ اور بوجہ ظاہر ہونے غبن کے جو شیام بہاری لال نے کیا تھا اس تجویز کے اصلی مجوز کیسے پریشان اور اس غبن کی تلافی میں کس درجہ مصروف تھے۔ علاوہ بریں یہ عظیم الشان

کام ایسا نہ تھا کہ ایک یا دو سال میں اس کے عملی نتائج ظاہر ہوتے اور جس پر کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ کیا جاتا۔ یہ ایک بہت بڑا قومی اور نہایت اہم کام تھا اور قوم کے ذی رتبہ اور بارسوخ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی توجہ کا محتاج تھا اور قوم کی حالت نواب صاحب کو معلوم ہے...... تمام باتوں کا دارومدار صرف سرسید کی ذات پر تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں افکار اور مصائب کے ہجوم سے پریشان رہتے تھے اور انہیں کا دل و دماغ تھا کہ اس پر بھی وہ کالج کا کام کیے جاتے تھے بہرحال جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مفید تجویز کے چلانے پر زیادہ کوشش نہیں ہوئی۔" (گزٹ ۲۲ اگست ۱۹۰۱ء ص ۴۵۷)

محسن الملک نے ڈیفنس ایسوسی ایشن کی میٹنگ کی روداد دوبارہ سے ۱۵ اگست ۱۹۰۱ کے شمارے میں شایع کی تاکہ مسلمانوں کو ایک بار پھر سے اس مفید تجویز کو پڑھنے کا موقع ملے اور اس کی روشنی میں مسلمان اپنی سیاسی راہ عمل متعین کر سکیں اس وقت بھی بہت سے مسلمانوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ سرسید صرف تعلیم کو ہی مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ملک میں عام سیاسی ماحول بنتا جارہا ہے لہٰذا تعلیم یافتہ طبقہ کو ملکی معاملات میں رائے دینے سے کسی طرح نہیں روکا جاسکتا اس لیے اس طبقہ کو بغیر کسی راہنمائی کے چھوڑنا کانگریس اور دوسری مضرت رساں سیاست میں شمولیت کی کھلی آزادی دینا تھا کہ جہاں چاہیں چلے جائیں یہ عظیم الشان کارنامہ بھی سرسید نے ہی انجام دیا کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو سیاست کا مفید سبق پڑھایا کہ معتدل سیاسی سرگرمی بہت زیادہ فائدہ مند عمل ہے اور ناگزیر بھی۔ وقارالملک لکھتے ہیں:

"۱۵ اگست کے پرچۂ گزٹ میں آپ نے ایک رائے اور ۱۸۹۳ء کی روداد محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے متعلق مشتہر فرمائی ہے جس کا ذیل فقرہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ـــ جس حالت میں مسلمانوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اور ان کے مقاصد پر حملے کئے جاتے ہیں اور اخبار نویس

برابر آرٹیکل لکھ رہے ہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ مسلمان خاموش رہیں اوران کی خاموشی سے نقصان نہ پہنچے اور کچھ نہ کرنا اوراپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی جانب معروف رکھنا ایک ایسی تجویز ہے کہ اس کا عمل درآمد ناممکن ہے"

(گزٹ ۲۲ راگست ۱۹۰۱ ص ۸، ۵ م)

علی گڑھ کی یہ روایت تھی۔ آج کوئی بھی اس روایت کا ذکر نہیں کرتا۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق تلف کیے جانے کا ذکر کرنا ایسا ہے جیسے رات کو رات کہدینا اور دن کو دن۔ مسلمانوں کے سارے حقوق بحقِ اکثریت ضبط کر لیے گیے۔ اور تمام دانشورانِ قوم خاموش تماشائی بنے رہے۔ خاموش تماشائی ہی نہیں بلکہ اس طبقہ نے مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈالنے کا کام بڑی جانفشانی سے ادا کیا اور ادا کر رہا ہے۔ قوم کو غیر مطلع رکھنے اور ان تک غلط تاریخ پہنچانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔ علی گڑھ خاص نشانہ ہے اس پروپیگنڈے کا کہ سرسید سیاست کو بری چیز سمجھتے تھے لیکن جب حکمراں جماعت یا کسی مشترکہ جماعت کے لیڈران علی گڑھ آتے ہیں تو یہی طبقہ اور دانشور جو سیاست کو مکروہ بتاتے نہیں تھکتے ان کی پیشوائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمرانوں کی سیاست آج علی گڑھ میں مستحسن نعل ہے لیکن قوم کی سیاست قابلِ مذمت :

"یہاں میں اس قدر اور بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا ہندوؤں کی نیشنل کانگریس میں شریک ہونا میں خودکشی میں داخل سمجھتا ہوں... مگر جو تحریک مسلمانوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کی غرض سے گزشتہ سال سے ازسرِنو شروع ہوئی ہے اس پر اب ذی فہم اشخاص ہر جگہ غور کر رہے ہیں اور امید ہے کہ کسی عام جلسہ میں کوئی نہ کوئی طریقہ عنقریب اختیار کیا جائیگا جو سب سے زیادہ معتدل اور عام فہم ہوگا اور جن دوسری قوموں سے ہم کو پشت ہا پشت سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ان کے ساتھ بھی اس تجویز سے کوئی مخالفت

قائم نہ ہوگی" (ایضاً)

بہر حال یہ تحریک بھی علی گڑھ سے شروع ہوئی کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنائی جائے کوئی مشترکہ سیاسی جماعت بنانے کا تصور سرسید کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی ناکامی سے ہی ختم ہو گیا تھا دراصل محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن اسی ناکامی کے سبب وجود میں آئی جو سرسید کو مہاراجہ بنارس، نول کشور اور دوسرے ہندو ممبرانِ ایسوسی ایشن کے ساتھ چھوڑ جانے سے درپیش ہوئی۔ اخبار انڈین مرر نے اس سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"سرسید احمد نے (کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے) ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دغا کے بعد (جو شو پرشاد وغیرہ نے ان کے ساتھ کی ہے) آئندہ کسی اور نے مسلمانوں کے علاوہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کی پیش کش کی ہو اور اسے قبول کرنے میں انہیں تامل ہوا ہو تو ہمیں حیرت نہ ہوگی" (انڈین مرر، ۳۰ نومبر ۱۸۸۸ء بحوالہ عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ' ۲۹۱ص)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی رائے

اس مسئلہ پر کہ ہندوستانی مسلمان اب سیاست میں کیا رویہ اختیار کریں؟ محسن الملک اور وقار الملک کی چلائی ہوئی بحث پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ایک جلسہ میں جو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا:

"میری رائے تو یہ ہے کہ بغیر اپنی پولیٹکل حالت کو سمجھے ہم مہذب دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ جس طرح پر روحانی زندگی کی بہبودی کے لیے ہم کو مذہبی ہدایت کی ضرورت ہے اسی طرح مہذب سوسائٹی میں عزت و ثروت کے ساتھ رہنے کے لیے پولیٹکل ہدایت لازمی ہے۔ اگر مہذب سوسائٹی میں ہم معزز اور کارآمد رکن ہونا چاہتے ہیں تو اپنی موجودہ پولیٹکل حالت کی نسبت صحیح رائے قایم کرنا از بس ضروری ہے

"..... اے صاحبو! پولیٹکس ہے کیا چیز؟ گورنمنٹ کے اصول طرزِ گورنمنٹ اور مصالح کو سمجھنا پولیٹکس ہے ہمارے ملکی اور قومی جو حقوق اور ضرورتیں ہیں ان کو گورنمنٹ کے روبرو صفائی اور بلا کسی خوف کے ظاہر کرنا پولیٹکس ہے. القصہ جب تک ہم امن سے رہنے کے ترقی کرنے کے حصول کی خواہش قطعی ترک نہ کر دیں اس وقت تک ہم کو پولیٹکس سے نجات نہیں مل سکتی"

(اگزٹ ۵ ستمبر ۱۹۰۳ ص ۴)

اس اقتباس کا آخری جملہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے. آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں نے سیاست کو برتنا چھوڑ دیا اور اپنے حقوق و مطالبات کو حکومت میں صفائی اور بلا خوف پیش کرنا بند کر دیا لہٰذا اس کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ کسی قسم کی ترقی اور باعزت زندگی مسلمانوں کے حصہ میں نہ آئی. آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی زندہ قوم ان کو برداشت نہیں کر سکتی مگر مسلمان ساری زیادتیوں اور پریشانیوں کو برداشت کر رہا ہے درحقیقت انہوں نے سیاست کے سنہرے اصول کو ترک کر دیا. آزادی کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں نے مولانا آزاد کے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا جو انہوں نے لکھنؤ کنونشن میں ان کو دیا تھا کہ اب کسی طرح کی مسلم سیاست ہندوستان میں نہیں ہونی چاہیے اور ساری خرابیوں کی جڑ یہی سیاست ہے. خاص طور سے اتر پردیش کا مسلمان مولانا کے اس مشورے پر بے چوں چرا عمل کرتا آ رہا ہے. کانگریس سے خفا ہو کر دوسری جماعتوں میں مسلمان شریک ہو جاتے ہیں مگر ان کو اپنی کوئی سیاسی طاقت بنانے کا خیال تک نہیں آتا. چند لوگوں کو آتا بھی ہے تو وہ اپنی ہی زندگی خراب کر لیتے ہیں کیونکہ خود مسلمان ایسے کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار نہیں ہوتے انہیں تو صرف دوسروں کی قیادت پسند ہے اپنوں کی نہیں. دوسروں کی جماعتیں پسند ہیں اپنی نہیں:

"حضرات میرے دوست. شیخ عبداللہ صاحب نے اپنی تقریر میں نہایت جوش اور فصاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ہم کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق

حاصل کرنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ میں ان سے بالکل متفق ہوں اور میں بھی اس ضرورت کو اس مقصد کے لیے تسلیم کرتا ہوں" (ایضاً)

آفتاب احمد خاں صاحب نے بھی اپنی تقریر میں اس بات کو دہرایا کہ سرسید کے انتقال کر جانے سے ہم کو اور بھی زیادہ کسی جماعت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے آپ میں خود ایک جماعت کی برابر تھے اور مسلمانوں کے حقوق گورنمنٹ میں پیش کرتے رہتے تھے:

"آپ کو معلوم ہے کہ جب تک سرسید مرحوم زندہ رہے وہ ہماری گورنمنٹ کے درمیان ایک وسیلہ تھے۔ جس قدر ہماری قومی ضرورتیں تھیں ہمیشہ نہایت آزادی اور صفائی کے ساتھ گورنمنٹ کے روبرو پیش کرتے رہے.....

لیکن وہ پیر اعظم ہم میں سے اٹھ گیا اسی وقت سے اس کی جگہ خالی ہے اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کے کام کو سنبھالے اور حقیقت میں اب وہ کام ایک یا چند شخصوں کے کرنے کا ہے بھی نہیں، ہم کو ضرورت ہے کہ کوئی ایسی جماعت ہو جس کے ذریعہ سے کل قوم کی طرف سے قومی ضرورتیں اور قومی رائے گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہو سکیں"

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید کے بعد وقارالملک و محسن الملک نے کوششیں تیز کر دیں۔ مختلف اضلاع کے دورے کرنا مختلف اشخاص اور جماعتوں کے سرگروہوں کو اس طرف متوجہ کرنا یہ دراصل انہیں لوگوں کی محنت تھی کہ مسلمانوں میں اپنی سیاسی تنظیم بنانے کا احساس پیدا ہوا۔ محسن الملک رقمطراز ہیں

"ہم سب کو نواب وقارالملک بہادر کا دل سے ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس موسم میں اس قدر تکلیف گوارا فرمائی اور متعدد اضلاع میں بذات خود جا کر ممبروں کے انتخاب کی کاروائی کرائی۔ قریب دس بارہ اضلاع میں یہ کاروائی کامیابی کے ساتھ ہو چکی ہے" (ایضاً)

مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنانے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں وقارالملک ان تمام کاروائیوں کے روحِ رواں تھے اور مختلف اضلاع میں دورے کر رہے تھے کہ ہر ضلع سے

پانچ یا زیادہ آدمی لکھنؤ میں آکر جمع ہوں اور مسلمانوں کے نمائندہ جلسے میں یہ اہم فیصلہ کیا جائے کہ مسلم تنظیم کی کیا شکل ہو۔ محسن الملک اس کی اطلاع دیتے ہوئے گزٹ میں لکھتے ہیں:

"اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ جو کام اس وقت نواب صاحب ممدوح اس قدر محنت اور توجہ سے کر رہے ہیں وہ کیا ہے تاہم اس قدر صراحت کرنا مناسب ہوگا کہ اس وقت صرف یہ کام کیا جا رہا ہے کہ جو جلسہ واسطے طے کرنے امورِ ضروری کے اور واسطے قرار دینے طرزِ عمل کے آئندہ لکھنؤ میں ہونے والا ہے اس میں شرکت کے واسطے ہر ضلع سے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ممبر عام جلسے کی رائے سے تجویز کئے جائیں۔ جب ہر ضلع سے قائم مقام تجویز ہو جائیں، تو کسی تاریخ آئندہ پر یہ کل حضرات ایک جلسہ میں بمقام لکھنؤ جمع ہوں گے اور یہ ہی وہ جلسہ ہوگا جو فیصلہ کر دے گا کہ ہم مسلمانانِ ہند کو سیاسی معاملات میں کیا روش اختیار کرنی چاہیے"

(گزٹ، ۲۰ جون ۱۹۰۳ء ص۹)

شملہ ڈیپوٹیشن

۱۵، اور ۱۶، ستمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کے نمائندوں کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا اس میں یہ تجویز پایا کہ مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن سر آغا خاں کے سرکردگی میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کرے اور مسلمانانِ ہند کی جانب سے ایک عرضداشت وائسرائے کو پیش کرے۔ نواب محسن الملک (جو اس وقت محمڈن کالج کے سکریٹری تھے) کی خط و کتابت وائسرائے کے سکریٹری سے ان سے ملاقات کا وقت طے کرنے کے لیے ہوتی رہی اور آخر کار یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کے وفد نے لارڈ منٹو کے سامنے مسلمانوں کے مندرجہ ذیل مطالبات رکھے:

(۱)۔ نیابی نظامات کا طریقۂ انتخاب ایسا ہونا چاہیئے جس میں مسلمانوں کے لیے یہ حق ہو کہ وہ خاص حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کریں۔

(۲)۔ ان کی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت کا لحاظ کر کے مسلمانوں کو اس سے زیادہ نشستیں

دی جائیں جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کو مل سکتی ہیں۔

(۳) ۔ ایک معینہ تناسب کے مطابق گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔ ہائی کورٹ کے ججوں چیف کورٹ کے ججوں اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کی حیثیت سے ان کا تقرر ہونا چاہیئے۔

(۴) ۔ یونیورسٹیوں کے سنڈیکٹوں اور سنیٹوں میں مسلمانوں کے لیے چند نشستیں محفوظ کی جائیں

(۵) ۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے امداد دی جائے۔ برصغیر کی نیابی حکومت کے نظام کی حدود کے اندر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے سیاسی معاشرتی اور ثقافتی تشخص کی بقا کے لیے جو بہتر سے بہتر تدبیر مسلمان لیڈر پیش کر سکتے ہیں وہ انتخاب جداگانہ ہے جو ان تجاویز میں درج ہے۔

یہ وہ مطالبات تھے جو ملک میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی نشاندہی کر رہے تھے اور ملکی نظام میں مسلمانوں کے حق میں تبدیلی کی خواہش کے آئینہ دار تھے۔ حکومت آسانی سے ان مطالبات کو ماننے والی نہیں تھی لہٰذا ایک مستقل سیاسی جماعت بنانے کی تجویز ہوئی اور ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد مسلمانانِ ہند نے نواب وقارالملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ وقارالملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے قیام اور اس کے ذریعہ ہندوؤں کی طاقت میں اضافہ ہونے کا ذکر کیا اور بتایا کہ سر سید نے کس طرح اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا تھا:

"جس مقصد کے لیے آج ہم جمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ یہ اسی روز پیدا ہو گیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خاں مرحوم جن کی مدبرانہ اور دور اندیش پالیسی کے ہم ہمیشہ مرہون منت رہیں گے۔ کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے دلیری سے کوشش کی کہ ان کی فلاح اور سلامتی اس میں ہے کہ کانگریس میں شرکت سے اجتناب کریں۔ یہ نصیحت ایسی صائب تھی کہ آج اگرچہ وہ ہم میں نہیں تاہم مسلمان مضبوطی سے اسی پر قائم ہیں اور

جتنا وقت گذرتا جارہا ہے اس کی اہمیت واضح ہوتی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے انتہائی کوشش کرنی چاہیئے...... کانگریس کا یہ بڑھتا ہوا داخلی اور خارجی اثر دیکھ کر جو بنگال کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور حکومت کا یہ ارادہ معلوم کرکے کہ وہ مجلسِ واضعان قانون میں توسیع کرنا چاہتی ہے وفد کی صورت میں مسلمان وائسرائے کے سامنے گئے اور انہوں نے اپنی ضروریات اور ناانصافیاں ان کے سامنے پیش کیں جو بحیثیت قوم ان کو برداشت کرنی پڑی تھیں...... مسلمان لیڈروں نے اس پر غور کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے کیا مستقل تدابیر اختیار کی جائیں یہ طے کیا کہ آخر دسمبر میں مختلف صوبوں کے نمائندے ڈھاکے میں مجتمع ہوں اور اس مسئلہ کا فیصلہ کریں۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لیے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہی تو اس وقت وہی قوم ہندوستان پر حکمران ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصے زیادہ ہے۔ اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے دوستوں سے پیش آتی رہی ہیں ان کے نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں...."

(بحوالہ: محمد امین زبیری "تذکرۂ وقار" ۱۷۱،۱۷۰)

نواب سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ کی تجویز پر آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا رزولوشن پاس

ہوا۔ محسن الملک اور وقار الملک اس کے دو جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے اور اس وقت بھی دو عہدے رکھے گئے تھے اور ایک کمیٹی بنادی گئی جس کو ان دونوں حضرات کی سربراہی میں دستورِ مسلم لیگ وضع کرنے کا کام سونپا گیا۔

قیامِ پاکستان

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں تقسیمِ بنگال کی تنسیخ حکومت نے کانگریس کے دباؤ میں آکر کر دی۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق مسلم لیگ کو دیا گیا اور میثاق لکھنؤ کے بعد کانگریس و لیگ قریب آگئیں۔

۱۹۱۲ء کے بعد کے پندرہ سال ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس زمانہ میں مسلمان ایک غیر ضروری اور مضرت رساں تحریک میں شامل ہو گئے اور وہ تحریک تھی تحریکِ خلافت۔ اس تحریک کے سبب مسلمانوں میں انگریزوں کے تئیں ان کی نفرت اپنے عروج کو پہنچی اور مسلمان کسی دوسرے تعمیری کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ خلافت تحریک کے قائدین بہت زیادہ مخلص تھے اور ان کو اپنی کوششوں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ سلطان عبدالحمید کی خلافت بچا لیں گے۔ حالانکہ یہ سوچنے کی بات تھی کہ ہندوستانی مسلمان جو خود اپنی حکومتیں انگریزوں کو گنوا بیٹھے اتنے مضبوط کہاں سے ہو گئے کہ ہزاروں میل دور کسی ملک کے اندرونی معاملات پر اثر انداز ہو سکیں۔ نتیجتاً خود مسلمانوں نے ہی سلطان عبدالحمید کو معزول کرکے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کر دی اور کمال اتاترک کو اس کا صدر بنا دیا۔ یہ حادثہ خلافت تحریک کے لیے اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے انتہائی رنج اور حیرت کا باعث ہوا کہ اب کس بات کی کوشش کی جائے؟ اس تحریک کے اس دردناک انجام نے مسلمانوں کا اعتماد مسلم لیڈر شپ پر سے اٹھا دیا اور ایک زمانے تک مسلمان اسی کش مکش میں مبتلا رہا کہ اس کو کانگریس کے علاوہ اپنی قیادت کی دور اندیشی پر بھی یقین نہیں رہ گیا تھا۔ یہ حالت چلتی رہی اور کانگریس پے در پے غلطیاں کرتی رہی جس میں سب سے زیادہ واضح نہرو رپورٹ تھی جس میں مسلمانوں کے ادنیٰ مطالبات تک کو ماننے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

۱۹۳۵ء کی مخلوط وزارتوں کا تجربہ بھی مسلمانوں کیلئے اچھا نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز ہندوستان کو چھوڑنے کے لیے ذہنی طور سے تیار ہو رہے تھے۔ ان سب وجوہات نے مل کر پھر سے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنا دیا اور جناح صاحب کی واپسی نے مسلم لیگ کے شریانوں میں پھر سے تیز گرم لہو دوڑا دیا۔ اس دوران مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ملک کے مستقبل پر نظر رکھے ہوئے تھیں کانگریس بلا شرکتِ مسلم لیگ پورے ملک پر اپنی واضح اکثریت کی بنا پر حکومت کرنے کی خواہش مند تھی۔ مسلم لیگ اس کے برخلاف آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ سیاہ اور سفید میں چاہتی تھی۔ کانگریس ایسی کسی بھی تجویز کو ماننے سے اس دعوے کی بنیاد پر انکار کر رہی تھی کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی نمائندہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تک یہ بات تقریباً طے ہو چکی تھی کہ انگریزوں کو بہت جلد ہندوستان کو آزاد کر دینا ہے۔ کانگریس نے مسلم لیگ کے اس دعوے کو جھٹلانے کے لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے ایسے وقت میں مولانا آزاد کو کانگریس کا صدر بنائے رکھا تھا۔ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی بار زوردار کوششیں ہوئیں اور ہر بار ناکامی کا شکار ہو گئیں۔ اس بیچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور میں ایک رزولوشن پاس کر دیا جو پاکستان رزولوشن کے نام سے مشہور ہوا۔

قراردادِ پاکستان

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے عام اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد بہ اتفاقِ رائے منظور ہوئی۔

"قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو! یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسبِ ضرورت رد و بدل کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت ہیں جیسے ہندوستان کے شمال و مغربی اور مشرقی منطقوں

میں اس طرح بک جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر بااختیار و خود مختار ہوں۔

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے ان کے مشورے سے بقدر ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت ہیں حسب ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں"

(سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا ص ۲۵۵)

اس قرارداد میں دو باتیں خاص طور سے آج کے مسلمانوں کے لیے قابل توجہ ہیں پہلی یہ کہ پاکستان کا مطالبہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں کیا گیا تھا صرف مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان کا نام دیا گیا تھا بلکہ پاکستان کا لفظ اس قرارداد میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا صرف مسلم اکثریتی علاقوں کو خود مختار اور آزاد ریاستوں میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا لہذا آزادی کے بعد کے مسلمانوں سے قوم پرور قائدین کا یہ کہنا کہ تم نے پاکستان لے لیا اب تمہارا کچھ نہیں بالکل غلط ہے پاکستان مسلم اقلیتوں کے لیے مانگا ہی نہیں گیا تھا بلکہ جن علاقوں میں مسلمان اقلیت ہیں ان کے حقوق کی حفاظت کی گارنٹی مانگی گئی تھی اور اسی طرح ہندو اقلیت جو مسلم علاقوں میں رہتی تھی اس کے لیے بھی اسی طرح کی قانونی گارنٹی مانگی گئی تھی، ہندو اکثریت کے علاقے میں رہنی والی مسلم اور دیگر اقلیتوں کے لیے قانونی تحفظات دینے کا مطالبہ خاص اس رزولوشن میں موجود ہے لہذا یہ پروپیگنڈہ کہ مسلم لیگ نے اور پاکستان بنانے والوں نے مسلم اقلیت کی کچھ فکر نہیں کی بلکہ ان کے مفاد کو قربان کر کے اپنا مطالبہ پورا کر لیا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ اسی مطالبے کا نتیجہ تھا۔ اور بہر حال کانگریس ہندو اور مسلمانوں دونوں کی

حفاظت کی دعویدار رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں تقسیم وطن کو جس غلط انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس فیصلہ کے اصلی ذمہ دار کون تھے اور کیا ملک کی تقسیم روکی جاسکتی تھی؟ ہم یہاں اس سوال کی بہت زیادہ تفصیل میں نہیں جائیں گے بلکہ صرف کیبنٹ مشن پلان کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ آخری کوشش تھی اور سنہری موقع تھا جس کو استعمال کرکے ملک کے بٹوارے کو روکا جاسکتا تھا اور ہزاروں انسانوں کو قتل ہونے سے بچایا جاسکتا تھا۔ بلاشبہہ پاکستان کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا لیکن کیا یہ ناقابل تنسیخ مطالبہ تھا؟ اور کیا مسلم لیگ کسی وقت اس مطالبہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہوگئی تھی؟ یہ بہت اہم سوالات ہیں جن کا جواب ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو جاننا بہت ضروری ہے کہ آج تک الٹا ہی پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے اور زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ایسا کیوں کہا جاتا رہا ہے کہ جناح اور مسلم لیگ مفسد اور ہندوستانی سیاست کے ولین تھے۔

کیبنٹ مشن پلان

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت ایک وزارتی مشن انڈیا بھیج رہی ہے۔ اس مشن میں سر اسٹیفورڈ کرپس، لارڈ لارنس اور مسٹر ایلکزینڈر شامل تھے یہ مشن ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ کو ہندوستان پہنچا اور پہنچتے ہی کانگریس و مسلم لیگ کے لیڈران سے گفت و شنید شروع کردی تاکہ کوئی ایسا حل نکالا جاسکے جس پر کہ تینوں پارٹیاں ہندوستان کی آزادی کے لیے متفق ہوجائیں اور ملک جلد سے جلد آزاد کیا جاسکے۔ مشن کی گفتگو جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور محمد علی جناح وغیرہ سے چلتی رہی کبھی فرداً فرداً اور کبھی کانفرنس میں سب کے ساتھ ساتھ آخر کار ایک اسکیم ایسی نکل کر آئی جس پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتیں متفق ہوگئیں۔ یہ اسکیم اس طرح تھی کہ:

۱ - ہندوستان متحد رہے گا جس کی ایک مرکزی حکومت ہو گی۔

۲۔ مرکزی حکومت کے پاس تین شعبہ ہوں گے۔ ڈیفنس، فارن معاملات اور رسل و رسائل۔

۳۔ ہندوستان کو تین انتظامی حصوں میں بانٹ دیا جائیگا۔ گروپ A ہندو پارٹی علاقہ ہوگا۔ گروپ B میں پنجاب، سندھ سرحد اور بلوچستان شامل ہوگا۔ گروپ C میں بنگال اور آسام ہوگا جس میں مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت ہوگی۔

اس منصوبہ کے تحت مسلم اقلیت اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہو جاتی لیکن پھر بھی ہندو پارٹی کے زیر اثر مرکز کے تحت اس کو رہنا ہوتا۔ یہ ایک ایسی اسکیم تھی جس پر تینوں جماعتیں راضی ہو گئیں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور برطانیہ تینوں نے اس اسکیم کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے اس اسکیم کے بارے میں کہا:

THE SEED TO CONVERT THIS LAND OF SORROW INTO ONE WITHOUT SORROW OR SUFFERING ... AFTER FOUR DAYS OF SEARCHING EXAMINATION OF THE STATE PAPER ISSUED BY THE CABINET MISSION AND THE VICEROY ON BEHALF OF THE BRITISH GOVERNMENT, MY CONVICTION ABIDES THAT IT IS THE BEST DOCUMENT THAT THE BRITISH GOVERNMENT COULD HAVE PRODUCED IN THE CIRCUMSTANCES.

(LEONARD MOSELY: LAST DAYS OF THE BRITISH RAJ, P. 17)

ملک میں چاروں طرف خوشی کا ماحول پیدا ہو گیا اور تمام انسانوں نے راحت کی سانس لی کہ آخر کار اتنا بڑا مسئلہ اتنی خوش اسلوبی اور آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ جناح کے لیے اس کو قبول کرنا حالانکہ اپنے پرانے مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہونا تھا لیکن انہوں نے مطالبۂ پاکستان کو پس پشت ڈال کر اس اسکیم کو قبول کر لیا۔

TO HIS WAY OF THINKING HIS ACCEPTANCE OF CABINET MISSION PLAN HAD BEEN A GREAT CONCESSION, IT MEANT

THE ABONDONMENT OF HIS CONCEPTION OF SEPARATE STATE OF PAKISTAN. HE AND HIS FELLOW MUSLIMS WOULD HAVE REGIONAL INDEPENDENCE IN THEIR PROVINCES, BUT THEY WOULD STILL BE A PART OF HINDU DOMINATED RAJ.

(IBID P. 18)

کینٹ مشن انگلستان واپس چلا گیا۔ تمام دنیا سے مبارکباد کے پیغامات مشن کو ملنے لگے کہ اتنے اہم مسئلہ کو اتنی خوش اسلوبی سے سلجھا دیا۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہو گیا تھا؟ جناح ہمیشہ سے ہی کانگریسیوں کی نیت پر شک رکھتے تھے اور انہوں نے بہت زیادہ بڑی قربانی کانگریس کے بیانات پر یقین کر کے دی تھی۔ یہاں یہ سوال بہت اہم ہے اور تاریخ اس سوال کا جواب شاید نہ دے سکے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بنیاد پر کہ جس کانفرنس میں کینٹ پلان کانگریس نے منظور کیا اسی کانفرنس میں کانگریس کے صدر کو بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حالانکہ مولانا آزاد پچھلے سات سالوں سے کانگریس کے صدر چلے آ رہے تھے لیکن کانگریس کے ایک گروپ نے سردار پٹیل کو کو صدر بنانے پر زور ڈالا۔ مولانا آزاد نے آخر کار جواہر لال نہرو کا نام صدارت کے لیے پیش کر دیا اور وہ کانگریس کے صدر چن لیے گئے۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے صدر بنتے ہی پہلی پریس کانفرنس میں اس معاہدے کی دھجیاں اڑا دیں اور کسی بھی طرح کے طویل میعادی معاہدے کی موجودگی سے انکار کیا اور میجورٹی کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کو فیصلہ لینے کا حقدار قرار دیا۔ یہ بالکل وہی بات تھی جس سے مسلم لیگ خوفزدہ تھی اور اتنی طویل گفتگو کے بعد معاہدہ ہوا تھا اور ایک ایسا طریقہ نکل کر آیا تھا کہ ملک کی اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ لیکن جواہر لال نے کہا:

"پہلی بات یہ ہے کہ ہم کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں جانے کے لیے راضی ہو گئے ہیں اس کے سوا ہم کسی بات پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔ اس میں ہم کیا کریں گے یہ طے کرنے کے لیے ہم بالکل آزاد ہیں۔ ہم نے کسی ایک معاملے میں بھی کسی سے

کوئی عہد و پیمان نہیں کیا ہے ....''

وہی ڈھاک کے تین پات والی بات ہوئی۔ تمام خوشیاں ہندوستانیوں کی اس بیان نے مٹا دیں ہندو اور مسلمان کا سوال پھر سے زندہ ہو گیا اور اس سوال نے بنگال، پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا۔ یہ خون آج تک بہہ رہا ہے ملک میں ہونے والے فسادات سے نہ ہندو خوش ہے اور نہ مسلمان سب کا نقصان ہے۔ ملک کا نقصان ہے اور ملکی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مولانا آزاد کے اس کارنامہ کو یقیناً تاریخ یاد رکھے گی کہ انہوں نے جواہر لال نہرو کے اس غلط بیانی کو بہت واضح الفاظ میں اپنی کتاب 'ہماری آزادی' میں ظاہر کیا۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد چھپی اور اس اہم مسئلہ پر اخباروں میں بہت زیادہ لکھا گیا۔ مولانا آزاد نے لکھا:

''مجھے چاہئے کہ میں یہ درج کر دوں کہ جواہر لال نہرو کا بیان غلط تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ کانگریس کو یہ آزادی تھی کہ جس طرح چاہے وزارتی منصوبے کو تبدیل کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس پر راضی ہوئے کہ مرکزی حکومت 'وفاقی' ہوگی۔ تین شعبوں کی ایک لازمی فہرست ہوگی اور بقیہ تمام شعبے صوبائی دائرے میں رہیں گے۔ ہم نے مزید اس پر اتفاق کیا کہ تین فریق ہوں گے یعنی (الف) (ب) اور (ج) جن میں صوبوں کی مجموعہ بندی ہوگی۔ یہ معاملات بغیر ان پارٹیوں کی رضامندی کے جو سمجھوتے میں شریک تھیں، کانگریس کی طرف سے یکطرفہ طور پر تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔''

پنڈت نہرو کے اس پورے بیان کے متعلق مولانا کی یہ رائے تھی کہ:

''اب ان بدنصیبی کے حادثات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جس نے تاریخ کی راہ بدل دی۔ ۱۰ جولائی کو جواہر لال نے پریس کانفرنس منعقد کی اور اس میں ایک (مذکورہ بالا) بیان دیا''

(ابوالکلام آزاد'' انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۵۵)

اس بدنصیبی کے واقعہ کی طرف لیونارڈ موسلے اپنی مشہور کتاب ''لاسٹ ڈیز آف برٹش راج''

بیں رقمطراز ہیں:

AND ON 10 JULY, AFTER HE HAD BEEN ELECTED PRESIDENT HE CALLED THE PRESS TOGETHER FOR A CONFERENCE TO DISCUSS HIS POLICY AS NEW HEAD OF CONGRESS. IT WAS A MOMENT IN HISTORY WHEN CIRCUMSPECTION WOULD HAVE BEEN THE ORDER OF THE DAY. THERE WAS MUCH TO BE GAINED BY SILENCE. THE FORTUNES OF INDIA WERE IN BALANCE AND ONE FALSE MOVE COULD UPSET THEM. NEHRU CHOSE THIS MOMENT TO LAUNCH WHAT HIS BIOGRAPHER, MICHAL BRECHER HAS DESCRIBED AS "ONE OF THE MOST FIREY AND PROVOCATIVE STATEMENTS IN HIS FORTY YEARS OF PUBLIC LIFE."

(LEONARD MOSELY : THE LAST DAYS OF BRITISH RAJ, P. 21

یعنی یہ کہ پنڈت نہرو نے جان بوجھ کر تاریخ کے اہم موڑ پر حالات کا رخ موڑ دیا اور ملک کے بٹوارے کا سبب بنے۔ ایسا انہوں نے کیوں کیا تاریخ شاید اس اہم مسئلہ پر ہمیشہ خاموش رہے لیکن گمان یہ کہتا ہے کہ پنڈت نہرو ہندوستان میں کسی بھی دوسری سیاسی قوت کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے چاہے اس کے لیے انہیں ملک کا بٹوارہ منظور کرنا پڑے۔ اس معاملہ پر کچھ روشنی پنڈت نہرو کے اس بیان سے بھی پڑتی ہے جو انہوں نے مولانا آزاد کی کتاب چھپنے کے بعد پریس رپورٹرز کے بار بار پوچھے جانے پر دیا۔ انہوں نے کہا:

MINE WAS CERTAINLY PART OF THE RESPONSIBILITY AND MAULANA SAHIB MAY BE COMPLETELY RIGHT IN HIS THINKING THAT I ACTED WRONGLY. ONLY I COULD SAY THIS THAT MAULANA SAHIB THINKS TO MUCH IN TERMS OF INDIVIDUAL TERMS SOMETIMES, NOT IN TERMS OF HISTORIC FORCES AT WORK. INDIVIDUALS MAKE

DIFFERENCE. BUT SOMETIMES INDIVIDUALS ARE ONLY SYMBOLS OF FORCES AT WORK.

(REPRODUCED IN THE INDIAN-
EXPRESS, 14TH MARCH 1988)

یعنی پنڈت نہرو اس بیان کی اہمیت اور نتائج سے خوب واقف تھے کہ آخری وقت میں جب ملک آزاد اور متحد رہ سکتا تھا خود انہوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جس سے کہ وطن کی تقسیم ہو گئی۔ پنڈت نہرو نے مولانا کے الزام کی تردید نہیں کی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہی کہ تاریخی طاقتیں ایسا چاہتی تھیں۔ وہ طاقتیں کیا تھیں اور ان کے عوامل کیا تھے؟ یہ کوئی بہت زیادہ مشکل سوال نہیں ہے بالکل واضح ہے کہ کانگریس ملک میں مسلمانوں کی برابری کے درجہ پر حکمرانی نہیں چاہتی تھی لہٰذا مسلم لیگ کو پاکستان دے کر ہندوستان کو خالص بنا لیا گیا۔ چونکہ جو مسلم قیادت ملک میں رہ گئی وہ مسلمانوں کی قیادت نہ تھی صرف مسلم تھی۔ اشارہ باریک ہے اور توجہ کا محتاج بھی۔